چھپکر تیار ہی

خیالستان

یعنی

سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے کے مصنّفہ قصّوں اور مضامین کا مجموعہ

یہ کتاب پونے چار سو صفحوں سے زیادہ حجم کی چھوٹی خوبصورت تقطیع پر نہایت خوش قلم چھپی ہی۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ سرِورق کا کاغذ سفید ولایتی جس پر سُرخ و سبز رنگ کے بیل بوٹے ہیں ایک مختصر سی تمہید جناب میر نیرنگ صاحب بی۔ اے نے لکھکر اس دلچسپ مجموعہ کے کتاب کی صورت میں پیش ہونے کی ضرورت ظاہر کی ہی۔

سید سجاد حیدر صاحب کے اچھوتے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات ایسی فرمائشیں آئی ہیں۔ کہ مخزن کا ایک پُرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فلاں مضمون تھا۔ تلاش کرکے ایک روپیہ کا وی پی کر دیجئے۔ اب انکے وہ سب مضامین جو مخزن میں نکلے ہیں اور دیگر مضامین جو اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یکجا نہایت اہتمام اور خوبصورتی سے چھپے ہوئے ہدیہ ناظرین ہیں۔ قیمت علاوہ محصولڈاک دو روپے۔ شائقین جلد منگوائیں۔

کیا واقعی سچائی نہیں ہے؟

تازہ شہادت ۔ جناب سب انسپکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر حیات کی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔

خضاب عالمگیر اس کی تعریف اسقدر ہی کافی ہے کہ یہ بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر دھبہ یا داغ نہیں دیتا۔ بالوں کو ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار بناتا ہے قیمت فی شیشی ۸؍ ۔

مرشد افیون ۔ اس عرق کے چار روزہ استعمال سے افیون بلا تکلف چھوٹ جاتی ہے۔ مروڑ اور دست نہیں آتے۔

دافع بواسیر خونی ہو یا بادی تین دن میں خون بند ہو کر مسّے بلا ضرر بیخ و بنیاد سے نابود ہو جاتے ہیں ہفتہ بھر میں صحت کامل قیمت ۱۲؍ ۔

ممیرے کا سرمہ ۔ دھندھ ۔ غبار جالا ۔ پھولا ۔ پڑوال ۔ سرخی ۔ککرہ رسوں کا تیر بہدف علاج ۔ موتیا بند کے لئے تیر بہدف ۔ آنکھوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر ہے فی تولہ ۱۲؍ خالص ممیرہ فی تولہ ۵؍ ۔

اکسیر الحیات

حلق سے اُترتے ہی فوراً کمزور اور مردہ اعضا پر اثر کرتی ہے۔

اکسیر الحیات

دل جگر و دماغ و معدہ کے امراض کو دُور کر کے ایک اعلیٰ طاقت بخشتی ہے۔

اکسیر الحیات

طاقت کے لئے تیر بہدف اور گئی گذری طاقت کو دوبارہ واپس لانے میں بے نظیر ہے۔

اکسیر الحیات

ضعف مثانہ کیلئے تریاق کامل اور قوت دہ ہے

اکسیر الحیات

کی ایک شیشی استعمال کرنے سے تین سیر خون صالح پیدا ہوتا ہے اور چہرے کی بے رونقی اُڑ جاتی ہے ۔ چہرہ چمکیلا ہو جاتا ہے۔

اکسیر الحیات

کا استعمال تھوڑے عرصہ میں کایا پلٹ کر دیتا ہے ایک کمزور دُبلے پتلے آدمی کو پُر زور بنا دیتا ہے۔

اکسیر الحیات

کی ان گنت خوبیاں ہیں جو لکھنے میں نہیں آسکتیں غرض تمام امراض جسمانی کا حکمی علاج ۔ فی شیشی ۸؍

تازہ شہادت ۔ جناب شیخ فرزند علی صاحب ڈپٹی انجینیر اسسٹنٹ فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات مسیحا سے بڑھکر ثابت ہوئی ہے۔ آپکے علاج کا قائل ہوں

گلگونہ ترنجی اگر آپ حُسن اور حُسن میں لفریبی کی شان پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ضرور گلگونہ ترنجی منگائیں۔ چہرہ کے تمام قسم کے داغ کیل چھائیاں اور مہاسے دُور کر کے رخسار مثل گلاب بنا دیتا ہے حُسن پرست لعاب قدر دانی فرمائیں ۔ قیمت (۱ے)

میر آئیل خوشبودار ۔ زندہ دل دوستو! ہم نے آپکی خاطر ایک اعلیٰ اور خوشبودار تیل میر آئیل بنایا ہے۔ جسکی خوشبو مشک و عنبر کو مات کرتی ہے بالوں کو نرم اور ملائم اور چمکدار بنانے کے علاوہ دردِ سر کو مفید ہے دماغ کی کمزوری اور خشکی دُور کرتا ہے اور بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور بڑھاتا ہے (۱۲؍) ۔

صاف لگاتے ہی بال دور علیحدہ ۸؍

ڈاکٹر محمد علی سند یافتہ ایل ایم ایس شفاخانہ مشیر صحت شہر فیروز پور (پنجاب)

کایا پلٹ کو
یونانی میں آبحیات عرب میں اکسیر البدن اور اطبا کی اصطلاح میں
اکسیر اعظم کہتے ہیں
اطبائے سلف و خلف کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام جڑی بوٹیوں میں روح الکل اپنے غلاف کے اندر ملفوف ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماہر علم ان اجزائے اراضی و غلاف کو دور کرکے روح کو حاصل کرے پھر وہ روح جس مرض میں دی جائے مرض کیسی ہی لاعلاج ہو وہ روح کی طاقت دیگر مرض کو نکال دیتی ہے۔
ایسی اکسیر دوائیں ہر ایک کو معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعض خاص لوگوں کو جن پر اللہ میاں اپنا فضل فرماتا ہے تو ان پر ان بوٹیوں کا راز افشا کرتا ہے جس میں روح الکل زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارسطو حکیم اور خضر علیہ السلام اور بڑے بڑے سکندر جیسے بادشاہ اس قسم کی چیزوں کے متلاشی رہے حکیم میکائیل۔ حکیم ہرمس۔ ڈاکٹر یونس نے ایسے جواہر کو آبحیات لکھا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ روح کو تبدیل ہیئت کرنے میں کوئی مانع نہیں ہوتا اس لئے وہ سرایت کرکے جسم سے مرض کو بالکل نکال دیتا ہے۔
اکسیر البدن دوائی کا خاصہ ہے کہ مرض کو جسم سے داخل ہوتے ہی خارج کر دیتا ہے اور مزاج کو فطرتی حالت پر پہنچانا اسکا پہلا فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکسیر اعظم ۱۰۰ قسم کی مختلف لاعلاج بیماریوں میں تیر بہدف کا کام دیتی ہے اس لئے عام لوگ اس خالص ہیئت کی روح الکل کو آبحیات کہتے ہیں۔ بعد تجربہ مندرجہ ذیل عوارض میں یہ موثر و مفید ثابت ہوئی ہے۔
فوائد مصدقہ۔ تپ محرقہ۔ تپ نزلاوی۔ تپ پرسوت۔ تپ دق۔ سل کے لئے بیمثل دوا ہے۔ ہیضہ۔ اسہال۔ پیچش۔ بے نظیر سرسام۔ دردسر۔ دردشکم۔ درد پہلو یا نمونیا۔ ذات الجنب۔ سرفہ۔ استسقا۔ طپش دل۔ سوزش وغیرہ میں سریع الاثر۔ ناسور بدھ کا زخم۔ درد کان۔ مسوڑوں سے خون آنا۔ پھوڑے پھنسیاں۔ پٹھوں کا اکڑاؤ۔ بواسیر۔ بھگندر۔ تالو کا سوراخ۔ دانت کا درد۔ دردکمر۔ قبض۔ درد قولنج۔ چھپاکی۔ قے۔ تلی۔ زخموں میں کیڑے پڑنا۔ کثرت تشنگی۔ تشنج۔ بیخوابی۔ کھانسی خشک و تر۔ ورم پستان۔ آگ سے جلنا وغیرہ وغیرہ میں کایا پلٹ بہت فائدہ کرتی ہے۔ قیمت فی شیشی عہ۔ محصولڈاک ۳ شیشی سے ۔ ۶ شیشی ہ محصول
مینجر کارخانہ حاج الحرمین الشریفین حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما۔ لاہور

ہاف ٹون عکسی تصاویر

(شائقین جلد منگوائیں)

علمی اور ادبی دنیا کے جن مشاہیر کی تصویریں وقتاً فوقتاً رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں اکثر صاحبان علیحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اِس لئے اُنکی کچھ کچھ زاید کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ جو اب برائے فروخت پیش کیجاتی ہیں قیمتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت داغ دہلوی مرحوم ۔ قیمت	۳ر	۴۔ گروپ (میر مہدی مجروح مرحوم و منشی امیراللہ تسلیم و احسان و آسی)	۳ر
۲۔ شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی۔	۳ر	۵۔ منشی نانک پرشاد صاحب طالب بنارسی۔	۳ر
۳۔ پروفیسر لیبری (معہ نمونہ دستخط انگریزی و تحریر فارسی)	۳ر	۶۔ حضرت جلال لکھنوی (مرحوم)۔	۳ر

تصاویر مصر و روم

ہز ہائی نس عباس حلمی پاشا (خدیو مصر)	۴ر	جامع سلطان احمد (استانبول)	۴ر
والیٔ بروصہ کے تین مہمان (جلال آفندی بیگ۔ شیخ منیر حسین قدوائی و شیخ عبدالقادر)	۴ر	(ان تینوں تصویروں کی فقط چند کاپیاں بچ رہی ہیں)	

ایضاً

چشمہ سلطان احمد و قیصر ولیم (استانبول)	۱۰ر	خزینہ ہمایوں کا دروازہ ۔	۱۰ر
قصر یلدز (جسمیں جلوس سلطانی کی بھی تصویر ہے)	۱۰ر	کارخانہ ابریشم (بروصہ)	۱۰ر
غلطہ کا بڑا پل (استانبول)	۱۰ر	درویشان طریقت مولینا روم رحمۃ اللہ علیہ	۳ر

متفرق

فرانسیسی ریشم کاتنے کا چرخہ ۔ (بچوں کیلئے)	۱ر	قصر مصنوعات زنانہ (نمائش لندن)	۱ر

درخواستیں بنام مینیجر مخزن میکلوڈ روڈ لاہور آنی چاہئیں

چھپکر تیار ہے

صبح زندگی

شائقین کو مژدہ ہو کہ کتاب جسکا انہیں ایک عرصہ سے انتظار تھا اور جسکی فرمائشیں مخزن میں چھپنے سے بہت ہی پیشتر سے موصول ہو چکی ہیں۔ اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوش قلم دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے قسم اول کے کاغذ کی چونکہ مانگ زیادہ ہے اسلئے قسم اول کی کتابیں جلد منگوانی چاہئیں۔ کتاب دو سو چھبیس ۲۲۶ صفحہ کی ہے اور اسمیں ایک لڑکی کے چار برس کی عمر سے لیکر شادی کے وقت تک کے وہ تمام حالات جو تربیت سے متعلق ہیں قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح کنواری لڑکیوں کو جس جس عمر میں جن جن باتوں کے معلوم ہونیکی ضرورت ہے نہایت خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت۔ خدا کی عظمت۔ گفتار۔ کردار۔ اطوار۔ عادات کے متعلق طرز بیان ایسا موثر ہے کہ فوراً دلنشین ہوتا ہے۔ خانہ داری کی تفصیل میں انتظام صفائی۔ ستھرائی کے علاوہ سینے پرونے چھاپنے کاڑھنے کی بہت سی باتیں تصریح سے لکھی گئی ہیں۔ سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ عورتوں کی زندگی پر استانی کا وعظ اس کتاب کی روح رواں ہے اعزا کا سماں۔ پھوپھی کا بھتیجی کو نصیحت کرنا اور آخری نصیحتیں بکھنی سے تعلق رکھتی ہیں۔ زبان کے متعلق بیان کرنیکی ضرورت نہیں کیونکہ کتاب ایک مستند اہل زبان یعنی منازل السائرہ کے مشہور مصنف مولوی محمد عبد الراشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ باعتبار واقعات یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر اتالیقی کتاب زنانہ لٹریچر میں موجود نہیں۔ قیمت قسم اول (عہ) قسم دوم (۸؍) علاوہ محصول ڈاک۔

درخواستیں بنام مینیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

ترے صدقے میں مجھے صبح وطن یاد آئی — ترا ممنون بہت شام غریباں ہوں میں

اُس نے جب کھول کے بالوں کو بنائی گھونگر — حلقے حلقے نے کہا دل سے کہ زنداں ہوں میں

غیر کو مد نظر کیوں ہے اُٹھانا میرا — نہ تو چلمن نہ نقاب رُخِ جاناں ہوں میں

یہ تو کہئے کہ ٹپک جاتے ہیں آنسو ورنہ — انہیں قطروں کو کروں جمع تو طوفاں ہوں میں

جوش اتنا ہے کہ نکلے نہ جنوں کی حسرت — ہمہ تن مثلِ مہ نو جو گریباں ہوں میں

جان بھی لیکے ٹلی ایسی ادا سے آئی — اے اجل تیرے اس انداز پہ قرباں ہوں میں

خوش ہوں اُس در پہ کہ صورت مری غم سے بدلی — غیر آتے ہیں تو کہتا ہوں کہ درباں ہوں میں

روز ہوتے ہیں درِ یار پہ سجدے صفدر
شرم آتی نہیں کہتے ہو مسلماں ہوں میں

(از بخشی حضور علی صاحب المتخلص بہ عاشق)

وعدہ دیدارِ فردا چال تھی صیاد کی — بند ہستی میں جکڑنے کی غرض بنیاد کی

رُوح سے پوچھی جو وجہِ ہستی قیدِ وجود — بولی۔ مجھ کو کھینچ لائی آرزو صیاد کی

توڑ ڈالوں کا قفس کی تیلیاں فولاد کی — قید بنچہ سکتی نہیں مجھ سے تو اب صیاد کی

اے پر پروازِ آزادی اُڑا لیجل نہ مجھے — عمر گذری منتیں کرتے ہوئے صیاد کی

رازِ فطرت لاکھ ڈھونڈھے حضرتِ انساں مگر — کب پہنچ سکتا ہے تہ تک وہ عدم آباد کی

سخت جانی سے مری دونو کی سیری ہوگئی — میرے شوقِ قتل کی اور سختی جلاد کی

نخلِ اُلفت بارور ہوتے نہیں دیکھا کبھی — جان شیریں چھن گئی یہ مزد تھی فرہاد کی

وقتِ کشتی تھا میں سرخوش زیرِ زانوئے حبیب — اور خون چلپے پیا کی تیغ اس جلاد کی

کاش ہوتا جلوۂ دیدارِ حق سے بہرہ ور
ہائے یہ قسمت کہاں تھی عاشقِ ناشاد کی

(از جناب کمال لکھنوی جانشین حضرت جلال مرحوم)

غمزے نے ناز نے انداز نے دل چھین لیا
اُن سے پھر چشمِ فسونساز نے دل چھین لیا

کسی غمزے نے نہ انداز نے دل چھین لیا
اس سُریلی تیری آواز نے دل چھین لیا

مجھ سے کہتے ہیں وہ ملکر یہ ستم تو دیکھو
فلکِ تفرقہ پرداز نے دل چھین لیا

یوں بھی بیہوش بنا دے نہ جوانی کی ادا
کہتے پھرتے ہیں ترے ناز نے دل چھین لیا

نہ مروت رہی آنکھوں میں نہ وہ پاس وفا
فتنہ پرداز دغا باز نے دل چھین لیا

اُٹھ گیا بیٹھ کے پہلو سے بدل کر چتون
ساز کر کے مرے دمساز نے دل چھین لیا

یہ بھی قسمت اک ادا نے ہمیں مدہوش کیا
یہ بھی خوبی نگہِ ناز نے دل چھین لیا

دیکھ اس رنگ کو پردے سے نکل کر باہر
پردے والے تری آواز نے دل چھین لیا

یہ تو ہے خوبیٔ تقدیر شکایت کیسی
شکر ہے اک بتِ طناز نے دل چھین لیا

آج بیٹھے ہیں کمال اپنے جگر کو تھامے
اس ادا سے نگہِ ناز نے دل چھین لیا

(از حضرت صفدر مرزا پوری)

لے ہی لینگے مرا دل کہتے ہیں نادان ہیں
دے ہی دونگا انہیں سید جا مسلماں ہوں نہیں

واں کھلیں شانے پا وریاں اُتر آئیں دل میں
تیری زلفوں کی درازی سے پریشاں ہیں نہیں

میری وحشت نے بنایا ہے تماشا مجھ کو
رونقِ بزم ہوں گو بے سر و ساماں ہیں نہیں

ذوقِ ایذا طلبی باعثِ راحت ہے مجھے
درد خود اُٹھ کے یہ کہتا ہے کہ درماں ہیں نہیں

اک نظر دیکھ لے او خانہ برانداز حجاب
دیر سے منتظرِ جنبشِ مژگاں ہوں میں

تیر کہتے ہیں بدن میں یہ خبر کیا لیکن
مردمِ چشم کی صورت تہِ مژگاں ہوں میں

مرگِ دشمن پہ بھی ہیں مجھ پہ بلائیں نازل
بال بکھرائے کوئی اور پریشاں ہوں میں

یہ داغ وُہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہو

رُباعی

زخمِ دلِ صد چاک دکھایا سب کو افسانۂ دردِ غم سنایا سب کو
افسوس نہ ایک یارِ صادق نکلا دیکھا سب کو اور آزمایا سب کو

سید احمد حسین - آمجد

تازہ غزلیں

(از جناب سید امداد حسن صاحب ظفر نیوڑی)

حکایتِ ستم و جورِ یار - یعنی چہ شکایتِ الم روزگار - یعنی چہ
وفائے وعدہ ز یارانِ ایں زمانہ مجوے کشودِ کار ز مجبور کردگار یعنی چہ
ز دستہائے حنا بستہ کار نکشاید کشود کار ز دستِ نگار یعنی چہ
ز بختِ خویش امیدِ وصالِ یار محال ہوائے صبح ز شبہائے تار یعنی چہ
ظفر ز دردِ غمِ روزگار نالیدن
چو نیست در کفِ تو اختیار - یعنی چہ

وَلَہٗ

ہوسِ وصلِ یار - یعنی چہ ہمہ دم بیقرار - یعنی چہ
بر سرِ غنچہ خزاں دیدہ آمدِ نو بہار - یعنی چہ
واعظ از عاشقاں قرار مجوے عاشقاں را قرار - یعنی چہ
دلِ تو از دست دادہ آخر گلۂ روزگار ، یعنی چہ
بفغاں آمدن ز سختیٔ عشق ظفرِ دلفگار ، یعنی چہ

حجاب چہرۂ جاں میشود غبار تنم
خوشا دمیکہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

امید خاطر محزوں کبھی بر آئیگی | کبھی تو گردش افلاک رنگ لائیگی
تڑپ تڑپ کے کسی دن تو جان جائیگی | یقین ہے کہ کبھی موت مُنہ دکھائیگی

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

تجھے نہیں ہے نشیمن - ہوں میں بھی خانہ بدوش | ترے جگر میں حرارت ہے میرے خون میں جوش
وفور گریہ سے ہو جاؤں گا میں بیہوش | جھکائے سر کو درختوں پہ تو رہے خاموش

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

جگر میں چٹکیاں لیتا ہے درد بے درماں | ہے خونفشانی پہ آمادہ چشم اشک فشاں
دل حزیں میں نہیں تاب ضبط آہ و فغاں | نہ منع کر مجھے رونے سے ناصح ناداں!

برو بکار خود اے واعظ اینچہ فریادست
مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتادست

کبھی تو کشت تمنا بہار پر آتی | کبھی تو آرزوئے جان زار بر آتی
کوئی امید کی صورت نہیں نظر آتی | کوئی نہیں عدم آباد کی خبر آتی

صبا اگر گذرے افتدت بکشور دوست
بیار نفحہ از گیسوئے معنبر دوست

کیا ہے گردش گردوں نے جب سے خانہ خراب | ترقیوں پہ ہے بیتابی دل بیتاب
نہ دن کو ہے کوئی آرام اور نہ رات کو خواب | خدا کسی کو نہ دے درد فرقت احباب

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہو

شمعِ اخیرِ شب ہیں ہم محفلِ جہاں میں   باقی رہے گی کب تک پھر داستاں ہماری

ناواقفِ تپش کو معلوم کیا بھلا ہو

گرمیِ دل و جگر کی طورِ تپاں ہماری

غلام محمد طور۔ بی۔ اے

نخلِ ماتم

کھِلا سکے نہ ہوا جس کو۔ مَیں وہ غنچہ ہوں   کسی سے ہو نہ سکے حل۔ مَیں وہ معمّا ہوں

لُٹا ہوا سا چمن۔ آب رفتہ دریا ہوں   مَیں کیا کہوں تجھے ہمدم کہ کون ہوں کیا ہوں؟

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں مَیں

مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں مَیں

ہرا بھرا چمن خوش شگفتہ رشکِ جناں   ہزار حیف کہ دم بھر میں ہو گیا ویراں

سناؤں کس کو مَیں اب حالِ سوزِ درد نہاں   نہ خویش ہے نہ برادر نہ سر پہ باپ نہ ماں

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

نظر سے گر گیا آنسو کی طرح ہر منظر   نہ باغ سے کوئی مطلب نہ خواہشِ گلِ تر

ہے کچھ تجھی سے تسلی خاطرِ مضطر   نہ مجھ سے آنکھ چرا اے تصورِ مادر

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

یہ مرغ پر زدہ بے بال و پر رہے کب تک   تنِ ضعیف تہ بارِ سر رہے کب تک

عزیز ماں سے پسر بے خبر رہے کب تک   یہ جسم پردۂ چشمِ نظر رہے کب تک

وُہ لطفِ بہارِ زندگانی نہ رہا
وُہ دورِ نشاط و کامرانی نہ رہا
اب وقتِ سفر ہے صبحِ پیری آئی
سایہ تیرا اے شامِ جوانی! نہ رہا

اِک طرفہ فسوں ہے زندگانی ہیہات
پیری ہے نہ طفلی، نہ جوانی ہیہات
بازیچۂ اطفال ہے دنیا کا طلسم
اِک کھیل ہے دورِ فانی ہیہات

ارمانِ شباب کا لہو ہے دل میں
داغِ غمِ آرزو کی بُو ہے دل میں
دُنیا کی تو سیر کر چکے اے شاکو
اب کُنجِ لحد کی آرزو ہے دل میں

شاکر (میرٹھی)

ہماری زبان

(ایک گیت)

شہد و شکر سے شیریں اُردو زباں ہماری
ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری
اس کے تقاضا میں ہے اسکے حروف ہیں یہ
آرام دل ہمارا، تسکینِ جاں ہماری
ہندوستان کی ہو بیشک یہ آسیر انٹو
پرسے میں ہے اسی کے بیتِ بناں ہماری
کشمیر سے دکن تک برما سے تا بہ کابل
یکجا ہمیں کرے گی اردو زباں ہماری
اس کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے اپنا
معلوم کیا کسی کو دشواریاں ہماری
اس کو بچائیں گے ہم جبتک کہ دم میں دم ہو
ہم میزباں ہیں اس کے، یہ میہماں ہماری
عالم میں یکزبانی سے بن رہی ہیں قومیں
ہے محو صد زبانی بستی یہاں ہماری
ان صد زبانیوں نے گونگا کیا وطن کو
ہم ہوں زباں والے، قسمت کہاں ہماری

دل میں نہیں کوئی خوں کا قطرا باقی
اشکوں سے نہ آہ! کچھ بھی رکھا باقی
دل ہوگیا زیست کی حلاوت سے سیر
اب موت کی چاشنی ہے چکھنا باقی

لازم ہے صفائے قلب طاعت کے لئے
ہے شرط خلوص آدمیت کے لئے
آلودہ اسے دروغ و غیبت سے نہ کر
غافل! ہے زبان شکر نعمت کے لئے

آزادی دل دام ہوس میں کیسی؟
راحت غم فکر پیش و پس میں کیسی!
پابندئ نفس اور اُمید نجات
پرواز کی آرزو قفس میں کیسی؟

سمجھا ہی رہا یہ ساز ہستی ہیہات
مر کر بھی کھلا نہ راز ہستی ہیہات
پایاں نہیں قصہ مختصر کچھ تیرا
اے طول شب دراز ہستی! ہیہات

دنیائے دنی بھی ہے بلا کا پھندا
ہر تار نفس حرص و ہوا کا پھندا
اُبھری ہوئی ہیں جو جسم لاغر پہ رگیں
ہے طائر جاں کو یہ قضا کا پھندا

وحشت دل مبتلا پہ طاری ہوگی
غم سے نہ وہاں بھی رستگاری ہوگی
بالیں پہ نہ غمگسار ہوگا کوئی
سنتے ہیں لحد کی رات بھاری ہوگی

روداد غم سفر سنانے سے رہے
مانند صبا خاک اُڑانے سے رہے
کرلیں جی بھر کے پیار یاران وطن
ہم جا کے عدم کو آہ! آنے سے رہے

رُباعیات

دُنیا سے سفرِ عدم کا کرنا ہے تجھے اور منزلِ ہستی سے گزرنا ہے تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا اس خاک سے مُنہ لحد کا بھرنا ہے تجھے

دنیا ہوگی نہ اَوج و پستی ہوگی آنکھوں کے سامنے یہ بستی ہوگی
سوتے ہونگے لحد میں اِک دن تہِ خاک تعبیر تری یہ خوابِ ہستی ہوگی

اس دارِ محن میں آہ! خورسند ہے تُو اے خاک نشیں! زمیں کا پیوند ہے تو
دل، دولتِ فقر سے غنی کر منعم! کیوں حرصِ زر و مال میں پابند ہے تو

مُنہ مانگے مُراد گیا نہ دے گا تجھ کو سو طرح سے آب و دانہ دے گا تجھ کو
غم رزق کا کھا رہا ہے کیوں اے غافل دیتا ہے جو سب کو، کیا نہ دے گا تجھ کو!

دکھلا کے یہ سبز باغ، بُجھ جائیں گے سینے کے، لحد میں داغ بُجھ جائیں گے
ہو جائے گا نظروں میں زمانہ تاریک اِن آنکھوں کے جب چراغ بُجھ جائینگے

پیوندِ زمیں قالبِ بیجاں کر دو! اِس مٹی کو زیرِ خاک پنہاں کر دو
حاجت ہی کفن کی کیا فقیروں کے لئے عُریاں آئے تھے، دفن عُریاں کر دو

وُہ فراق میں تمہارے مری آہ، اور زاری وُہ نہ آنسوؤں کا رُکنا شب و روز اشکباری
مری بسترِ الم پر وُہ تڑپ وہ بیقراری مِری زندگی ہی کیا تھی فقط اِک نفس شماری
مرا حال کاش! غم میں کبھی منقلب نہ ہوتا

مری داستانِ فرقت نہ سُنے کوئی الٰہی مری پُر الم حکایت نہ سُنے کوئی الٰہی
مرے دردِ دل کی حالت نہ سُنے کوئی الٰہی مرا ذکرِ عشق و اُلفت نہ سُنے کوئی الٰہی
چمنِ خزاں رسیدہ گُلِ داغدار ہوں میں

مرے عشق اور محبت کی نہ تم نے قدر جانی نہ کبھی پیام بھیجا، نہ سلام ہی زبانی
ہوا حیف! مجھ کو حاصل نہ مآلِ زندگانی نہ ثمر جہاں میں لایا مرا نخلِ کامرانی
کہ شراب وصل ہوتی، کوئی محتسب نہ ہوتا

مرے کام کے نہیں ہیں یہ سرور و عیش و عشرت مرے کام کے نہیں ہیں یہ متاعِ مال و دولت
نہ میں راحتوں کا خواہاں نہ میں چاہتا ہوں عزت نہ میں طالبِ تسلی، نہ میں خوگرِ نصیحت
ستمِ فلک سے نالاں دلِ بیقرار ہوں میں

مرے دل کو کیوں لگی ہے یہ ہوائے وصلِ جاناں کہ بنا دیا ہے جس نے مجھے شکلِ یاس و حرماں
کبھی بیکسی میں چُپ ہوں، کبھی ناشکیب گریاں یہ بلا گلے نہ لگتی کہ نہیں ہے جس کا درماں
جو میں جرمِ دلدہی کا کبھی مرتکب نہ ہوتا

نہیں تابِ ضبطِ نالہ مرے لب پہ الفغاں ہے نہیں زیست کی توقع مجھے زندگی گراں ہے
نہ شباب کی اُمنگیں، نہ یہ دل مرا جواں ہے میں عُہ [illegible] مبتلائے کلفت مرا دم فقط رواں ہے
مرا غم نہ پوچھ محوی کہ بحالِ نزع ہوں میں

محمد حسین محوی لکھنوی

کوشش یہ ہو رہی ہے سوا مرد ہیں بنائیں　　　پیدا ہوئے ہیں حامی نسواں نئے نئے

کمانے میں لڑکے۔ لڑکیاں ورزش میں برق ہیں　　　تعلیم کے ہیں کارنمایاں نئے نئے

اندر اس آگے ہاکی کے کمرے کے بیچ ہے　　　تفریح کے بھی چاہئیں عنواں نئے نئے

لیکر بغل میں ایک پری ناچیں بزم میں　　　تہذیب پر ہوئے ہیں جو قرباں نئے نئے

چکر کہاں یہ جا کے ٹھہرتا ہے دیکھئے　　　لاتی ہے رنگ گردشِ دوراں نئے نئے

اُن کے نکالنے کی بھی تدبیر کیجئے　　　دل میں جو پال رکھے ہیں ارماں نئے نئے

اہلِ زباں کا سرد ہے بازار ان دنوں　　　شاعر نئے نئے ہیں سخنداں نئے نئے

ٹھہرا ہے حصرِ ملت و قوم اب زبان پر　　　تہذیب کے یہ پھیلے ہیں ارکاں نئے نئے

یارانِ رفتہ کی کہیں اب کس سے داستاں　　　دُنیا نئی ہے اور ہیں انساں نئے نئے

کیفیؔ بہت نہ بزمِ سخن میں تو بڑھ کے بول
نقاد بن کے بیٹھے ہیں سحباں نئے نئے

کیفیؔ

شکوۂ محبوب

مری حسرتوں کا تم نے نہ کیا خیال جاناں　　　مری آرزو کو تم نے کیا پائمال جاناں

مرے درد کی خبر ہو نہ تو پوچھو حال جاناں　　　یہی بے وفائیاں ہیں سبب ملال جاناں

یہ ستم اگر نہ ہوتے تو میں مضطرب نہ ہوتا

وہ خدا دکھائے گھڑیاں کہ ہوں شاد کام ہم تم　　　نہ ہو اپنے جی کا رونا، نہ شباب کا یہ ماتم

کہ رہا نہ دوست کوئی، نہ کوئی رفیق ہمدم　　　میں ہوں اور دردِ فرقت مرا دل ہے اور غم

مگر اُف نہ لب پہ آئی وہ وفا شعار ہوں میں

ویدوں پہ تازہ تازہ چڑھاتے ہیں حاشیے — گھڑتے ہیں لوگ معنئے قرآں نئے نئے

انساں نو کیا خدا کے بھی سجدے سے عار ہے — پیدا ہوئے ہیں اندنوں شیطاں نئے نئے

کوثر کے بھی خیال میں اب کچھ مزا نہیں — چشمے نکالے خلد میں رضواں نئے نئے

سالوس ۔ وہمی اور جنونی ہیں انکے نام — باندھتے ہیں اہل دل پہ یہ بہتاں نئے نئے

ہو اتفاق شیخ و برہمن میں کس طرح — پیدا ہیں اختلاف کے ساماں نئے نئے

جتنے پڑھے نفاق و حسد اس قدر بڑھے — تعلیم کے یہ ہم پہ ہیں احساں نئے نئے

اُن کی طرف کسی کی توجہ ذرا نہیں — ہیں جو کھلے ترقی کے میداں نئے نئے

گھر اپنا ایک دل میں بھی تم سے نہ بن سکا — کیا ہو گیا بنائے جو ایواں نئے نئے

داخل نہیں جو ذیل میں انکی وہ چور ہے — ہیں مفتیان عصر کے فرماں نئے نئے

سودائی ہے کوئی تو کوئی ست جگی نژاد — اس گھر میں گھس کے بیٹھے ہیں مہماں نئے نئے

تسخیر ملک دل کا کسی کو نہیں خیال — سرور نئے نئے ہیں تو سلطاں نئے نئے

تھل بیڑا نوح کی بھی نہ کشتی کا لگ سکے — کلجگ میں اٹھ رہے ہیں وہ طوفاں نئے نئے

زور آزمائیوں کے ہیں مجرے سٹیج پر — رستم نئے نئے ہیں نریماں نئے نئے

حاکم سے بے رخی ہے تو آپس میں لاگ ڈانٹ — ہیں قوم کی ترقی کے ساماں نئے نئے

جو خال ہے وہ بڑھ کے مسا ہو رہا ہے اب — لاتی ہے رنگ زلف پریشاں نئے نئے

پیرس میں جا کے ٹھانی ہے خدمت ہو قوم کی — اٹھتے ہیں بیٹھے بیٹھے یہ خفقاں نئے نئے

ہے نقطۂ سیاسی ترقی کا اب قطب — لوگوں کو خوب ہوتے ہیں وجداں نئے نئے

بد دل برادروں سے کیا شبہ سے بدگماں — ہیں طریق خدمت اخواں نئے نئے

اُلفت وطن کی دل میں سر میں ہے جوش عشق — دعوے نہیں یہ آپ کو شایاں نئے نئے

سودا ہے سر کو آنکھوں میں چھائی ہے تیرگی — ہم دیکھتے ہیں خواب پریشاں نئے نئے

خال سیہ سے زینت حسن صبیح ہے — بت سیکھیں دلفریبی کے عنواں نئے نئے

ہر اک میکدے میں اجارا ہے اس کا
کہ رندوں سے اب بھائی چارہ ہے اس کا

برستا ہے رم جھم شب و روز پانی　　ہے صورت گلوں کی غضب کی سہانی
کوئی سرخ ہے اور کوئی آسمانی　　کوئی چمپئی ہے تو ہے کوئی دھانی

چمن کا ہے کچھ اور انداز گویا
یہ سبزہ ہے طاؤسِ طناز گویا

ہری دوب کوسوں نظر آ رہی ہے　　جہاں تک نگہ جائے لہرا رہی ہے
نزاکت سے کیا کیا وہ بل کھا رہی ہے　　خرامِ حسیناں کو شرما رہی ہے

رگِ ابر کے واسطے نوکِ نشتر
یہ ہے دب کے کیوں سر اٹھائے نہ کیونکر

مزہ موسمِ ابر کا آ رہا ہے　　کوئی لطف معشوق سے پا رہا ہے
کوئی جام بھر بھر کے چھلکا رہا ہے　　کوئی سیر گلزار کو جا رہا ہے

اٹھائیں نہ قسمت سے گو لطف کچھ ہم
مبارک ہو عرشی کو یارب یہ موسم

ابوالاعجاز عرشی

نیا زمانہ

ہمارے عنایت فرما پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے موجودہ زمانہ کی انقلابی حالت کا نقشہ مندرجہ ذیل اشعار میں کھینچا ہے۔ زمین تو پرانی ہے مگر کیفیتیں نئی ہیں:-

پیدا ہوئے ہیں دشمنِ ایماں نئے نئے　　ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے

موسم بہار

سنبھل بیٹھو بے موت کے مرنے والو حسینوں پر ایماں فدا کرنے والو
محبت کا اُلفت کا دم بھرنے والو قدم عشق کی راہ میں دھرنے والو
ہوا باغ عالم کی بدلی ہوئی ہے
چمن میں گھٹا کیسے چھائی ہوئی ہے

اُمنڈ آیا ابر بہار آسماں پر ترانے ہیں مرغ چمن کی زباں پر
مٹے سب عنادل کے شور فغاں پر گیا جوبن آنے لگا بوستاں پر
ابھی خشک تھے سب پہاڑ اور جنگل
ہوا فیض باراں سے جنگل میں منگل

گھٹا آتی ہے بدلی موسم نے صورت ہوئی اور سے اور گلشن کی حالت
نظر میں لگی کھبنے پھولوں کی رنگت وہ کلیوں کا کھلنا وہ ان کی نزاکت
نیا رُوپ گلشن میں بدلا سبھی نے
نکالے غضب پاؤں سرو سہی نے

سیہ کار بادل بہت پی گیا ہے کسی میکدے پر کہیں جھک پڑا ہے
عجب رنگ سے جھومتا یہ اُٹھا ہے بہکتا ہوا ہر طرف جا رہا ہے
ہے لغزش اسے مے پرستوں سی بڑھکر
عجب کیا جو کھل کھیلے مستوں سے بڑھکر

ہر اک ٹکڑہ ابر کی اُف رے شوخی بدلنے کو آیا ہے رندوں سے ٹوپی
ملا جھک کے سب سے دم بادہ نوشی اندھیرے میں اس کو غضب کی یہ سوجھی

آگ کا تن بن گیا اور نُور کی صُورت بنی
شکل عورت کی بنی کیا موہنی مُورت بنی

بال سنبل سے لئے نرگس سی چشمِ نیمخواب
رُوئے روشن نے کیا کسبِ ضیائے آفتاب

رُخ ہوا وَالفجر اور وَاللیل زلف اسکی بنی
سُورۂ وَالشمس سے فرخندہ پیشانی بنی

چشمۂ حیواں کی کھولی مانگ نے سیدھی سڑک
خندہ پیشانی نے صبحِ عید کی پائی چمک

چاند سے مکھڑے پہ قطراتِ عرق کی ہے نمی
چاند کے ٹکڑے پہ افشاں یا ستاروں نے چُنی

ابروئے قوسی کے رکھے ہیں برابر دو ہلال
یا لکھا ہے مطلع موزونِ دیوانِ کمال

آنکھ دشتِ کاشغر کا آہوئے رمدیدہ ہے
ہر نگاہِ مست جس کی فتنۂ خوابیدہ ہے

ایک جانب ابروئے پیوستہ نے کھولی کماں
دُوسری جانب ہے تُرکِ چشم نے تھامی سناں

اِک نگاہ کے وار میں ہر شیر آہو ہو گیا
تیرِ مژگاں جو اڑا دل میں ترازو ہو گیا

آتشیں رُخسار میں روشن ہُوئی نارِ خلیل
غنچہ رُوئی ہنسنے کے بول اُٹھی ہو اللہ الجمیل

معجزہ شق القمر کا وُہ لبِ اظہار ہے
اِس کی خاموشی میں پنہاں معنیٔ گفتار ہے

ہر ادا میں بات ہے ہر بات میں انداز ہے
سحر ہے فتنہ ہے یا جادو ہے یا اعجاز ہے

جنت الفردوس سے آیا ہے وہ سیبِ ذقن
پانی پانی آبِ دنداں سے ہوا دُرِّ عدن

لعل سے لب اور گوہر سے دُرِ دنداں بنے
پنجۂ دستِ حنائی پنجۂ مرجاں بنے

دست و بازو کی جو دیکھی تازہ رنگی کی بہار
آتشِ سوزِ دروں سے جل اُٹھی جانِ چنار

نُور کے سانچے میں اس کا قدِ موزوں ڈھل گیا
ایک فسوں تھا کہ جو خلقِ خدا پر چل گیا

بن گیا قامت قیامت چال محشر ہو گئی
عالمِ ایجاد میں ہر حال محشر ہو گئی

صادق
(از سرینگر کشمیر)

نہیں کچھ اس کی پرسش اُلفتِ اللہ کتنی ہے — یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

سید اکبر حسین

عورت کی ساخت

سنسکرت کے جادو نگار نے اپنے علم الاصنام کے رُو سے لکھا ہے کہ جب توشتری دیوتا عورت ذات کے بنانے کی طرف متوجّہ ہوا تو اس نے معلوم کیا کہ تمام مسالہ تو مرد کی تعمیر میں صرف ہو چکا۔ اب کوئی ٹھوس عنصر باقی نہیں رہا جو عورت کی ساخت میں کام آئے۔ چنانچہ اُس نے بحرِ تفکّر میں غوطہ لگایا اور دیر بعد زانو سے سر اُٹھا کر اس نظم کے نصفِ اوّل میں جو اشیاء مذکور ہیں بہم کر کے انہیں گوندھ ملا کر عورت کی مورت تیار کر دی۔ جب یہ خیال اُردو کے مینا کار کے ہاتھ آیا تو اُس نے نہ صرف اسے نظم ہی کا لباس پہنایا بلکہ اپنی شاعری کی قلمکاری سے پُرانے خاکہ میں ایسے رنگ بھرے کہ صنفِ لطیف کی ایک بولتی چالتی تصویر تصوّر کی نگاہوں میں پھر گئی

چاند کی لیسکر گولائی۔ سانپ کا پیچ اور خم — گھاس کی پتّی کی ہلکی تھرتھراہٹ بیش و کم

بیدِ مجنوں کی نزاکت بیل کے بل کی کجی — بانکپن طاؤس کا۔ نرمی گُلِ کہسار کی

پیارے پیارے۔ بھولے بھولے دیدۂ آہو کی چھب — جن میں ہو رقصِ شعاعِ نورِ خورشیدِ مبیں

ابر سے آنسو۔ صبا سے بیوفائی لی اُڑا — سہم خرگوش اور چیتے سے لیا جور و جفا

سرد مہری ثلج نے دی۔ سختی لی الماس سے — تا بتانِ آہنی دل کا۔ دلِ سنگیں بنے

طوطیِ گلزار نے رنگینیِ منقار دی — قمریِ بیزار نے شیرینیِ گفتار دی

روزِ اوّل سے ودیعت نور کا جوبن ہوا — پرِ بلبل کا اضافہ اس پہ ہلکاپن ہوا

گُندھ گُندھا کر یہ مسالہ جب اکٹھا ہو گیا — دستِ قدرت نے بنایا ایک ڈھانچا نور کا

کلامِ اکبر

کیا ہے دورِ فلک میں کوئی تمکین کے ساتھ — جب زمانہ چلے ایک ہی آئین کے ساتھ
دل دیا۔ مال دیا۔ پیار کیا اِنکو مگر — اِن بتوں کو وہی کاوش ہے مرے دین کے ساتھ
مخلصانہ جو نہ ہو مدح تو کیا لطف آئے — چشمِ غمّاز کی گردش بھی ہے تحسین کے ساتھ

رہی نہ قلب میں قوت زمانہ سازی کی — دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی
فلک نے ہم کو کیا منتخب مٹانے کو — ہمیں سے داد بھی چاہی خوش امتیازی کی
بہت خلوص سے حاضر رہا میں خدمت میں — مگر حضور نے مجھ سے زمانہ سازی کی
خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا — کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی
ہمیشہ پیشِ نظر ہیں وضو شکن منظر — اِس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی
گلے میں پھیرتے ہیں تیغ معذرت کے ساتھ — خدا کے فضل سے عادت ہے دلنوازی کی
اگرچہ بینڈ کی گت بھی ہے دلفریب اکبر — مگر وہ بات کہاں نغمۂ حجازی کی

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی اتنی دھوم ہے — ہست میں شبہ نہیں ہے حیثیت نامعلوم ہے
اس تغیر پہ بھی ہے ذہنوں میں قائم کوئی چیز — اور وہ کیا ہے فقط یا حیّ یا قیّوم ہے

میں نے جو کہا چاند سے رخسار کو لا پاس — کہنے لگا بوسے کا تو کر لیجئے لا پاس (قانون)
کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے — دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے مڑ کر پہاڑ کو دیکھا ۔ جہاں ہمیشہ صاف اور فرحت بخش ہوا چلتی تھی ۔ رستہ پر آرل آور دیگر سدا بہار درخت سایہ کئے ہوئے تھے ۔ اور تجلی انوار جو اس مقدس دیوی کے رُخ سے درخشاں تھے ۔ اس کے پرستاروں کے چہروں کو عجیب پُر جلال بناتی تھی ۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا " آہ ! کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس پہاڑ کو طے کرتے ہیں" ۔ ابھی یہ جملہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا ۔ ایک مقدس صورت سراپا نور و محبت پہلو میں ایستادہ نظر آئی ۔

مقدس صورت " ان سے بھی زیادہ خوش قسمت وہ ہیں جنکو نیکی قناعت کے محلوں میں داخل کرتی ہے" ۔

مَیں " کیا نیکی اس درۂ کوہ میں رہتی ہے" ۔

مقدس صورت " ہاں مَیں درہ میں بھی ہوں ۔ پہاڑ کو بھی روشن کرتی ہوں ۔ مَیں ہی مزدور کو محنت کے وقت خوش کرتی ہوں ۔ مَیں ہی حکیم کو غور و فکر کی حالت میں تسلی دیتی ہوں ۔ میں شہروں کی عام جماعتوں میں شامل ہوں ۔ میں مرتاض کو اس کے تنگ و تاریک غار میں مبارکباد دیتی ہوں ۔ میرا مسکن ہر ایک دل میں ہے جو میرا دلدادہ ہے ۔ مَیں ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہوں ۔ جو میری تمنا کرتا ہے ۔ بیشک سائنس تم کو عالم و فاضل بنا سکتی ہے مگر صرف میں ہی ہوں جو تمہیں حقیقی خوشی کی راہ پر لگا سکتی ہوں" ۔

جبکہ مقدس دیوی اس طرح ہمکلام تھی ۔ مَیں نے اسقدر گرم جوشی سے اپنے ہاتھ اسکی طرف بڑھائے کہ میری آنکھ کھُل گئی ۔ شبنم چاروں طرف پڑ رہی تھی ۔ تمام دلفریب مناظرات کے تاریک میں غائب ہونے جاتے تھے ۔ میں جلد جلد گھر کی طرف روانہ ہوا اور تمام رات مجھے اسی خاموشی اور غور و فکر میں گذری +

ترجمہ محمد سجاد علی ایم اے (کرنال)

خروش سے قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ اگرچہ رستہ اکثر جگہ بالکل سیدھا اور ناقابلِ گذر تھا۔

وُہ لوگ جنہوں نے ابھی چڑھنا شروع کیا تھا۔ اپنے کو قلۂ کوہ کے قریب ہی سمجھتے تھے۔ مگر جُوں جُوں وُہ آگے بڑھتے تھے۔ نئے نئے پہاڑ ایک دُوسرے پر اُٹھتے ہُوئے نظر آتے تھے۔ سب سے بلند پہاڑ کی چوٹی جو اُنہوں نے اوّل اوّل دیکھی تھی۔ اس وقت ایک دُوسرے پہاڑ کا دامن ثابت ہوتی تھی۔ آخر کار رفتہ رفتہ تمام پہاڑ بادلوں میں غائب ہونے لگے۔

مَیں ان تمام چیزوں کو نہایت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعتہً میرا فرشتۂ ہدایت ظاہر ہوا اور کہنے لگا۔" یہ پہاڑ جو تیرے سامنے ہے۔ **کوہِ سائنس** ہے۔ اِس کی چوٹی پر **صداقت** کا مندر ہے۔ جس کی چوٹی بادلوں کے اوپر ہے۔ اور اس کے رُخ کو نور کا نقاب چھپائے ہُوئے ہے۔ خاموشی اور غور سے اس کے پرستاروں کی ترقی دیکھ"

مَیں نے دیکھا کہ اس پہاڑ تک رسائی صرف ایک دروازہ سے ہے۔ جسکو **دروازۂ زبان** کہتے ہیں۔ اس کی محافظ ایک عورت تھی جس کے چہرہ سے غور و فکر نمایاں تھا۔ اس کے لب ہر دم حرکت میں تھے۔ گویا وُہ اپنے دل میں کوئی چیز دُہرا رہی تھی۔ اس کا نام **حافظہ** تھا۔ جونہی کہ مَیں پہلے دروازہ میں داخل ہوا میرے کان ناخوشگوار کریہہ آوازوں کے شور سے کر ہوگئے۔ معاذ اللہ اس قدر مخلوط اور بے معنی تھیں۔ کہ انکے سامنے غوغائے بابل بھی گرد تھا۔

کوہِ سائنس

موسم بہار شباب پر تھا جس کے دلفریب مناظر قدم قدم پر دل چھینے لیتے تھے۔ نیلگوں آسمان کا صاف چمکدار رنگ آنکھوں میں کھُبا جاتا تھا۔ رُوئے زمین کثرتِ گلہائے بوقلموں اور میوہائے گوناگون سے روکش باغِ ارم بن رہی تھی۔ دِل بے اختیار اُس صنّاعِ بے بدل کی چابکدستیوں پر لوٹ تھا۔ جس طرف نظر اُٹھ جاتی تھی حکمت ہی حکمت نظر آتی تھی۔ ع

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

کچھ عرصہ میں یُوں دلفریب قدرتی مناظر کی خوبیوں سے حظ اُٹھاتا رہا۔ آخر پھرتے پھرتے تھک کر ایک چٹان کے ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔ جس کو قدرت کے رنگساز کائی نے سبز رنگا تھا۔

خشک پتّوں کے جھڑنے کی سریلی جھنکار۔ آبشاروں کے زمین پر گرنے کی دلفریب آواز۔ مُرغانِ خوش الحان کے دلکش نغمے عجب فرحت بخش تھے۔

الغرض مَیں اپنے اِرد گرد کی دلفریبیوں پر غور کرتے کرتے خوشگوار نیند کے مزے لینے لگا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ مَیں ایک وسیع میدان میں کھڑا ہوں۔ جس کے وسط میں ایک کوہ فلک فرسا سدِ سکندری کی طرح ایستادہ تھا۔ جس کی بلندی دیکھ کر طائرِ وہم وخیال کے ہوش اُڑتے تھے۔ یہ میدان سبزہ آغاز نوجوانوں سے بھرا پڑا تھا۔ جن میں سے اکثر بڑے جوش و

تعلیم دیجاتی ہے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان میں عورتوں کی تعلیم کی طرف سے غفلت نہیں کی جارہی لیکن مغربی خیالات کے موافق ابھی بہت ترقی درکار ہے۔ مجھے شک نہیں کہ جوں جوں جاپان کے مردوں میں علم زیادہ ہوتا جائے گا وُہ تسلیم کرینگے کہ اگرچہ عورت کو زیادہ تر اپنے گھر کے فرائض اور بچوں کی تربیت ہی میں مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن ان کے سوا بھی اس کے فرائض کا دائرہ وسیع ہے۔ مثلاً اپنے شوہر کی رفاقت۔ بیماری میں اس کی خبرگیری اس کی تکالیف میں اس کی حوصلہ افزائی روزمرّہ کے معاملات کو حسن تدبیر سے طے کرنا اور شوہر کے دل میں اپنے خاندان کی ترقی اور قوم کی ترقی کے لئے اعلیٰ اور نیک ارادے پیدا کرنا یہ سب کچھ جبھی حاصل ہوسکتا ہے کہ عورتوں کو ہر طرح کی عُمدہ تعلیم دیجائے اور اُن کی اخلاقی اور دماغی تعلیم و تربیت مکمّل ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دُوسرے کا تتمہ ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دُوسرے کے بغیر نامکمّل ہے +

جامِ سُرُور - منشی دُرگا سہاے صاحب سرورؔ جہانی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو انڈین پریس الہ آباد میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ بیشتر نظمیں وہ ہیں جو وقتاً فوقتاً اوراقِ مخزن و زمانہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور وُہ نظمیں بھی جو حال میں رسالہ ادیب الہ آباد میں نکلی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ منشی صاحب کا کلام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ مدّت سے درجہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اُمید ہے کہ انکے کلام کے معترف اس مجموعہ کے شائع ہونیکی خبر خوشی سے سنیں گے اور اسے خرید کر اپنے کتب خانوں میں جگہ دینگے۔ کاغذ لکھائی چھپائی سب عمدہ ہیں۔ کتاب کے شروع میں منشی نوبت رائے نظرؔ نے ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے اور سرورؔ مرحوم کے کچھ حالات درج کئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت دو سو صفحہ کے قریب ہے اور قیمت دو روپیہ ہے +

ہوگا کہ اب سے جو لوگ باہر جائیں وُہ اپنی بیبیوں کو اور لڑکیوں کو یا بہنوں کو ساتھ
لیجائیں۔ تاکہ وُہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اَور مُلکوں میں عورتیں کس طرح تعلیم
پاتی ہیں اور کس طرح بچّوں کی پرورش کرتی ہیں"۔

اس تاکید کے بعد تعلیم نسوان کا شوق بڑھتا گیا اور ہر طبقہ کے لوگ
علم کی تلاش میں دَوڑ پڑے سنہ ۱۸۷۲ء میں حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم ملک
میں جاری کی گئی اور حکم ہؤا کہ ہر درجے کے لوگوں کے لڑکے لڑکیاں چھ برس کی
عمر میں مدرسوں میں داخل ہوجائیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری
اور نجی کے زنانہ مدرسوں کی کل تعداد ایک سو تین اور طالب علموں کی تعداد
۳۱۵۷۴۔ لڑکوں کے مدرسین کی تعداد ۲۷۱ اور تعدادِ طلبا ۱۰۴۵۵۱۱
تھی۔ چونکہ آبادی میں زن و مرد قریب قریب برابر ہیں اور مدرسے جانے والی
لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد میں ایک اَور تین کی نسبت ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ تعلیم نسواں میں ابھی بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ حال میں وہاں یہ خیال
بھی پیدا ہؤا ہے کہ عورتوں کو ایسی تعلیم دیجائے جس سے وُہ اگر ضرورت پڑے
تو اپنی روزی پیدا کرسکیں۔ اور ٹوکیو میں ایک چھوٹا سا طبّی مدرسہ جاری
ہؤا ہے۔ جس میں عورتیں ڈاکٹری تعلیم پارہی ہیں اور نرسیں اور دائیاں بن
رہی ہیں اور اس وقت ۱۳۰ عورتیں ملک میں ڈاکٹری کا کام کررہی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ٹیکیو میں زنانہ یونیورسٹی کھولی گئی جس میں تدبیر خانہ داری
لٹریچر معلمی اور سائنس کی تعلیم ہوتی ہے اور عنقریب ورزشی تعلیم۔ موسیقی اور
فنونِ لطیفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اس یونیورسٹی میں جاری ہونے کو ہے۔
اس کے ساتھ کنڈرگارٹن اور ابتدائی سکول اور زنانہ ہائی سکول ہیں۔
ایک محکمہ ایسا بھی ہے جس میں دست کاری سکھائی جاتی ہے اور تجارتی

رہیں جس میں بیشتر زور اس امر پہ دیا جاتا تھا کہ عورت کو چاہئے کہ اپنے شوہر کے ساتھ وفاداری کرے اور جان پر کھیل جائے مگر ناموس پر دھبہ نہ آنے دے۔ مگر عورتوں کو سوسائٹی میں اپنا اصلی مرتبہ اس وقت حاصل ہوا جب پندرہ سو اُنچاس میں [۱۵۴۹] فرانسس زیویر نامی ایک جسوئیٹ پادری وہاں پہنچا۔ اس نے نہ صرف عیسوی مذہب جاپان تک پہنچایا۔ بلکہ اس نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی اور گو ایک پولٹیکل سدھے نے تھوڑے ہی عرصہ میں جسوئیٹ پادریوں کو جاپان سے نکال باہر کیا لیکن جو شعلہ وُہ بھڑکا گئے تھے وُہ بڑا ہوتا گیا اور انیسویں صدی تک بیرونی اور اندرونی واقعات نے ایسی صُورت اختیار کی کہ نوجوانان قوم نے بوڑھوں کی مخالفت کے باوجود یہ فیصلہ کر لیا کہ مغربی تہذیب کو اپنے ملک میں رواج دیں۔ عام اصلاح کی جو تجویز ہوئی اس سے عورتوں کو خارج رکھنا ناممکن سمجھا گیا اور تسلیم کیا گیا کہ کوئی لڑکی اچھی بیوی اور اچھی ماں نہیں بن سکتی جب تک کہ وُہ تعلیم نہ حاصل کرے۔ اعلیٰ خاندانوں نے لڑکیوں کے مدرسے قائم کرنے کے واسطے بہت سا روپیہ دیا۔ اگرچہ وُہ مدرسے انہیں خاندانوں کی تعلیم کے لئے بنے تھے اور ان کا فائدہ محدود تھا تاہم وُہ تعلیمِ نسواں کے پیشرو تھے اور ان سے طریقِ تعلیم میں ایک جدت پیدا ہوئی ۱۸۷۱ء میں شاہ جاپان نے اپنے اُمرا کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ جس میں انہیں ممالک غیر کی سیاحت کی ترغیب تھی اور اسی میں تعلیم نسواں کے متعلق حسب ذیل ارشاد تھا۔

"ابھی اس ملک میں ہمارے پاس عورتوں کی تعلیم کے واسطے کوئی باضابطہ انتظام نہیں ہے اور وُہ عموماً معاملات کے سمجھنے اور اُن پر رائے قائم کرنیکی قابلیت میں ناقص ہیں۔ بچّوں کی تربیت ماؤں کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح مائیں اُن کی تربیت کرینگی اسی طرح وُہ بڑھینگے۔ یہ ضروری معاملہ ہے۔ اس لئے یہ مناسب

حیا و شرم کے یہ معنے قرار پائے کہ خود اپنے خاندان کے مردوں کے سامنے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے۔ اِس کے بعد بارھویں صدی میں جب فوجی گروہ کا زور ہوا تو عورتوں کو خانہ نشین رہنے اور اپنے آپ کو مٹانے کی تلقین ہونے لگی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بُدھ مذہب کا زور بڑھتا جاتا تھا اور وُہ یہ سکھاتا تھا کہ عورتیں گناہ کی پتلیاں اور بے وفا اور بے رحم طبع ہیں اور انہیں لازم ہے کہ اپنے آپ کو مٹا کر اپنی زندگی عبادت میں صرف کریں اور اگر اس پر بھی اطمینانِ قلب نہ حاصل ہو تو تارک الدُّنیا ہو جائیں۔ مردوں عورتوں کو اس زمانہ میں ایک دُوسرے سے بالکل جُدا رکھا جاتا تھا اور ان کو سیر وغیرہ کے لئے بھی باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب کنفیوشیس کا مذہب پھر تازہ ہونے لگا تو عورتوں کو کسی قدر زیادہ آزادی ملی۔ مگر اس مذہب کے جو مسائل مردوں کی فوقیت کے بارے میں تھے وُہ اور زور پکڑ گئے اور یہ بھی خرابی پیدا ہوئی کہ اس مذہب کے عالم اکثر ایسے مرد تھے جو خود اچھے اخلاق نہیں رکھتے تھے۔

دسویں صدی کے اخیر اور گیارھویں صدی کے شروع میں خاندان فیوجی دارا کی ملک میں بڑی عزت تھی۔ اس خاندان کی بیٹوں میں سے پاشاہوں اور شاہزادوں کے لئے بیگمات چُنی جاتی تھیں۔ اور انہیں اس اعلیٰ مرتبہ کے قابل بنانے کے لئے نہایت لائق اور تعلیم یافتہ اُستانیاں موجود رہتی تھیں جو انہیں تعلیم دیتی تھیں۔ اور جب وُہ محلات میں جاتی تھیں تو وُہ اُنکے ساتھ جاتی تھیں۔ ان بیگمات میں سے بعض ایسی تربیت یافتہ ہوتی تھیں کہ وُہ صاحب تالیف وتصنیف گذری ہیں۔ انہیں میں وُہ مشہور عورت ہے جس کا نام موتوگٹاری ہے اور جس کی نظم ونثر بلحاظ خوبی وطرزِ ادا کے مدتوں طالبعلم لڑکے اور لڑکیوں کو قابلِ تقلید نمونے کا کام دیتی رہی۔ وقتاً فوقتاً عورتوں کے فائدہ کے لئے بہت سی کتابیں لکھی جاتی

خصلتیں یعنی پاکدامنی ۔ وضع داری حیا اور خدمت گذاری غرض وُہ سب صفات جو عورت کی شان کے شایان ہیں ان میں موجُود ہُوں ۔ تاکہ جب ان کی شادی کا وقت آئے تو وُہ سچی نسوانی خوبیوں سے معرّا نہ پائی جاویں۔ کیبارا کے بعد اس کے بعض مداحوں نے اس کی ان ہدایات کو ایک کتاب کی صُورت میں جمع کیا اور اعلےٰ تعلیم نسوان اس کا نام رکھا ۔ چونکہ یہ کتاب اس وقت کی تمدنی حالت کے موافق تھی اس لئے اس کو اس قدر شہرت اور وقعت حاصل ہُوئی کہ کوئی شریف گھر ایسا نہ تھا جس میں اس کتاب کا ایک نُسخہ موجود نہ ہو ۔ لوگ اسے لڑکیوں کی تعلیم کا دستور العمل سمجھتے تھے ۔ اس کے رُو سے عورتوں پر بزرگوں کی تعظیم اور اطاعت لازم تھی اور مرد اور عورت کے فرائض بالکل متمیز تھے ۔ یہ کتاب اس قدیم چینی مسئلہ کی حامی تھی ۔ جس کے مطابق طلاق کی سات وجوہات تھیں اور نکاحِ بیوگاں ممنوع تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد و عورت کے باہمی تعلقات کے بارے میں یہ کتاب چین کے مذہبی پیشوا کنفوشیس کے اقوال کی تفسیر تھی ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عمل ہمیشہ کنفوشیس کے اقوال پر نہیں رہا ۔ کیونکہ بہت سی پُرانی روایات اور تاریخیں ایسی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں سب اختیار مردوں ہی کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ ایسی ایسی ہمت والی عورتیں گذری ہیں جو جنگی اور سیاسی معاملات میں شریک ہوتی تھیں اور تمدنی امُور میں مردوں سے پُورا مقابلہ کر سکتی تھیں ۔ چنانچہ آٹھویں صدی میں شاہزادیاں تخت پر مسلسل بیٹھتی رہیں ۔ مگر دسویں صدی سے ان کی حالت میں زوال شروع ہُوا اور عورتوں کی دماغی اور اخلاقی قوت کم ہونے لگی ۔ نزاکت خوبی سمجھی جانے لگی اور یہ فیشن ہو چلا کہ عورتیں تکلف سے اپنے آپ کو نازک اور حسین ظاہر کریں اور

جاپان میں تعلیم نسواں

مسز کیلب صاحبہ نے لاہور میں ایک مختصر سی زنانہ لٹریری سوسائٹی قائم کی ہوئی ہے
جہاں کبھی کبھی پردہ دار خواتین کو جمع کر کے بعض دلچسپ مضامین پر لکچر دیے جاتے ہیں
یہ مضمون ایک لکچر کا ترجمہ ہے جو خود مسز کیلب صاحبہ نے چند روز ہوئے دیا تھا:۔

جاپانی عورتیں پرانے زمانے سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ مگر جو تعلیم مردوں کو دیجاتی تھی اس سے عورتوں کی تعلیم کو کوئی نسبت نہیں ہوتی تھی۔ سترھویں صدی میں جب جاپان میں علوم و فنون کا ایک دور جدید شروع ہو رہا تھا تو اہل الرائے مردوں نے محسوس کیا کہ عورتوں کو فقط نرمی۔ فرمانبرداری۔ دیانت۔ رحمدلی وغیرہ نیکیوں کی تلقین ہی کافی نہیں۔ بلکہ اُن کی دماغی قوت کو بھی ترقی دینی چاہئیے۔

ایک شخص کیبارا نامی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عورتوں کے بہت سے نقص صرف اُن کی جہالت یا اُن میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اس کی رائے تھی کہ سات برس کی عمر تک لڑکے اور لڑکیوں کو یکجا اور یکساں تعلیم دیجائے۔ اس کے بعد لڑکیوں کی تعلیم جُدا ہونی چاہئیے۔ اور انہیں چینی زبان کی قدیم علمی کتابیں لکھائی پڑھائی اور حفظ کرائی جاویں۔ اور عورتوں کے متعلق پرانے عالموں کی تصانیف انکے درس میں رکھی جاویں۔ جب دس برس کی ہو جاویں تو انہیں گھروں سے باہر نہیں جانا چاہئیے۔ اور وہیں سینا۔ بُننا۔ حساب کتاب اور انتظامِ خانہ داری سیکھنا چاہئیے۔ جب اور بڑی ہو جائیں تو اُنکے بزرگوں کا فرض تھا کہ انہیں عامیانہ اور ناشائستہ کتابوں اور گیتوں سے پرہیز کرنے کی تاکید کر دیں۔ اور اِس بات کی احتیاط کریں کہ عورتوں کی چاروں ضروری

کی با قاعدہ کوشش کو اپنا فرض گردانے تو کیا ایسی کوشش پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا؟
یا کیا اہل ملک کی باہمی عداوت ملک کو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی
جس قدر شراب خواری اور دیگر رسوم سے متصور ہے - اور کیا مذہبی دل آزار تحریریں مخالفت
کو بڑھانے اور ایک کو دوسرے کے خون کا پیاسا کرنے کی منحوس خدمت ادا نہیں
کرتیں ؟ اگرچند دل و دماغ ان نتائج کو محسوس نہیں کرتے تو اُنکے لئے بیشک کسی
کوشش کا موقع نہیں اور دریا کی دو دھاروں کو شوق سے علیحدہ ہو کر اپنی روانی کا زور
کھو دینا چاہیئے مگر ایسے لوگوں کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ واقعے کی سچی کیفیت کو سمجھنے
والے بھی موجود ہیں اور انہی کا فرض ہے کہ ہمدردی اور انصاف کے مدارج سمجھیں اور
سمجھائیں اور عداوت کی آگ پر پانی ڈالیں اور تیل ڈالنے والوں کے آگے دیوار آہنی
بن کر کھڑے ہو جائیں +

محمود علی از کپورتھلہ

تیمارداری - مولوی محمد سعید صاحب صوفی نے تیمارداری نام ایک کتاب انگریزی زبان سے ترجمہ کی ہے
جسے شیخ محمد عبداللہ صاحب وکیل علیگڈھ وایڈیٹر رسالہ خاتون نے شائع کیا ہے - اور جنرل بک ایجنسی
علیگڈھ سے (بقیمت ۱۲) مل سکتی ہے - اس میں شک نہیں کہ لائق مترجم نے ایک ایسی ضرورت
کو پورا کیا ہے جو مدت سے محسوس ہو رہی تھی - اور اردو خوان صاحبان اور خواتین اس کتاب کو
بہت کار آمد پائینگے - ابتدا میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے دیباچہ کے طور پر چند صفحے لکھے
ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں بعض ہدایات تیمارداری کی ایسی درج ہیں جو انگریزوں
کے ملک یا اُنکے طریق بود و باش کے لئے مناسب ہیں اور ہندوستان میں اُن پر عمل نہیں
ہو سکتا - لیکن عام اصول ہر جگہ یکساں ہیں اور اُن پر عمل کرنا بیماروں اور تیمارداروں دونوں
کے لئے مفید ہوگا +

نادانوں کے مذہبی جوش اور غلط ہمدردی کے خیال سے فائدہ اُٹھا کر پوری کیجاتی ہے اور اس لئے ایسے لوگ ہمدردی اور انصاف کو سمجھ لیں جب بھی توقع نہیں ہو سکتی کہ آگ پر تیل ڈالنے اور دونوں قوموں کو ایک دُوسرے کے خلاف بھڑکانے سے باز آئیں۔ ان لوگوں کی تعداد کیسی ہی محدود ہو۔ ملک میں فتنہ و فساد قائم رکھنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے اور وُہ نادانوں کے مذاق کو ایسا خراب کر چکے ہیں کہ مضمون نگاری سے معاش پیدا کرنے والوں کو مفید مضامین پر ایسی قدر افزائی کی توقع نہیں جس قدر بازاری گالیوں اور کمینہ طعن و تشنیع کی اشاعت سے متصور ہے اور اس لئے ان کی تعداد میں کمی آنے کا احتمال بھی نہیں۔ لیکن اگر عداوت ملک کے لئے مضر ہے اور اگر ترقی باہمی محبت اور اتحاد پر منحصر ہے تو جہاں مُلکی ترقی کا ذریعہ سمجھ کر غیر مُلکی اشیاء کو ترک کرنے اور لوگوں سے چھڑوانے کی کوشش کیجاتی ہے حالانکہ عام پبلک ملکی اور غیر مُلکی میں تمیز کرنے کی قابلیت اور نیز خواہش نہیں رکھتی ادھر جہاں قومی ہمدردی کی دُھن میں بعض بعض جگہ ہندو مسلمانوں کو اور مسلمان ہندوؤں کو بائیکاٹ کرتے سُنے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک کا گذارہ دُوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ وہاں ترقی کا اصلی راز دریافت کرنے والوں اور اتحاد و یگانگت کی قدر و قیمت سمجھنے والوں میں کیا ایسے جوانمرد پیدا نہیں ہو سکتے جو بے تہذیب مضمون نگاروں کو بائیکاٹ کریں۔ اور اگر کوشش سوشل اور پولٹیکل اغراض کے لئے جدوجہد کرنے اور لوگوں کو ترغیب دینے کے ساتھ اس امر کا بھی عزم کر لیں کہ دل آزار تحریروں اور بانیانِ مذاہب کی بے ادبی کرنیوالے رسالوں اور اخباروں کو نہ خریدینگے اور جہانتک ممکن ہوگا لوگوں کو ان کی امداد و اعانت سے باز رکھینگے۔ اور جس طرح ٹمپرنس سوسائٹی یا اصلاح تمدن کے حامی بعض عادات اور رسوم کو چھوڑنے کا عہد کر کے اپنے دائرہ اثر کو بڑھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک سوسائٹی فتنہ انگیز تحریر و تقریر کو چھوڑنے اور چھڑوانے

کا جذبہ غلط ہمدردی پر غالب آکر ایک کے ہاتھ سے دُوسرے کو ناجائز تکلیف نہ پہنچنے دیگا تو عداوت خودبخود محبت اور یگانگت میں بدلجائیگی اور اس وقت دل و دماغ کی روشنی اُن تاریکیوں کو بھی دُور کر دیگی جن سے عداوت کے دیگر اسباب پیدا ہوتے ہیں اور سمجھ میں آسکیگا کہ اگر بالفرض مُسلمان سلاطین کے ہاتھ سے غیر مذہب رعایا کو کبھی امن نصیب نہیں ہُوا تو بھی اس وقت وہ لوگ موجود نہیں جنکے جور و ستم کی فریاد کیجاتی ہے اور اب جو نسل موجود ہے وُہ دیگر اقوام کے ساتھ ایک سلطنت کے ماتحت ایک ہی طرح کے قوانین کی پابند اور ایک ہی مُلک کی خوشحالی اور بدحالی میں حصہ لینے والی ہے - اس لئے اس جور و ستم کا انتقام جو گذشتہ مُسلمانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے - اُن لوگوں سے لینا جنکو اس میں بالکل دخل نہیں کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

ایک اور ضرورت - غرض میرا خیال ہے کہ عداوت ہمدردی کو غلط استعمال کرنے سے پیدا ہُوئی ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے اور دل میں اعتقاد ہو کہ جن معاملات میں انصاف اور قانون کو دخل ہے ہمقوم اور غیر اور دوست اور دشمن برابر ہیں اور ہمدردی صرف اُن موقعوں میں ہوسکتی ہے جہاں کسی قسم کی رعایت انسان کی اپنی مرضی اور انتخاب پر موقوف ہو تو ملک میں عداوت کا نشان نہ رہیگا۔ اور تمام واقعات کی حقیقت کھُل جائیگی - جن سے باہم دگر شکایت کرنے کا موقع ملتا ہے مگر ان سب مرحلوں کو طے کرنے کے بعد مجھے ایک امر کی نسبت پھر بھی اندیشہ ہے اور مَیں خیال کرتا ہوں کہ مذہبی بحث و تکرار اگرچہ فی نفسہٖ بُری نہیں مگر اس میں بدتہذیبی سے کام لینا اور اصُولِ مذہب پر روشنی ڈالنے کی بجائے مذہبی پیشواؤں کو بُرا کہنا اور غلط اتہاموں سے دیگر مذاہب کو بدنما کرنا بعض صاحبوں کا پیشہ ہوگیا ہے اور مَیں سمجھتا ہُوں کہ اُن میں ہمدردی کا جوش اور غلطی سے ایسی کوششوں کو مفید سمجھنے کا خیال بھی نہیں بلکہ محض شکم پروری اور گرم بازاری کی خواہش ہے جو

ہونا ایک طرف۔ ابھی اس کا امکان بھی دُور ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ابھی ہمدردی کے ابتدائی درجوں میں اور ظلم میں تمیز کرنے کا ملکہ بھی نظر باکثر حالات مُلک میں پیدا نہیں ہُوا۔ اور تمام ایسے واقعات میں جہاں دو فریق یا دو اُمیدوار مختلف قوموں میں سے ہوں ہمدردی کی لہر اُٹھتی ہے۔ اس شخص کے لئے جو اپنا ہمقوم ہو اور نہیں توجہ کی جاتی اُس ضرورت یا استحقاق کی طرف جو غیر کو حاصل ہے۔ اور یہی غلط فہمی باہمی عداوت اور عناد کا باعث ہوئی ہے اور جب تک باقی رہیگی عداوت کو نابود نہ ہونے دیگی۔ اور اس سے آگے یہ شکایتیں کہ ہندو یا مسلمانوں نے بعض ایسی تجارتیں کیوں اختیار کیں جو پہلے دُوسرے فریق کے قبضہ میں نہیں۔ یا کسی فریق نے علیحدہ پولٹیکل انجمن کیوں بنائی۔ بلکہ یہ بھی کہ دُوسروں سے جُدا ہو کر کسی حاکم کو گارڈن پارٹی کیوں دی۔ ان باتوں پر واویلا کیا جاتا اور عداوت کا سبب سمجھا جاتا ہے اسی لئے کہ رنجش کی تخم ریزی بلحاظ طرفداری کے جذبہ سے ہو چکی ہے اور اس کا پھل ان شکلوں میں ظاہر ہونا ضرور تھا۔ لیکن اگر اُن تمام نتائج کو غور سے دیکھا جائے جو طرفداری کے شوق میں دُوسروں پر ظلم کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور دُوربینی کی حس کو ترقی دیکر اُن نقصانات کو معلوم کیا جائے جو غلط ہمدردی سے خود اپنی قوم کو پہنچ سکتے ہیں تو پھر جس طرح دشمن کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھکر گاڑی کو دریا میں ڈبونے کی کوشش نہیں ہو سکتی اور ایک چھت کے نیچے بیٹھکر اس کو جلانے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دشمن کے ساتھ خود اپنی ہلاکت کا یقین ہوتا ہے اسی طرح مقدمات۔ ملازمت۔ امتحان یلوہ اور پولٹیکل جدوجہد کے موقعوں پر غیروں کے حقوق پامال کرنے کا خیال بھی نہ آئیگا۔ کیونکہ عقل پیش بین اُس وقت بھی اسی طرح خود اپنی قوم کے لئے مضرت اور نقصان محسوس کریگی۔ اور عقل کی ایسی اصلاح اور اخلاق کی اس قدر درستی کے بعد جب وُہ افعال سرزد نہ ہونگے جو عداوت کو پیدا کرتے اور اسے ترقی دیتے ہیں اور انصاف

سب کے لئے وسیع ہو۔ علم و فن حاصل کرنے کی قابلیت بھی کسی خاص قوم اور فرقے سے
مخصوص نہیں۔ صحت حاصل کرنے کے وسائل اور کاروبار میں کامیاب ہونے کی تدابیر
بھی ہر قوم کو یکساں مفید ہو سکتی ہیں۔ غرض یہ سب ضروریات ہیں اور قدرت نے سب انسانوں
کے لئے بلالحاظ قوم و ملت مہیا کی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص جیب میں پیسہ ڈال کر گھر سے
نکلتا ہے اس نیت سے کہ کسی بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لئے دے تو چونکہ وُہ
پیسہ ہر قوم کے بھوکے کا پیٹ بھر سکتا ہے اور اسی لئے بنا ہے تو اب ایک بھوکے
کو دیکھ کر اس لئے نہ دینا کہ وُہ دینے والے کا ہمقوم نہیں اور تلاش کرنا کہ بھوکا بھی
ہو اور ساتھ ہی وُہ اسی نسل سے ہو جس میں دینے والا ہے یا انہی عقائد کا پابند ہو جو
دینے والا رکھتا ہے تو حقیقت میں یہ خیرات میں ایسی صفت کا ایزاد کرنا ہے جو
قدرت نے اس کے اندر نہیں رکھی اور یہ اعتقاد کر لینا ہے کہ یہ پیسہ ہماری جیب میں
آکر غیر قوم کے بھوکے کا پیٹ بھرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اور ذرا باریک نظر سے
دیکھا جائے تو اُس بھوکے پر ظلم ہے جو ہر ایک کے کام آنے والا پیسہ لیکر جانیوالے
کو سب سے پہلے ملا تھا۔ اور اسی طرح جو شخص کوئی اور خدمت کرنے کے لائق
ہے اور خدمت کرنی چاہتا ہے تو چونکہ سب قابلیتوں میں قدرت نے ہر قوم کو فائدہ
پہنچانے کی خاصیت رکھی ہے اور قدرت ہی نے فائدہ پہنچانے والوں کو وُہ قابلیت
دی ہے اس لئے فائدہ پہنچانے کی نیت کرنے کے بعد درحقیقت منشائے قدرت
کے خلاف ہوگا۔ اگر اس شخص کو محروم رکھا جائے جو سب سے پہلے فائدہ لینے کا مستحق
ثابت ہوا ہے اور محروم اس خیال سے رکھا جائے کہ وُہ اُن مراسم کا پابند نہیں جو
فائدہ دینے والے کو پسند ہیں۔

عداوت کا دفعیہ۔ بیشک مُلک میں ایسا اعلیٰ اخلاق اور حاجتمند کو دیکھکر
مدد کے لئے بیقرار ہو جانے کا جذبہ اور تمام انسانوں کو مساوی سمجھنے کا یقین پیدا

کرنا قومی ہمدردی ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص روپیہ رکھتا ہے اور رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ وُہ اس روپیہ کو صرف اپنی قوم کے فوائد پر صرف کرے یا جو شخص اپنی زندگی یا اُس کا کچھ حصّہ وقف کرنا چاہتا ہے۔ وُہ خاص اپنی قوم کی خدمت میں مصروف ہو۔ پلیڈر اپنی قوم کے سائلوں سے کچھ نہ لے یا کم خرچہ پر پیروی کرے ڈاکٹر اپنے قوم والوں کو بلا فیس طبّی امداد دے۔ عالم اپنا وقت اپنی قوم کے درس و تدریس میں صرف کرے اور اسی طرح وُہ کام جو محض کسی کے اپنے اختیار میں ہو قومی ترقی کے خیال سے کیا جائے تو بیشک قومی ہمدردی ہوگی۔ مگر ان مثالوں میں بھی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ گورنمنٹ ایڈووکیٹ کا فرض ہے کہ ہر ایسے مُستغیث کیلئے پیروی کرے جس کے لئے تنخواہ پاتا ہے۔ ڈاکٹر کا فرض ہے کہ اُس ہسپتال میں آنے والے تمام مریضوں کا علاج کرے جس میں وُہ نوکر ہے۔ تنخواہ دار مدرس کو ایسے تمام طلبا کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے۔ جو اُس کے زیر تعلیم ہوں۔ اِس لئے یہ لوگ اگر اپنے منصبی فرائض میں اپنے ہمقوموں کی جانب غیروں سے زیادہ توجہ کرینگے تو وُہ بھی ظلم اور خیانت کے مرتکب ہیں۔ اعزاز و تحسین کے لائق نہیں۔ مگر جن افعال پر کسی قسم کا معاوضہ نہیں ملتا یا کسی قانون کی پابندی لازم نہیں اور کرنے والے کو انتخاب کے لئے پُوری آزادی حاصل ہو۔ وُہی افعال ہیں جنہیں قومی ہمدردی کا موقع مل سکتا ہے اور ایسے کاموں سے کسی کو شکایت اور رنج کرنیکا حق نہیں۔ اور عداوت پیدا نہیں ہو سکتی

ہمدردی کا اعلیٰ معیار۔ مگر یہ ضرور کہنا پڑیگا کہ قومی اور افرادی تہذیب کا ایک معین درجہ ہے جس کی حد تک اپنے اختیاری خدمات کو قوم کے ساتھ مخصوص کرنا قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ ورنہ جب شائستگی اور اخلاق میں اس حد سے آگے ترقی ہوتی ہے تو آور پردے کھُلتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے دولت و ثروت اور دُنیا کے عیش و آرام کو کسی قوم اور کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور اس کا دسترخوان اعلیٰ اور ادنیٰ

صورت پہنچنے کو ہے۔ لیکن قطع نظر اُس ظلم کے جو ان لوگوں کے ہاتھوں کسی نہ کسی پر ہوتا ہے
وُہ شخص اپنے لوگوں کو ایسے جرم کرنے کی عادت ڈلواتا ہے۔ کیونکہ جُرم کرنے پر ایک دفعہ
بری ہو جانے سے دُوسری بار اسی قسم کا کام کرنے کی جُرأت ہوتی ہے اور ایسے ایسے
موقعے ملتے رہیں تو ہر دفعہ جُرأت بڑھتی جاتی ہے اور دُنیا میں جس قدر شُہدے
اور مجرم پائے جاتے ہیں اُن کا آغاز اکثر اسی قسم کے اتفاقی واقعات سے اور کمال
اسی طرح کے خوش نصیبیوں سے ہوا ہے اور اس لئے خواہ ایک دفعہ کے بعد دُوسری
دفعہ مجرم کسی اَور کے ہاتھ سے سزا پانے پر اپنی عادت کو چھوڑ بیٹھے اور دیگر خواہش
رکھنے والے بھی عبرت حاصل کریں۔ مگر جو لوگ پہلی دفعہ یا ہمیشہ اپنے مجرموں کی حمایت
کرتے ہیں اُنہوں نے اپنی طرف سے وُہ تخم بو دیا ہے جسکا ثمر ان لوگوں کی سنگدلی
اور سفاکی ہوسیں۔ ایسے لوگ علاوہ ملک کے اور انصاف کے دشمن ہونے کے اپنی
قوم کے ہمدرد بھی نہیں ہیں اور اُس عضو کا اپریشن نہیں کرتے جو آخر کار تمام جسم کو
مسموم کر دیگا اور ہلاکت کا باعث ہوگا۔

ہمدردی کا موقع۔ غرض یہ اور اس قسم کے اَور کام جو انصاف کے خلاف اور خود
اپنی قوم کیلئے بہت سے بد نتائج کا موجب ہیں سخت ترین ظلم کہلانے کے مستحق ہیں
اور ہمدردی کا اعزاز نہیں پا سکتے۔ اور وقت پر ہوا خواہوں یا خود غرضوں کی طرف
سے اُن کی تعریف اس لئے کیجاتی ہے کہ اُن پیچ در پیچ اور مخفی نتائج تک نظر
نہیں پہنچتی جو بظاہر خفیف واقعات سے پیدا ہوتے ہوئے۔ آخر میں خوفناک تباہی تک
پہنچاتے ہیں اور قوم کو ترقی کے سچے رستہ پر چلنے نہیں دیتے۔ البتہ جن کاموں
سے محض فائدہ متصوّر ہے اور کسی طرح کے ظلم کا احتمال نہیں۔ انکو اپنی قوم سے مخصوص
کرنا قومی ہمدردی ہوگا۔ چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں جن رفاہ عام کے کاموں سے
محض فائدہ متصوّر ہے اور کسی طرح کے ظلم کا احتمال نہیں انکو اپنی قوم سے مخصوص

اعدکسی اَور کام میں لگنے اور اس لئے ہمارے ایسے ہمدرد بعض لوگوں کو بالاخانوں پر بیشک چڑہا دیتے ہیں مگر اُن سیڑھیوں کو توڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن سے اُنکے اَور بھائی چڑھ سکیں اور اس لئے ہمدردی کا اعزاز پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

(۵) تناسب۔ اگر یہی نہ ہو اور صیغہ کے اُمیدواروں میں سے قابل افراد کو جگہ دیجائے۔ مگر کوشش یہ ہو کہ تمام صیغہ پر محض اپنی قوم کا تصرف ہو اور اُدھر اس ملک یا علاقے میں دیگر قومیں بھی آباد ہوں تو ان اقوام کے بہت سے فوائد اور اغراض کو بغیر کسی بدنیتی کے بھی نقصان پہنچ جانا یقینی ہے کیونکہ قومی رسم و رواج اور قومی عقائد اور جذبات کو غیر قوم کا فرد اس خوبی سے سمجھ ہی نہیں سکتا جس طرح سمجھنا ملکی کاروبار اور انتظامِ سلطنت کے واسطے ضروری ہے اور یہی وہ اصُول ہے جس سے شائستہ قومیں رعایا کا کسی نہ کسی حد تک کاروبارِ حکومت میں شریک ہونا ضروری جانتی ہیں اس لئے کسی صیغہ کو ایک قوم کے تصرف میں دیدینے سے انتظامِ حکومت اور ملکی امن و امان میں اسی قدر خلل پیدا ہوگا جس قدر اُس صیغہ کا اثر ہے اور اس فعل سے وُہ تمام قومیں متاثر ہونگی جو ملک میں آباد ہوں۔ پس ایسی کوشش کرنے والے اُن نتائج کو نہیں دیکھتے جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہوئے ملک اور خود انکی قوم کو بے امنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبُور کرینگے اور یہ لوگ قوم کے وہ نادان دوست ہیں جو جسم میں زہر پھیلا کر امید رکھتے ہیں کہ بیمار صحت یاب ہو جائیگا۔

(۶) مجرموں کی طرفداری۔ جو افسر اپنے ہمقوم ماتحتوں کے قصوروں کو چھپاتا ہے یا جو اہل الرائے فساد کرنے والوں میں سے اپنے طرفداروں کی بیجا حمایت کرتا ہے وُہ انکو اُس نقصان سے بیشک محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو

(۴) **غیر مستحق کو ملازمت دینا**۔ اگر نوکری ایسے شخصوں کو دیجاتی ہے جو قوم کے لائق افراد تو ہیں مگر اُس صیغہ سے تعلق نہیں رکھتے یا اس کام کے اُمیدواروں میں جونیئر ہیں اور غیر قوم کے سینئر امیدوار بھی قابلیت رکھتے ہیں تو بیشک ایسے حاکم نے کام کو قابل ہاتھوں میں دیا اور اس لحاظ سے مُلک اور گورنمنٹ کا کوئی قصور نہیں کیا۔ لیکن جو شخص کسی کام کے لئے تگ و دو اور کوشش کرتا ہے قدرت کا قانون ہے کہ وُہ کامیاب ہو اور اسی قانون کا علم ہے جس سے ہر طرح کے علمی اخلاقی اور رُوحانی کمالات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اگر معلوم ہو کہ کوشش پر نتیجہ مرتب نہوگا تو کوئی شخص کوشش کی طرف قدم نہ اُٹھائیگا اور ظاہر ہے کہ سررشتوں میں اُمیدوار رہنا اور مفت کام کرتے رہنے سے ایک وقت پر معاوضہ پانے کی اُمید رکھنی یہ بھی ایک کوشش ہے بلکہ یہی کوشش ہے جس سے عام طور پر کام ملا کرتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے لیکن جو حکّام کوشش کرنے والوں کو مایوس کر کے ایسے شخصوں کو کامیاب کرتے ہیں جنہوں نے کوشش نہیں کی وُہ اپنے طرزِ عمل سے سکھانا چاہتے ہیں۔ کہ کوشش پر نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اُس جذبہ کو نابود کرنا چاہتے ہیں جس سے دُنیا کی تمام ترقیاں وابستہ ہیں۔ اور اس طرح پر اگر وُہ علمی لیاقت بڑھانے کی ترغیب دیتے ہیں تو عملی قابلیت اور مقاصد تک پہنچنے کے صحیح رستہ کو بھلانا چاہتے ہیں اور اس لئے عملی طور پر وُہ بھی گورنمنٹ ملک اور خود اپنی قوم کو کچھ کم نقصان پہنچانے کے مرتکب نہیں ہوتے اور یہی غیر ہمدردانہ ہمدردی ہے جس کے بھروسے پر ہمارے مُلک کے ہزاروں نوجوان ادھوری تعلیم کے بعد مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے ہمقوموں کے لئے وبالِ جان ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر انکو یقین ہوتا کہ بغیر لیاقت کے کام ہرگز نہ ملیگا۔ تو یا تعلیم کو تکمیل تک پہنچاتے اور یا اس طرف توجہ نہ کرتے

اُمیدواروں کے نمبر کم کرنے یا انہیں ناکام رکھنے کی کوشش کرتا ہے یا جو خدمات اُنکو مل سکتی ہوں وُہ اُس کے ہم قوموں کو ملیں تو کاروبار پر نالائقوں کو قابض کرنے کے علاوہ قابلوں کو کام سے اور کام کو قابلوں سے محروم رکھنے کا مرتکب ہوتا ہے اور ایک فعل سے نقصان پہنچا کر دُوسرے فعل سے اہل لیاقت پر اور مُلک پر ظلم کرتا ہے اور خود کوئی تکلیف برداشت کرنے کے بغیر ہمدردی کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُس تکلیف اور مُصیبت سی جو اس کے ہاتھوں بہت سے بندگانِ خدا کو پہنچی۔

(۳) نالائقوں کو ملازمت دینا۔ اگر کوئی بااختیار اپنے صیغہ میں قومیّت کے خیال سے بھرتی کرتا ہے ایسے لوگوں کی جو اس کام کی قابلیت نہیں رکھتے تو اس نقصان کے ساتھ جو وُہ اپنے ملک اور گورنمنٹ کو پہنچاتا ہے اور اُس ظلم کے ساتھ جو وُہ قابل آدمیوں پر نازل کرنے کا مرتکب ہوتا ہے حقیقت میں اُس شخص پر بھی ظلم کرتا ہے جسکی ہمدردی ظاہر کیجاتی ہے۔ کیونکہ نالائق اپنے فرائض کو نہ سمجھنے کے سبب ایسی غلطیوں کا نشانہ بن سکتا ہے جن سے خود اسکو نقصان پہنچے۔ اور نیز اگر اسکو کام کرنے کی جُرأت نہ دلائی جائے تو بعض اوقات وُہ خود بھی لائق بننے کی کوشش کرتا ہے اور وُہ نہیں تو اس کی نظیر کو دیکھکر اور نالائق اپنے تئیں لائق بنانے کی کوشش کرینگے اور اکثر کامیاب ہوسکینگے لیکن نالائقوں سے ہمدردی کرنے کی رسم انکو نالائق رہنے اور مُلک کو ترقی اور کمال سے محروم نہ رکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور خود انہی کے ہاتھوں انکو بہت سے نقصان پہنچانے کا باعث ہوتی ہے۔ پس یہ ہمدردی حقیقت میں اس شخص کی سی ہمدردی ہے جو دیوانہ کو کپڑے پہناتا ہے اور دیوانہ کپڑوں کو آگ لگا کر اپنے تئیں بھی تلف کر دیتا ہے اور اس لئے ایسا ہمدرد خود دیوانہ کہلانے کا مستحق ہے۔

دشمن پیدا کیا جاتا ہے اور سوسائٹی کے ایک رکن سے ہمدردی کرتے ہوئے ایک ملکی بھائی پر ظلم کرنے کے ساتھ خود اپنی قوم کو نقصان پہنچانے کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ایک جیب کترکر دوسرے بھوکے کو کھانا دینے سے آئندہ اور جیبیں کترولنے کا سامان کیا جاتا ہے اور چونکہ ایسا فعل ہمدردی نہیں اس لئے مقدمات میں جج کے فرائض سے زیادہ رعایت بھی ہمدردی میں داخل نہیں اور ایسے لوگوں کو موجب ظلم کہنے کے بجائے خیرخواہ قوم سمجھنا غلطی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) امتحان۔ اگر ممتحن اپنے ہمقوم امیدواروں کے جوابوں پر نمبر دیتا ہے جو غلط ہیں یا ایسے جوابوں پر پورے نمبر دیتا ہے جنمیں غلطی ہے تو چونکہ یونیورسٹی نے اسکو ممتحن قرار دیا ہے اس لئے کہ وہ امیدواروں کی واقعی قابلیت سے اطلاع دے اور یونیورسٹی کو امیدواروں کے واقعی قابلیت معلوم کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ جو قابل ثابت ہوں انکی شہادت دے اور سرکار یا پبلک اس شہادت کے مطابق قابل آدمیوں سے ملکی خدمات میں وہ کام لے جسکے وہ اہل ہیں اور یوں ملک اور اہل ملک کی خوشحالی کو ترقی ہو ورنہ نالائقوں کے ہاتھ میں کام دیا جائیگا تو عمدگی سے سرانجام نہ ہوگا اور گورنمنٹ اور ملک کی تمام قوموں کو اس سے نقصان پہنچیگا۔ اس لیے جو ممتحن ہمقوم کی قابلیت کو اصلی حالت سے بہتر ظاہر کرتا ہے وہ دھوکا دیتا ہے اور نہ صرف یونیورسٹی کے کام کی خوبی کو زائل کرتا ہے بلکہ سرکار کو اور پبلک کو نقصان پہنچاتا ہے اور پبلک میں خود اس کی قوم بھی شامل ہے۔ اس لئے وہ ایک دنبل میں قیمہ بھرنے کے لئے تمام جانداروں کا گوشت چھیلنے کے علاوہ خود اپنی قوم کے تمام جسم میں گھاؤ ڈالنے کی تدبیر کرتا ہے اور ایسا شخص نہ صرف ہمدردی کے وصف سے عاری ہے بلکہ انسانیت اور عقل کا معمولی وصف بھی اسکے اندر پایا نہیں جاتا۔ اور اگر کوئی شخص اپنے ہمقوموں کو اس طرح کی امداد دینے کے ساتھ غیرقوم کے لائق

ڈالنے سے دُوسری ضرورت اور دُوسرے عضو کے بارہ میں ظلم کیا۔ اور اسی طرح یہ بھی
ہمدردی نہیں کہ ایک بھوکے کو کھانا کھلانے کے لئے ایک اور کی جیب کترلی یا مادۂ
فاسد کو نکالنے کے لئے کسی عضو کو چیرنا یا کاٹ ڈالنا ضرور ہے اور بیمار اذیت
سے گھبراتا ہے تو محبت کے جوش میں اپریشن سے باز رہنا ہمدردی نہیں بلکہ ظلم
ہوگا اور نیز جو دیوانہ کپڑے پہن کر آگ لگا لیگا اور کپڑے فنا کرنے کے ساتھ اپنے
جسم کو بھی نقصان پہنچائیگا۔ اس کو لباس پہنانا ظلم ہے اور ہمدردی کا مستحق وُہ ننگا ہے
جو کپڑوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور اپنے تئیں سردی گرمی سے بچانے کی ضرورت
محسوس کرتا ہے۔ اِن مثالوں کو دیکھنے کے بعد بالکل یہی منظر پیش آتا ہے۔ اگر
ملک یا کم از کم اپنی قوم کو ایک شخص فرض کیا جائے مثلاً

(۱) **مقدمات**۔ اگر عدالت میں ایک شخص نے ناحق یا اپنے حق سے زائد
دعویٰ دائر کیا ہے اور وُہ شخص حاکم عدالت کا ہمقوم ہے اور مدعا علیہ غیر ہے اور
اِس لئے حاکم اس کی رعایت کرتا ہے۔ فریق ثانی پر سوال اس طرز سے کئے جاتے
ہیں کہ اظہار سے خود بخود مُدعی کے بیان کو تقویت پہنچے۔ مدعی کی شہادت پر
مناسب جرح کرنے سے روکدیا جاتا ہے اس کی دستاویزوں سے ڈھونڈھکر
وُہ موقعے نمایاں کئے جاتے ہیں جو اُسے مفید ہوں اور یُوں روئداد کو پختہ
کیا جاتا ہے۔ تاکہ فیصلہ اس کے حق میں ہوسکے یا کبھی بغیر ایسی حکمتوں کے
سینہ زوری سے روئداد کے خلاف محض ہمدردی کے خیال سے ڈگری دیجاتی ہو
تو اس صُورت میں فریق ثانی پر ظلم ہونے اور اس سے اس کا حق چھیننے کے علاوہ
خود اپنے ہمقوم کو حق کے خلاف کوشش کرنے کی جرأت دلائی جاتی ہو اور بھیڑیئے
کو انسان کا خون چٹانے کے بعد خود اس کے پالنے والے بھی محفوظ نہیں رہ سکتے اسی طرح
خلافِ واقع فریاد اور ناجائز کوشش کی عادت ڈال کر خود اپنی قوم کے لئے ایک خوفناک

میں شرارت سے اور دوسروں کو اُلّو بنانے کے لئے۔ مگر جادو کار گر ضرور ہو جاتا ہے اور نہ صرف سُننے والوں کا دل پسیجتا ہے۔ بلکہ کہنے والے بھی ایسا کرنے والوں کو ایشور کا اوتار اور ولی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح یہ عقیدہ عام ہو گیا ہو کہ کسی پر چھُری پھیر کر آئے یا مال مار کر لائے۔ اپنوں کا فرض ہے کہ اپنے کو بچائیں اور اسکو کنوئیں میں سے نکالنے کے لئے مضائقہ نہیں۔ اگر غیر کو دھکا دیکر پھینکدیں اور اس کی پُشت پر سے رستہ بنائیں۔ مگر ایک وقت پر کسی عقیدے کا عام ہو جانا اور بات ہو لیکن واقعیت کو بدل نہیں سکتا اور غور کرنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ ہمدردی کے معنی کسی کی تکلیف کے وقت میں اعانت کرنا ہے اور اعانت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ جو کام وہ نہیں کر سکتا اور جو وسائل اس کو حاصل نہیں انکے لئے خود کوشش کریں اور جو شخص اس غرض سے مالی یا بدنی تکلیف اُٹھاتا ہے وُہ ہمدرد ہے۔ اب اگر ایسی تکلیف کسی شخص نے کسی انسان کے لئے محض اس کو انسان سمجھکر اُٹھائی ہے تو وُہ انسانی ہمدرد ہے اور اگر کسی کے لئے اپنا ہمقوم سمجھکر اُٹھائی ہے تو قومی ہمدرد ہوگا اور بیشک جس طرح انسانی ہمدردی ایک وصف ہے قومی ہمدردی بھی وصف کہلانے کی مستحق ہے لیکن یہ نہ ہو کہ کسی کے لئے تکلیف پہنچے۔ ایک شخص کو۔ اور اس کا اعزاز دیا جائے دُوسرے شخص کو جس نے تکلیف نہیں اُٹھائی۔ اور اسی طرح یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ کسی کو ضرورت ہے کھانے کی اور ہم اپنے پاس سے دینے کی بجائے اُس کے کپڑے بیچ کر کھانے کا سرانجام کر دیں یا اُس کی کمر پر گوشت خورہ دنبل ہے اور ہم بکری کا قیمہ بھرنے کی بجائے اس کی اپنی ران کا گوشت کاٹ کر زخم کو بھر دیں تو ہمدردی نہ ہوگی اور اگر بالکل آنکھیں بند کر لیں تو اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ کھانے کا سرانجام کرنے اور گوشت خورہ کو بھرنے میں ہمدردی کی مگر ننگا کر دینے اور ران کو چیر

چونکہ ہندو پہلے بیدار ہوئے ہیں اور مسلمان بہت دیر تک مئے شبینہ کے خمار میں مبتلا رہے اس لئے ہمدردی کا احساس اور اس کے لئے ایسی رفتار پہلے ہندو بھائیوں نے اختیار کی - مگر خیر یہ میرا اپنا خیال ہے اور ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ موجودہ عداوت کا سُراغ ملنا اُسی تقلید کی خواہش میں ہے جو انگریزوں کے آنے پر کسی قوم میں زیادہ اور کسی میں کم پیدا ہوئی - اور جس طرح انگریزوں کے اکثر حالات کو ہم نے غلط سمجھا - اسی طرح ہمدردی کے سمجھنے میں یہ غلطی کی اور یہ غلطی بڑھ کر عداوت تک پہنچی - اِس لئے اب اگر ہندو مسلمان دونوں عداوت کے نقصان کو سمجھ گئے ہوں اور اس کو دُور کرنا چاہتے ہوں تو ضرور ہے کہ جو افعال وہ قومی ہمدردی کے خیال سے کرتے ہیں اُن پر نظرِ ثانی کریں اور دیکھیں کہ ہمدردی اور انصاف کہاں تک برابر رکھا جا سکتا ہے اور کہاں تک اور کیا نقائص ہیں جن سے ہمدردی ظلم بنجاتی ہے -

ہمدردی کی حقیقت - کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اپنوں کے ہونے کا فائدہ ہی کیا جب بُرے وقت میں اور مصیبت پڑنے پر کام نہ آئیں - مگر آہ! انسان بہت دھوکہ باز مخلوق ہے اور دُوسروں کو دھوکا دینا ایک طرف کبھی اپنے آپ کو بھی دھوکا دے لیتا ہے - فقیر صدا کرتا ہے "مجھے پیسہ دینے والے تیری آئی بلا دُور" - اور اکثر نادان محض اسی خیال سے دینے میں جلدی کرتے ہیں کہ "فقیر کا بس شیر کا بن ہے - کیا معلوم کوئی بلا آنے کو ہو جسے دیکھکر یہ پکار رہا ہے" اور اگر اتفاق سے رات کو چور آئے اور خبر ہو جانے پر بھاگ نکلے - یا آگ لگ جائے اور جلدی سے فرو کر دیں تو پھر شاہ جی پر لوگوں کو اعتقاد ہونا ہی تھا خود شاہ صاحب کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ "جو بات ہمارے مُنہ سے نکلے خدا پوری کر دیتا ہے" اسی طرح قومی راگ گانے والے یہاں بھی قصور اور شرارت کرنے کے بعد ایسے فقرے کہتے

رنجش پیدا ہونے کے باعث افعال سے بڑھکر نیتوں پر حملہ کیا جانے لگا اور مسلمان گائے ذبح کرتا ہے تو اس کو مذہبی حکم سمجھنے کی بجائے فریاد ہونے لگی۔ کہ ہم کو ستانے کے لئے ایسا ہوتا ہے۔ اور ہندو چھوت کا خیال کرتا ہے تو اس کا قدیمی طریق سمجھنے کی بجائے کہنے لگے کہ ہم کو ذلیل جانکر نفرت کیجاتی ہے۔ اور اس طرح سے جو ناجائز طرفداریاں کیجاتی تھیں انکو بجا ثابت کرنے کے لئے اور دوسروں کو بدنیت اور فسادی اور ہمدردی کے ناقابل ٹھہرانے کے لئے ان شکایتوں کو معقول عذر قرار دیا گیا۔ مگر قاعدہ ہے کہ سزا دینی یا بدلہ لینا عداوت کو بھڑکاتا ہے اس لئے ان شکایتوں سے دل اور پہلے اور اب موجودہ ہم وطنوں کو بدنیت اور شریر کہتے کہتے اُنکے بزرگوں کو ملزم ٹھہرانے اور ہمیشہ سے ظالم اور سفاک ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ اور ایسی کوشش نے پرانے بادشاہوں اور انسے بڑھ کر مذہبی پیشواؤں کی نسبت وہ وہ اتہام اور بے ادبیاں صادر کروائیں جنکو سنکر رونگٹے کھڑے ہوں اور خون میں جوش آئے اور فتنہ و فساد کی وہ آگ بھڑکی کہ اب ایک فریق دوسرے کی تقریر نہیں سن سکتا۔ اور تحریر اور اخبار اور رسالہ غصہ سے کانپ اُٹھنے کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ اور لطف یہ کہ ابتک ان سب بیہودگیوں کو قومی ہمدردی کے روغن نے چھپایا ہوا ہے اور قوم پر جان دینے والے ان ظلموں کے ارتکاب سے وہ فرض اتم ادا کرتے ہیں جس سے بڑھکر دنیا میں کوئی نیکی نہیں اور جب تک یہ حالت قائم ہے اور جب تک ہمدردی کے مفہوم کا اس طرح پر خون ہوتا رہیگا۔ ہندو مسلمانوں کی عداوت روز افزوں ترقی کریگی اور زوال کا مُنہ نہ دیکھے گی۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمدردی کو خواہ غلط سمجھا گیا مگر اس طرح کے استدلال کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہوش اور زمانے کی حالت کو دیکھنے کی قوت درکار تھی اور

ہمدردی کے غلط معنی۔ اسوقت اِس امر پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزوں میں قومی ہمدردی ہے یا نہیں اور ہے تو کس حد تک۔ ہمارے مُلک میں جو علت و معلول کا سلسلہ کام کر رہا ہے اُس میں اپنی عقلی رفتار کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم نے اُنکے افعال سے اُنکی اخلاقی حالت کو جانچا اور سمجھے کہ قومی ہمدردی ہی وُہ اصول ہے جس نے سات سمندر پار ہندوستان جیسے برّاعظم کو اُنکے پاؤں میں ڈالدیا۔ چنانچہ اس وقت ہندو مُسلمان دونوں قوموں کے ذرا سمجھ دار افراد میں قومی احساس پیدا ہوا اور چونکہ دماغ سلیم نہیں تھا قومی ہمدردی کے معنے یہ لیتے گئے کہ جہانتک ہو سکے اپنوں کو بڑہاؤ اور غیروں کو پامال کرو۔ چنانچہ کوئی عدالت کی کُرسی پر ہے تو سمجھتا ہے کہ اہل مقدمات میں گو ہمقوم کا حق نہ ہو جب بھی ڈگری دیجائے اور غیر اس کے حق سے محروم کر دیا جائے تو قوم پروری کا اعلیٰ کارنامہ ہوگا۔ اور کوئی انتظامی اختیارات رکھتا ہے تو غیر قوم کے مُلازموں کو برطرف کرنے اور ہمقوم کو ملازم رکھنے کی تدبیر کرنی کار ثواب جانتا ہے اور دل میں مسرت محسُوس کرتا ہے۔ ممتحن ہے تو غیروں کے نمبر کاٹنے اور اپنوں کو غلط لکھنے پر پاس کر دینے کو ہمدردی جانتا ہے۔ اور اہل الرائے ہو تو فسادات اور بلوؤں کے وقت مظلوموں کو غیر ہونے کے جُرم پر سزا دلوانے اور ظالموں کو اپنا جان کر بری کروانے کی تدبیریں سوچتا ہے اور اسی کو نجات سمجھتا ہے۔ غرض ہمدردی کا یہ اصُول قرار پایا اور کچھ تو ایک طرف چل پڑنے سے رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے اور رستہ زیادہ سے زیادہ روشن دکھائی دینے لگتا ہے اور کچھ دونوں فرقوں کے ایسے سلوک سے باہم گر شکایت پیدا ہونے اور ظاہر کیجانے لگی۔ جس سے عداوت کا رنگ آگیا۔ اور اب وُہ زمانہ آیا کہ اس غلط ہمدردی نے دُوسروں کے افعال پر گرفت کرنے اور اپنے افعال سے نقصان پہنچانے کے آگے ترقی کی۔ اور شکایتوں سے

یہ بھولی کہ صرف انگریزی زبان سیکھ کر اسی کو قابلیت کا معراج گردان لیا گیا اور جو زبان میں
جس قدر علوم تھے اُن کی طرف توجہ نہ کرنے کے باوجود اپنے تئیں عالم باکمال سمجھنے لگے۔
سمجھا گیا کہ اُنکے اطوار قابلِ تعریف ہیں اور حاصل کرنے چاہئیں اور بجا سمجھا۔ مگر نادانی
سے اطوار میں سے نشست و برخاست اور لباس اور مکان میں اُنکی نقل کرنے کو کافی
سمجھا گیا اور انگریزوں کی شکل بنا کر سمجھ لیا کہ اُن کے کمالات قبضہ میں آگئے۔ سمجھا گیا
کہ پابندیٔ اوقات اُن لوگوں کی ترقی کا گُر ہے اور واقع میں ہے۔ مگر قباحت یہ ہوئی
کہ حاضری اور ڈنر کا وقت اور فُٹ بال اور ٹینس کا وقت چھوٹنے نہ پاتے۔ پابندیٔ
اوقات کا یہی مقصود گردان لیا گیا۔ غرض جہالت وُہ باعث تھا جس نے انگریزوں
کی فوقیت ثابت ہونے کے بعد فوقیت تک پہنچنے کا صحیح رستہ دیکھنے نہ دیا
اور پکّی سڑک چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی پگ ڈنڈیوں کی خاک اُڑانے لگے۔ اِسی جہالت
میں جب دیکھا کہ پہلے بادشاہوں کے زمانے میں دیسیوں کو صوبوں کا حاکم بنا
دیتے تھے اور وُہ بھی اس شان سے کہ خزانہ بھی اسی کے پاس ہے اور فوج کا سپہ سالار
بھی وُہی ہے اور عدالتی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں۔ اور اب صُوبوں کے
پُرانے حکمران یکے بعد دیگرے موقوف ہوتے جاتے ہیں اور نہ صرف وُہ بلکہ
قسمتوں کے کمشنر اور ضلعوں کے کلکٹر بھی دیسی نہیں بنائے جاتے اور ہر اسامی
پر ولایت سے عہدہ دار بُلایا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اِنتظامی عدالتی اور فوجی
تمام کاروبار میں مشورہ صرف اپنے ہمقوموں سے لیا جاتا ہے تو اس وقت ملک والے
یہ کہاں سمجھ سکتے تھے کہ انکے اصُولِ ملکداری ہم لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ اِس لئے
حکومت اور مشورہ کے لائق نہیں ہو سکتے۔ خیال یہ کیا گیا کہ ان لوگوں کی قومی ہمدردی
ہے جس سے اپنی قوم کے سوا غیروں کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ بلکہ اَوروں کے حقوق
بھی اپنوں ہی کو دیتے ہیں اور فوقیت حاصل کرنی ہو تو یہی وصف پیدا کرنا چاہئے۔

کا خیال نہیں آیا۔ چہ جائیکہ ہندوں سے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے ممکن تھا کہ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی فوقیت کی یاد اور اُس کی تلافی کی تحریک باقی نہ رہتی اور دو ملکی بھائیوں کے ایک حالت میں ہونے سے ایک کو دوسرے سے ہمدردی ہو جاتی مگر ہندوستان کے نئے دَور نے دوسرا سبب پیدا کر دیا جو اب تک قائم ہے۔

عقیدہ قومیت۔ دُوسرا سبب یہ ہُوا کہ انگریز ہندوستان میں ایسے وقت آئے کہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کو جس درجہ تک ہندوؤں نے اپنے زمانے میں اور مسلمانوں نے اپنے زمانے میں پہنچایا تھا اس وقت دونوں اپنے اس سرمایہ کو کھو بیٹھے تھے اور ہندوستان جہالت اور وحشت کا شکار ہو رہا تھا اُدھر انگریز آئے تو اس شان سے آئے کہ اُنکے فنونِ جنگ۔ اُنکی حکمتِ عملی۔ اُن کا آئینِ ملکداری۔ اُن کی صنعتیں اور اُنکے علوم۔ غرض ہر اداسے ہندوستانی حیران رہ گئے۔ کیونکہ سب باتیں اُن کی سمجھ میں فوق العادت تھیں اور وُہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کبھی ڈرتے تھے کہ یہ کوئی بلا ہیں اور کبھی تعریف کرتے تھے کہ آدمیت ہر تو انہی میں ہے۔ اس حیرت و استعجاب نے دِل میں تجسس پیدا کیا اور انگریزوں کے ایسے کمالات اور ایسی کامیابی و اقبالمندی کی وجہ تلاش کرنے لگے۔ مگر آہ۔ جہالت بُری چیز ہے۔ دماغ کام نہیں دیتا اور بالخصوص قومی جہالت انسان کو صدیوں تک برباد رکھتی ہے۔ اور دو چار دس روشنی میں آئیں بھی تو اُنکے دماغ ایسے سلیم نہیں ہو سکتے جس قدر کسی ترقی یافتہ قوم اور اُس کے علما کے ہونے چاہئیں چنانچہ انگریزوں کی نسبت بہت سے استدلال قائم ہُوئے اور اکثر میں دھوکا کھایا۔ سمجھا گیا کہ اُنکے علوم و فنون حاصل کرنے چاہئیں اور درست سمجھا۔ مگر غلطی

فاتحین فاتح بننے کی قوت کھو بیٹھے۔ زمانے کو نہ کسی سے خاص عناد ہے اور نہ کسی کی خاص رعایت۔ فاتحین عزت کے منصب سے معزول ہوئے اور جنہیں استحقاق ثابت ہوا خالی اسامیوں پر لائے گئے۔ اس وقت ہندوؤں کو ضرور خیال آنا چاہئے تھا اور آیا ہوگا کہ جو لوگ ہمارا تخت چھین کر ہم سے بڑھ بڑھ کر چلتے تھے۔ آج وہ بھی پیچھے ہو کر ہمارے برابر آ گئے اور پہلے جو قوت کی وجہ سے اُن کی ہر ادا ہم سے بہتر نظر آتی تھی۔ اب وقت ہے کہ ہم سب باتوں میں اُن سے بہتر اور برتر ہو کر دکھائیں۔ کیونکہ پہلے اُن کا پاس کرنا پڑتا تھا اور اب برابر کی دَوڑ ہے۔ غرض پہلے اگرچہ میرے عقیدہ میں ہندو مسلمانوں کے اندر کوئی قومی عناد نہیں تھا اور نہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی حکومت سے کوئی وجہ شکایت موجود تھی۔ مگر پہلے فاتح اور مفتوح کی نسبت موجود ہونے اور پھر اُس کے جاتے رہنے پر اس احساس کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا چنانچہ ہوا اور ہندوؤں نے اپنی قوم کو مسلمانوں سے بڑھانے اور بڑھا ہوا ثابت کرنے کے لئے حسب ضرورت قابلیتوں کو حاصل کرنے اور اپنی فطری قابلیتوں کو دکھلانے اور اپنے اطوار و عادات کو زمانے کے مناسب بنانے کی اور اپنی قوم کو اس کام کے لئے اُکسانے اور بڑھانے کی کوششیں شروع کیں اور اسوقت ضرور تھا کہ وُہ مسلمانوں کی نسبت اپنی قوم سے زیادہ ہمدردی کرتے اور جس مفاد تک دونوں پہنچ سکتے ہوں جھپٹ کر پہلے اپنے ہمقوم کو اُس تک پہنچاتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا کہ اور یوں بے اختیار وُہ قومی خود غرضی پیدا ہو گئی جو آج عداوت کا تناور درخت بن رہی ہے۔ لیکن اگر صرف یہی احساس ہوتا اور دیگر واقعات جو آیندہ پیش آئے نہ پیش آتے تو چونکہ کوئی عناد نہ تھا اور اُدھر مسلمان تازہ صدمہ اُٹھا کر ایسے مضمحل ہو رہے تھے کہ انہیں برسوں تک زمانے کی رفتار پر چلنے

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

سلطنت کا انقلاب۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ہندوستان میں مسلمان حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اور اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ کسی وقت کسی ایک حکمران کے ہاتھ سے کسی خاص شخص یا اشخاص پر ظلم ہو جانا ممکن ہے اور ایسا کبھی خود اپنی قوم کی حکومت میں بھی ہو جاتا ہے مگر بحالتِ مجموعی مسلمان حاکموں کا برتاؤ ملک کی ہندو جماعت کے ساتھ مشفقانہ اور محبت آمیز تھا اور اُن فسانوں میں اکثر مبالغہ ہے جو عام طور پر مسلمانوں کے ظلم کی نسبت زبان زد ہیں لیکن پھر بھی حاکم و محکوم کا تفاوت بہت بڑا تفاوت ہے۔ اب زمانہ نسبتاً بہت ترقی کر گیا ہے اور حاکم و محکوم کے فرائض زیادہ واضح اور مشتہر ہو گئے ہیں اور انگریز حکام رعایا سے بیجا تواضع کے آرزومند نہیں ہیں۔ مگر آج بھی انگریز قوم کا ایک ادنیٰ سپاہی دیسی حکام، معززین اور نیز تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایک خاص رعب داب رکھتا ہے اور خواہ دیسی مرتبہ میں اس سے بہت اعلیٰ ہو۔ مگر صاحب لوگ بوجہ حکمران قوم میں ہونے کے ضرور زیادہ التفات حاصل کرتے ہیں۔ یہ فاتحیت و مفتوحیت کا قدرتی اثر ہے اور یہی ڈھلتی چھاؤں کبھی قدیم ہندیوں کے مقابلہ میں آریاؤں پر اور آریاؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں پر سایہ ڈال چکی ہے اور اُس وقت اسی طرح مسلمان کا مسلمان ہونا ہندو عنبلیین کی نظر میں اس کو اپنے سے کسی قدر زیادہ معزز بناتا تھا اور نیز ساتھ ہی یہ احساس بھی ضرور ہوتا ہوگا کہ جو اعزاز آج انکو حاصل ہے کبھی ہمیں حاصل تھا۔ اس کے بعد زمانے نے پلٹا کھایا اور

اپنی بندوقوں سے "بیلون" کو چاند ماری کا ٹارگٹ بنا دیا۔ خیر گذری کہ "بیلون" خالی تھا اور کوئی اس میں سوار نہ تھا۔

اِس کے دُوسرے تیسرے سال اسی مقام سے دو یورپین "بیلون" میں بیٹھکر اُڑے اور شہر سے مشرقی جانب چار میل کے فاصلہ پر "سرور نگر" کے قریب صحیح سالم اُترے۔

اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں ایک اٹالین لیڈی مِس "آمکل" بیلون میں پانچ ہزار فٹ بلند اُڑکر چھتری (پیراشوٹ) کے ذریعہ نیچے اُتر آئی۔ اِسی کے دو چار روز بعد پھر دوبارہ اُڑی اور پہلے سے زیادہ بلندی پر پہنچکر شہر سے مغربی و شمالی جانب چھ میل پر اُتری۔ اِس کے بعد بھی دو ایک مرتبہ حیدرآباد میں ہَوا میں اُڑنے کا نظارہ دیکھا گیا ہے مگر افسوس کہ اِس وقت صرف حیدرآباد ہی نہیں۔ بلکہ کل ہندوستان میں ان کارگذاریوں کا قریبًا کل حصّہ یورپینوں ہی کے ہاتھ رہا۔ بعض فوجی سپاہیوں کے علاوہ اہلِ ملک سے شاذ و نادر ہی کسی شخص نے اِس قسم کی بلند پروازی کی جُرأت کی ہے۔

۱۹۰۷ء میں ہز مجسٹی سراج الملۃ والدین امیر کابل نے سیاحتِ ہند کے وقت ایک مقام پر بنفسِ نفیس ایک فوجی "بیلون" میں بیٹھنے کی جُرأت دِکھائی۔ چونکہ "بیلون" میں اُڑنے کے لئے مہارت ضروری ہے اور غیر عادی شخص نہیں اُڑ سکتا لہٰذا تھوڑی بلندی پر پہنچنے کے بعد بیلون اُتار لیا گیا۔

کچھ عرصہ ہُوا کہ ایک پنجابی شخص نے بمقام کلکتہ اپنے بنائے ہُوئے "بیلون" میں ہَوا میں اُڑنے کا کرتب دکھایا۔ عجب نہیں جو یہی سب سے پہلا "بیلون" ہو جو ہندوستانیوں کے ہاتھوں تیّار ہوا ہو۔ کس قدر تعجّب اور افسوس کی بات ہے کہ اہلِ یورپ نے تو اس مقصد میں اس درجہ عروج حاصل کر لیا ہے کہ آسمان کے تارے بن رہے ہیں اور ہم نے اب کہیں اس کی ابجد خوانی شروع کی ہے۔ خُدا کرے کہ ہمارے اہلِ ملک بھی اس مقصد میں کافی توجّہ کے ساتھ کامیابی حاصل کر کے اپنے ملک کے "قدیم اُڑن کھٹولوں" کو صحیح ثابت کر دکھائیں۔

سید شہاب الدین جھنڈوی (از حیدرآباد)

اب تک تو ہم یورپ و امریکہ کی ہوا کھاتے رہے اب خاص ہمارے ملک میں ہمارے عنوان سے متعلق جو کارروائی ہوئی ہے۔ اس کا بھی مختصر حال ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ ہندوستان میں فوجی "بیلونوں" کے علاوہ اکثر مقامات پر تماشا کے طور پر بہت سے بیلون اڑائے گئے ہیں۔ اور اس وقت "غبارہ" اور "غبارہ میں بیٹھ کر اُڑنے" کے نام سے اکثر لوگوں کے کان آشنا ہو گئے ہیں۔ تخمیناً پچاس سال قبل "بیلون" کا پتہ یہاں نہیں چلتا۔ پہلے پہل سنہ ۱۸۶۷ء میں ایک انگریز نے بمقام بمبئی بیلون میں بیٹھ کر اور اہل ہند کو بغیر پر کے ہوا میں اڑنے کا تماشہ دکھا کر محوِ حیرت بنا دیا تھا۔ اتفاق سے یہ "بیلون" تقریباً چھ ہزار فٹ بلند ہو کر یکایک پھٹ گیا اور "بیلون سوار" سمندر میں گر پڑا۔ احتیاطاً پہلے سے سمندر میں کشتیاں۔ جہازات پھیلا دیئے گئے تھے جن کی وجہ سے وہ غرق ہونے سے بچ گیا۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک بنگالی نوجوان رام چندر چیٹرجی نے اول کلکتہ اور بعد لاہور الہ آباد وغیرہ مقامات پر "بیلون" کے ذریعہ بلند پرواز کی۔ غالباً یہی سب سے پہلا ہندوستانی ہے جس نے اپنے اہل ملک کے لئے نظیر قائم کر دی۔ اور انہیں اس قسم کی جرأت دکھانے کا سبق دیا۔ اس کے بعد سے تو ہندوستان کے اور مشہور مقامات پر ہوا میں اُڑنے کا نظارہ بیسیوں مرتبہ دیکھا گیا ہوگا۔

خاص حیدرآباد دکن میں تو اس کا وجود سنہ ۱۲۹۸ھ یا ۱۲۹۹ھ سے پایا جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلے اسی سال میں سالار جنگ اول کے عہد میں باغ عام سے ایک "بیلون" اُڑایا گیا تھا۔ یہ "بیلون" ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر رازدار خاں[1] کی پہاڑی پر گرا اور شوقین تماشائیوں نے اطراف و جوانب سے دوڑ دوڑ کر اس کو جا گھیرا اور غل لوٹنے

[1] بلدہ حیدرآباد سے قریباً شمالی مغربی گوشہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے چونکہ یہ جس گاؤں کے حدود میں واقع ہے وہ گاؤں کسی زمانہ میں رازدار خاں مہدی المخاطب بہ قول نواز خاں کو سرکار نظام سے جاگیر میں دیا گیا تھا۔ اس لئے یہ پہاڑی اس وقت سے انہی کے نام سے مشہور ہے ۱۲

چنداں ارزاں نہیں مگر ایک اور اعتبار سے یہ نہایت کم قیمت حاصل ہوئی ہے کیونکہ کچھ زمانہ پہلے اندازہ لگایا گیا تھا کہ "بیلون" کے تجربات میں پچیس۲۵ آدمی سے زیادہ ہلاک نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے مقابل قطب شمالی کی تحقیق میں ساڑھے سات سو جانیں تلف ہو چکی ہیں۔

اب وہ دن دور نہیں کہ ہوا میں اڑنا بھی سطح آب پر تیرنے کی طرح ایک معمولی بات سمجھا جائیگا اور "ہوائی جہاز" یا گاڑیاں بھی بری و بحری ذرائع آمدورفت "ریل" اور "جہاز" کی طرح مستقل اور عام سواری کے کام آئینگی۔ چنانچہ یورپ و امریکہ میں اس وقت "ہوا میں اڑنا" مستقل فن تسلیم کر لیا گیا ہے جس کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے۔ ہوائی جہازوں اور گاڑیوں کی تجارت شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ حال کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جہازوں کی مانند روس و جاپان وغیرہ نے برلن پایہ تخت جرمن کو ہوائی جہازوں کی فرمائشیں کی ہیں۔ جرمن میں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء میں اس فن کی تعلیم کے لئے باضابطہ مدرسہ قائم کیا گیا اور دوسرے علوم و فنون کی طرح اس کے لئے نصاب تعلیم۔ مدت اور طریقہ تعلیم وغیرہ امور بالکل باقاعدہ طور پر جاری کئے گئے۔ فرانس میں گو خاص مدرسہ قائم نہیں ہوا تھا البتہ انجمنوں۔ کلبوں۔ فوجی چھاونیوں میں اس فن کی باضابطہ تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ جہاں شوقین لوگ گیس کی فراہمی ہوائی مشینوں کے کل پرزوں کی شناخت اور ساخت۔ ان کا جوڑنا اور استعمال کرنا وغیرہ سبجکٹوں میں امتحانات پاس کر کے ہر سال اسنادات حاصل کرتے رہتے ہیں اور اس کا شوق کچھ ایسا روز افزوں ترقی پذیر اور عام ہوتا جا رہا ہے کہ آئے دن ہوائی گاڑیوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ منچلے سیاح شرط لگا کر بڑی بڑی مسافتیں طے کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ متعلمین تجربہ اور مہارت حاصل کرنے کی غرض سے بڑے بڑے دھاوے ملتے ہیں۔

جرمنی نے سات لاکھ پچاس ہزار میں موجد سے خرید لیا ہے۔
زپلن نے اسی نمونہ کا ایک اور جنگی جہاز (۴۴۵) فٹ لمبا اور صرف ۴۲½ فٹ چوڑا تیار کیا ہے جسکی رفتار بہت تیز ہے۔ چنانچہ مئی ۱۹۰۹ء میں اس نے بہت بڑا طول طویل ہوائی سفر کیا اور چالیس گھنٹے میں نو سو چالیس ۹۴۰ میل کا چکر لگایا۔
حال ہی میں مسٹر ریمنڈ فلپس مکینیکل انجینیر لورپول نے ایک ہوائی تارپیڈو ایجاد کیا ہے جسکی نسبت انہیں یہ دعویٰ ہے کہ اس سے لندن کے کسی مقام سے سو میل کے اندر بڑے بڑے قلعے اور عمارتیں مسمار کر دے سکتے ہیں۔ چنانچہ موجد نے ۱۰ مئی ۱۹۱۰ء کو لندن کے میدان میں جہاں تیس پینتیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اس کا اس طرح تجربہ کر دکھایا کہ مجمع کے بیچ میں ایک اونچے مقام پر وہ کھڑا رہا۔ روبرو میز پر ایک چھوٹی سی مشین اور اس سے پچاس فٹ کے فاصلہ پر چوبیس فٹ لمبا پانچ فٹ چوڑا ایک ہوائی جہاز رکھا ہوا تھا۔ جس میں تیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مسٹر فلپس نے اس مشین کا ایک بٹن دبایا جس سے جہاز زمین سے کچھ اونچا ہو کر اُن کے سر پر آگیا۔ دوسرا بٹن دبانے پر وہ بلند ہونا شروع ہوا۔ ایک اور بٹن دباتے ہی ہوائی جہاز میں خودبخود روشنی ہو گئی۔ چار سو فٹ بلندی پر پہنچنے کے بعد مسٹر موصوف نے ایک اور بٹن دبایا اور فوراً کاغذ کے مصنوعی گولے حاضرین کے سروں پر اس قدر جلد جلد گرنے شروع ہوئے کہ ۲ منٹ کے قلیل عرصہ میں کل حاضرین پر گولہ باری ہو گئی۔
حاصل یہ کہ کئی اگلے زمانہ کی کامیاب تجویزیں انقلاب زمانہ سے ملیامیٹ ہو کر دوسری اور بہت سی تجویزوں اور تحریکات کی طرح ہوا میں اڑنے کی جدید تحریک بھی سینکڑوں برس کی لگاتار کوششوں سے بتدریج ترقی کرتے کرتے بڑی حد تک مکمل اور بارور ہو چکی ہے اور شوقین لوگ نہایت سہولت و کامیابی کے ساتھ بے کھٹکے میلوں ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ گو مدت کے لحاظ سے تو اس مقصد میں کامیابی

دور کا ایک چکر لگا ہوا ہے جو برقی قوت سے ایک منٹ میں (۱۲۰۰) مرتبہ گھومتا ہے۔
مسٹر رائٹ (امریکن) کی ہوائی مشین (۵۳۸) فٹ وسیع اور (۹۶۸) پونڈ وزنی ہے جس میں ۸½ فٹ قطر کے دو پہیئے اور دو سُکان ایک دائیں بائیں ملنے کے لئے اور دوسرا اوپر نیچے چڑھنے اُترنے کے لئے لگائے گئے ہیں۔

ولاڈی پاری نامی مشین المونیم اور لکڑی کی بنائی گئی ہے جو (۱۱۷) فٹ طویل، فٹ اونچی ہے جس میں (۲۱۱۹۲) مکعب فٹ گیس کی گنجائش اور (۷۰) گھوڑوں کی طاقت ہے۔

انگریزی ڈرنجبل جو ہوائی جنگی جہاز ہے وہ چمڑے کا بنا ہوا ہے جس میں نیچے اوپر چمڑے کی آٹھ تہیں ہیں اور اوپر کینوس منڈھی ہوئی ہے جس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی پرواز کے لئے کسی مدت کا تعین نہیں ہے جس قدر عرصہ چاہو ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے فوجی مقاصد کے لئے بہت مفید مانا گیا ہے۔

لا ربلق کے ہوائی جنگی جہاز میں (۱۲۷۱۰۰) مکعب فٹ گیس کی گنجائش تھی۔ چار آدمی بیٹھ سکتے تھے اس میں ۸½ فٹ قطر کے دو پہیئے تھے اور ۸۵ گھوڑوں کی طاقت تھی۔ یہ جہاز ۲۵- ستمبر ۱۹۰۹ء کو کسی حادثہ سے تباہ ہو گیا۔

کوڈی انگلش، ایک ٹن یعنی ۲۸ من وزنی ہے جس میں دو سکان ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔ یہ جہاز ۸- ستمبر ۱۹۰۹ء کو آلڈر شارٹ سے اُڑا اور ۳۶ منٹ میں چالیس میل طے کیا۔

فارمن (فرینچ) کا جہاز بھی نہایت مشہور ہے جس نے اگست سنہ ۱۹۰۹ء میں (۱۸۰) کیلومیٹر طے کیا تھا۔ اور ۲۷- اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو لنڈن سے مانچسٹر پہنچا۔

کونٹ زپلن کا ایجاد کردہ جہاز سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے جس میں پچیس چھبیس آدمی معہ ضروری سامان رسد کے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کو سلطنت

بیٹھ کر لطفِ پرواز اُٹھا سکینگے۔

جس طرح بیلونؐ میں کامیابی ہوتے ہی اُس سے جنگی اغراض کے لئے کام لینے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اسی طرح ہوائی کشتی یا گاڑی کی ایجاد کے ساتھ ہی اُس کو جنگی اغراض کے لئے مکمل بنانے کا خیال پیدا ہو گیا۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ اس مقصد میں عموماً جنگی اغراض ہی کے لئے یہ سب کوششیں ہوئیں جو بار ور ثابت ہوئی گئیں۔ گویا یہ ایجاد محض جنگجوئی ہی کی غرض سے ہوئی ہے جس کا ثبوت اس سے ہو سکتا ہو کہ گورنمنٹ امریکہ نے یہ قانون پاس کر دیا تھا کہ ہوائی کشتی۔ گاڑی۔ بیلون یا کسی قسم کی ہوائی مشین کے ذریعہ بارود کا استعمال نہ کیا جائے اور شاید اسی قانون کی تائید میں کل دُوَل سے باہمی معاہدہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ مگر جرمنی۔ فرانس برطانیہ کلاں۔ جاپان وغیرہ نے اس قسم کا مُعاہدہ کرنے سے مخالفت ظاہر کی۔ دراصل اگر یہ قانون عام طور پر پاس ہو جاتا تو جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان میں بہت سے لوگ جو اس ایجاد کی تکمیل اور ترقی میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں۔ اس سے بہت کم دلچسپی لیتے اور عجب نہیں جو یہ ایجاد اب سے بہت بعد میں مکمل ہوتی۔ غرضکہ شوقین لوگوں کے شوق جنگی اغراض کے حامی افراد کی سرگرمی اور سلطنتوں کی حمایت سے "ہوائیں اڑنے" کی کوششیں بہت جلد بارور ہوئیں اور اس وقت اس حد تک ترقی کر گئی ہیں کہ آج بہت بڑی بڑی گاڑیاں اور ہوائی جہازات تیار ہو چکے ہیں جن میں کئی کئی آدمی بیٹھ کر ہوائی سفر کر سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور مشہور اور کامیاب مشینوں کا ہم یہاں مختصر ذکر کرتے ہیں۔

مسٹر لیدم نے جو ہوائی مشین تیار کی ہے۔ یہ اکتالیس فٹ لمبی اور (۵۷۰) پونڈ وزنی ہے۔ اس کے پروں کا پھیلاؤ ۴۲ فٹ ہے۔ اس میں آٹھ سلنڈر والی مشین ہے۔ جس میں سو گھوڑوں کی طاقت ہے۔ اس میں سات فٹ قطر پنکھے بائیس فٹ

ہر طرح مکمل ہیں۔ اوران سے آئے دن سہولت و اطمینان سے بڑے بڑے سفر طے ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک فرنچ شخص موسیو بلریو ۲۵۔جولائی ۱۹۰۹ء کو اپنی ہوائی مشین (مونوپلین) کے ذریعہ انگلش چینل کو عبور کرکے انگلستان پہنچا اور اس نے فاتح ہوا کا لقب حاصل کیا ہے۔ اگرچہ جو راستہ بلریو نے طے کیا ہے اُس سے تقریباً سوا سو برس قبل پروفیسر بلانشارڈ نے بھی پہلے پہل طے کیا تھا۔ لیکن اُس میں اور اِس میں بہت بڑا فرق یہ تھا کہ اُس وقت بلانشارڈ کا مرکب ہوائی بالکل بے قابو اور اُس کا منزلِ مقصود پر پہنچ جانا اتفاقی تھا۔ اس کے برخلاف بلیریو کا ہوائی توسن گویا سدھا سدھایا اور ہر طرح سوار کے قابو میں تھا۔

انہی دنوں اخبار "ڈیلی میل" لنڈن کی جانب سے ایک انعامی اشتہار شائع ہوا تھا کہ جو شخص ہوائی کشتی یا گاڑی کے ذریعہ ۲۴۔گھنٹہ میں لنڈن سے مانچسٹر پہنچے۔ اُسکو دس ہزار پونڈ انعام دیا جائیگا۔ یہ انعام حاصل کرنے کے لئے بہت سے لوگوں نے کوشش کی لیکن مسٹر رائیٹ نے اپنی ہوائی گاڑی میں بیٹھکر ایک ہزار فٹ بلندی سے فی گھنٹہ چالیس میل رفتار سے نہایت کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچکر انعام حاصل کر لیا۔

حاصل یہ کہ اس وقت کی ہوائی گاڑی یا دوسری مشینوں اور اگلے زمانہ کے بیلونوں میں ٹھیک وہی نسبت ثابت ہو رہی ہے جو قدیم زمانہ کے بادبانی جہازوں اور آجکل کے نو ایجاد اسٹیمروں میں ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اب "بیلون" کا استعمال متروک ہو رہا ہے اور ہوائی گاڑیاں یا کشتیاں روز بروز اس قدر رواج پاتی جارہی ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں اِن کے بنانے کے کارخانے بھی جاری ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ اگرچہ فی الحال عمدہ ہوائی گاڑی پر تقریباً تیس ہزار روپیہ لاگت آتی ہے۔ لیکن بہت جلد اس کی قیمت اس حد تک گھٹ سکے گی جو متوسط درجہ کے لوگ بھی اس میں

کے اصرار پر پھر دوبارہ پرواز کی اور کسی خلل کی وجہ سے اپنے آپ کو اس ایجاد پر قربان کر دیا۔
پروفیسر لینگلی نے ایک بڑا اسٹیم انجن لگا کر ہوا سے بہت بھاری گاڑی تیار کی
جس کے ہر پر کا پھیلاؤ ۱۴ فٹ تھا۔ رفتہ رفتہ اور لوگوں نے بھی کئی ایک گاڑیاں
بنائیں اور اُن کے ذریعہ شوقین لوگ چھوٹے چھوٹے سفر کرنے لگے۔ ہوائی مشینیں
مختلف شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ ظاہری شکل وہیئت پر نظر کرتے۔ بعض ہیئتِ
مجموعی تیتری اور بعض پرند وغیرہ اور مچھلی سے مشابہ ہوتی ہیں۔ بعض میں گاڑی کی طرح
پہیئے ہوتے ہیں اور بعض میں پرندوں کی طرح پر ہیں۔ بعض میں کشتی کی طرح سُکان
اور بادبان لگے ہُوئے ہیں۔ لیکن سب کی رُوح یا جان برقی قوت ہے۔ جس کے ذریعہ
اس کے مصنوعی پر یا دُوسرے کل پُرزے حرکت کرتے ہیں اور یہ مصنوعی پرندہ اپنے
سوار کو لے اُڑتا پھرتا ہے اور سوار کے اس قدر قابو میں ہے کہ پروں یا اوزاروں
کی حرکت کو کم و زیادہ کر کے جدھر چاہو اس کو موڑ سکتے اور نصف میل کی بلندی
سے ہر طرف چار میل کے اندر جہاں چاہو اُتر سکتے ہو۔

گدھ اور بعض شکاری پرندوں اور گرہ باز کبوتر سے قطع نظر جبکہ انہیں صرف منڈلانے
کے سوا راستہ قطع مسافت مقصود نہیں ہوتی دُوسرے پرندے اکثر اوقات چالیس
پچاس فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ لیکن پرندہ ذرا سا جانور ہے جس کو درختوں وغیرہ
سے ٹکرانے کا اندیشہ نہیں۔ اس کے برخلاف اس مصنوعی پرندے یا ہوائی گاڑی
کو اس قسم کا خطرہ ہر وقت لگا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی پرواز اکثر ہزار دو ہزار فٹ
بلندی سے ہوتی ہے اور بوقت ضرورت اس سے بھی زیادہ اُونچی اُڑ سکتی ہے اور
اس کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کی تیز پری کے مقابلہ میں کسی تیز پر پرندہ کو بھی شاید
مشکل سے کامیابی ہو۔ چنانچہ اُمید کی جاتی ہے کہ عمدہ ہوائی گاڑی دو سو میل فی گھنٹہ
جا سکیگی۔ غرض کہ اس سے سابق اُڑنے والی کل مشینوں میں اس وقت کی ہوائی مشینیں

جس طرح آبی کشتیوں اور بادبانی جہازوں کو ہاتھوں سے کھینے یا بادِ موافق کی امداد سے چلانے کے عوض سائنس کی مدد سے رفتہ رفتہ دخانی یا برقی طاقت سے کام لیکر دخانی جہازات اور موٹر بوٹ کی ایجاد کی بدولت ملاحوں کے دُونوں مدد مصول اور بادِ موافق کے بارِ احسان سے سبکدوشی حاصل کرلی گئی۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد ان ہوائی کشتیوں کے چلانے میں بھی برقی قوت سے کام لیا جانا تجویز ہوا اور اس طرح بادِ مخالف کے اندیشہ سے رہائی نصیب ہوگئی۔ "ہوا میں اُڑنے" کے مقصد میں جو اس وقت خاطرخواہ کامیابی حاصل ہوگئی ہے اُس کا سنگِ بنیاد یہی تجویز تھی جس میں اور قدیم "بیلونوں" میں علّتِ غائی کے اعتبار سے تو کوئی فرق نہیں لیکن قوائے آلیہ اور اصُولِ پرواز میں بہت فرق ہے۔ موجُودہ زمانہ کی کامیاب مشینیں بھی دو قسم کی ہیں۔ بعض تو "بیلون" کی طرح اپنی مساوی الحجم ہوا سے ہلکی ہیں۔ اور بعض بھاری۔ اوّل کی پرواز موازنہ سیالات کے ضوابط پر مبنی ہے اور دُوسروں کی اُڑان پرندوں کے اصُولِ پرواز اور قواعدِ حرکت پر۔ (دیکھو فقرہ ۷) چونکہ ہمارا مضمون بہت طویل ہوگیا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں اس کے متعلق صرف مختصر حالات اور ترقیات کا ذکر کرتے ہیں۔

جب اس ایجاد سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ تیز ہوا میں تاب لانے یا ہوا کے رُخ پر اُڑنے کے لئے پرواز کرنے والی چیز کا اس لطیف سیّال سے بھاری ہونا ضروری ہے تو ہوا سے بھاری کشتیاں یا گاڑیاں بنائی گئیں اور پرندوں کے اصُولِ پرواز اختیار کئے گئے۔ کیونکہ مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ کُل پرندے چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لیکر بڑے سے بڑے پرندے تک سب اپنی مساوی الحجم ہوا سے بھاری ہیں۔ سب سے پہلے لائی ہنتھل نے اس قسم کی ہوائی گاڑی ایجاد کرکے تیز ہوا کے رُخ پر سفر کیا۔ اس نے چند روز بعد لوگوں

اعانت بھی زیادہ تر اسی لحاظ سے ہوئی اور کامیابی کا سہرا بھی اسی صیغہ کے سر رہا۔
چنانچہ سب سے پہلے فوجی بیلون ہی ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئے۔ بعض آلات
واوزار ایزاد کرنے سے وہ اس قابل ہو گئے کہ معمولی ہوا میں اُن کے ذریعہ ہر طرف
گھوم سکتے اور جہاں چاہتے اُتر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ بڑا نقص باقی رہا کہ زور
کی ہوا میں یا ہوا کے رُخ پر نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے ماہرینِ فن کی توجہ بدستور
اس کی جانب مبذول رہی اور وہ حرکت کے اختیاری اور تیز بنانے گیس وغیرہ کے
کھڑاگ کو ترک کر دینے کی فکر میں برابر منہمک رہے اور مختلف تجاویز سوچی گئیں۔ مسٹر
ہارگریو اہل اسٹریلیا نے ایک ہوائی مشین پتنگ کے اصول پر بنائی اور ہوا سے
برقی قوت کا کام لیا۔ گو اس نے چھوٹی چھوٹی متعدد مشینیں تیار کیں۔ جو ہوا میں
اُڑتی رہتی تھیں۔ لیکن اُن کے چھوٹے پن کے باعث سواری کا خیال نہ کر سکا۔
بعض نے کشتی نما غبارے بنائے۔ جن میں ایک یا کئی بادبان اور ہوا کاٹنے کے
لئے چرخیاں اور پنکھے لگائے تھے۔ اوّل اوّل یہ ایک چھوٹی سی دستی مشین تھی جسکو سوار
ہاتھوں سے چلاتا اور جس رُخ پر چاہتا رکھ سکتا تھا۔ اس کو حرکت دینے سے چرخیاں
اور پنکھے جو پَون چکی کے پنکھوں سے مشابہ ہوتے تھے۔ ہوا کو کاٹتے جاتے
اور یہ ہوائی کشتی اُسی رُخ پر ٹھیک۔ اسی طرح بڑھتی جاتی جس طرح آبی کشتیاں دستی
بلّیوں یا چرخیوں کے ذریعہ سطح آب پر چلنے لگتی ہیں۔ پہلی تجویز کی بہ نسبت آخر الذکر
تجویز رفتہ رفتہ اس حد تک کامیاب ثابت ہوئی کہ مختصر پیمانہ اور محدود بلندی پر شوقین
لوگ سطح سمندر پر تفریحاً ہوا میں اُڑنے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے پہلے انگلستان کے
مشہور اخبار گریفک میں مختلف شکل وہیئت کی ان ہوائی کشتیوں کے فوٹو شائع
ہوئے تھے۔ جن میں ایک ایک دو دو آدمی بیٹھ کر سمندر پر پرندوں کے مانند جو سما
میں منڈلا رہے تھے۔

سنہ ۱۸۵۹ء میں مسٹر جان ویز امریکن تین چار آدمیوں سمیت سینٹ لوئی سے ہنڈرسن کو چلا اور تقریبًا فی منٹ ایک میل کے حساب سے ۱۹ گھنٹہ ۵۰ منٹ میں گیارہ پچاس میل طے کئے۔ تیز پروازی کے اعتبار سے یہ واقعہ بھی زیادہ قابل ذکر ہے کہ اسی سال لاموٹن اور جنرل لو نے چار گھنٹوں میں تین سو میل کے قریب مسافت طے کی۔ پروفیسر گرین انگریز جو فن "بیلون" کا بڑا عالم گذرا ہے اُس نے گویا اپنی زندگی ہی ہوا میں اڑنے کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ ۲۶ سال کے عرصہ میں تقریبًا ایک ہزار چار سو مرتبہ ہوا میں اُڑا ہے۔ تین مرتبہ سمندر پار اُترا۔ سمندر میں گرا اور بال بال بچ گیا۔ اس کا مشہور سفر سنہ ۱۸۳۶ء کا ہے۔ جس میں یہ ہالینڈ اور اپنے دو ہمراہیوں کے ساتھ ایک بڑے "بیلون" میں بیٹھکر اور کئی ہفتہ کا زادِ راہ ساتھ لیکر لندن سے ویلبرگ کو روانہ ہوا جو پانسو میل کی مسافت تھی جس کو اس نے اٹھارہ گھنٹوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کیا۔

اِس قدر بڑے بڑے دعاوے مارنے یا طُول طویل ہوائی سفروں کے باوجود پھر بھی اس وقت تک "بیلون" کے ذریعہ صرف سیدھا اُوپر چڑھنا یا اُترنا تو اختیاری تھا لیکن اس کی افقی حرکت تموج ہوا کے بالکل تابع تھی اِس لئے اگلے زمانہ کے بادبانی جہازات کی طرح اِن ہوائی جہازوں سے بھی صرف بادِ موافق کی صُورت میں کام نکل جاتا تھا۔ چنانچہ محاصرہ پیرس کے وقت جو تجربات ہوئے تھے اُن سے گلیچر ڈ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ "بیلون" سے مستقل ہوائی سواری کا کام ہرگز نہیں نکل سکتا۔ لیکن دُوسرے ماہرین فن اس کے مخالف رہے اور ہر زمانہ میں لگاتار یہی کوشش جاری رہی کہ نقائص دُور کئے جائیں اور کسی تدبیر سے ایک مکمل اور قابلِ اطمینان ہوائی سواری بنائی جائے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ اس مقصد کے لئے جس قدر کوشش کیگئی اُس کا اکثر حصہ جنگی اغراض پر مبنی تھا۔ سلطنتوں کی حمایت و

ہاتھ پیر شل ہونے لگے۔ حتیٰ کہ بیلون کے ڈھکنے کی رسّی کھینچنے کے ناقابل ہو گئے۔ گرمی آنے کی غرض سے ہاتھوں پر برانڈی ڈالی گئی۔ پھر بھی کچھ نہ ہوا آخر دانتوں سے رسّی کھینچی۔ اس نے پہلے سفر میں درجہ حرارت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کی تفصیلی کیفیت تحقیق کی۔ دوسرے سفر میں ہوائی گرم موجوں میں جا پہنچا اور طبقہ وار اُنکے درجات حرارت کی کمی و بیشی اس کی رفتار وغیرہ کل امور دریافت کئے۔

علم ہیئت کے متعلق بھی بہت سی مزید تحقیقات اور بعض خاص موقت امور مثلاً کسوف و خسوف وغیرہ کی دریافت میں "بیلون" سے بہت کام لئے گئے۔ حاصل یہ کہ "بیلون" کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جو بیشمار علمی تحقیقات ہوئیں اور بہت سے فوائد حاصل ہوئے اُن کی پوری پوری تفصیل کیجائے تو ایک دفتر ہو جائے۔

ہر زمانہ میں "بیلون" کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ماہرین فن کے حوصلے بھی بڑھتے گئے اور بڑے بڑے سفر کرنے کی جرأت ہونے لگی۔ چنانچہ ہم چند مشہور پرواز کنندہ اشخاص کے مشہور سفروں کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن کی اولوالعزمی اور ہوا میں اُڑنے کے مقصد میں بتدریج کامیابی حاصل کرنے کا پتہ چل سکتا ہے۔ فلا ماریون "جو بیلون" کی رفتار کے سکون و تکان کا محقق مانا گیا ہے اور جس نے اپنے کسی ہوائی سفر میں سب سے پہلے یہ تحقیق کی تھی کہ اگرچہ "بیلون" ہوائی تموج سے ہر لحظہ سیکڑوں نہیں ہزاروں فٹ اوپر چڑھتا اور نیچے اُترتا تھا۔ پھر بھی اس کی رفتار ایسی بے تکان تھی کہ پانی سے لبریز گلاس تک چھلکنے نہ پاتا تھا۔ اپنے ایک سفر میں ۲۰ میل کا دھاوا مارا تھا۔

۲۶۔ جولائی ۱۸۶۸ء کو ایک بڑی مسز گریہام رات کے وقت تن تنہا اپنے "بیلون" میں جس کا نام اُسی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سوار ہو کر بہت عرصہ تک ہوا میں اُڑتی رہی۔ لیکن صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس قدر بلندی پر پہنچی اور کتنی مسافت طے کی۔

بتدریج اُترتے اُترتے ۱۵ درجہ تک اُتر گیا۔ جس سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ تقریباً ہر تین سو فٹ بلندی پر ایک ایک درجہ حرارت کم ہوتی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے یہ دیکھا کہ اُوپر پہنچنے کے بعد زمین بھی مقعّر معلوم ہونے لگتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو مقعّر قبّوں (ایک آسمان اور دُوسری زمین) کے درمیان معلّق ہیں۔ اُس کو آسمان کا نیلا نیلا رنگ گہرا سیاہ نظر آنے لگا۔ دَم گھٹنے اور حلق خشک ہونے لگا۔ نبض بہت تیز چلنے لگی۔ شدتِ سردی سے اعضا شل ہونے شروع ہو گئے۔ زور سے چلّانے پر بھی بالکل موہوم اور خفیف آواز سُنائی دیتی تھی۔ یہی سب سے پہلے اِتنی اونچائی کی ہوا کسی قدر جمع کر لایا تھا جس کے بھی ٹھیک وُہی اجزاے اصلی ثابت ہُوئے جو زمین سے متّصل ہُوا کے ہیں۔

۱۸۰۶ء میں کارلو بروکی فلکی جو پہلا اٹالین پرواز کنندہ تھا بمقام نیپلز علاقہ اٹالی گا یلساک سے بھی زیادہ بلندی پر پہنچ گیا تھا لیکن بیلون کے پھٹ جانے سے زمین پر گر پڑا اور تعجب خیز بات یہ کہ بال بال بچ گیا۔ اس کے بعد سے ۱۸۵۰ء تک کسی شخص کے علمی اغراض کے لئے ہُوا میں اُڑنے کا پتہ نہیں چلتا۔

۱۸۵۰ء میں بکسیو نے بمقام پیرس اور ۱۸۵۲ء میں گرین نے بمقام لندن پھر بھی تحقیقاتِ علمی کی غرض سے پرواز کی اور پہلا اُنیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچکر کسی حادثہ کی وجہ سے اُتر آنے پر مجبور ہو گیا اور دُوسرے نے حسبِ مراد بلندی پر پہنچکر ٹھیک وُہی تجربات حاصل کئے جو گا ئلساک نے کئے تھے۔

۱۸۶۲ و ۱۸۶۳ء میں گلیشر جو اس سے پہلے تخمیناً چار سو مرتبہ ہوا میں اُڑا تھا تقریباً سات میل بلندی تک پہنچ گیا۔ ساڑھے پانچ میل بلند ہونے کے بعد سے اس کے

بیلون" نے جھٹ "بیلون" کو اونچا کر کے اپنے آپ کو دشمن کی زد سے بچا لیا
ان کل "بیلونوں" میں سے بعض تو فرانس کی حدود سے پار نکل گئے - ایک بیلون دشمن کی
فوج میں جا اُترا اور تین بالکل بے پتہ رہے - اس جنگ کے ختم پر عموماً کل دولِ یورپ نے
خصوصاً جرمنی نے بیلون کی اہمیت تسلیم کر کے اس کی جانب معقول توجہ دی اور "بیلون"
صیغۂ جنگ کا ایسا لازمی جزو ہو گیا کہ جس سلطنت میں "بیلون پارٹی" نہ ہو اس کا صیغہ
جنگ ناقص خیال کیا گیا - اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ "بیلون" اس قدر روز افزوں ترقی
کرتے اور مفید ثابت ہوتے گئے کہ بہت جلد انہیں "ہوائی غباروں" سے "ہوائی جہازوں"
کا لقب ملا اور یہ اُمید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی کہ جنگی جہازات کی طرح "یہ ہوائی جہاز"
بھی ملک کی حمایت اور غنیم پر آگ برسانے میں قابل قدر مدد دیں گے چنانچہ اس وقت
تک اس میں کس حد تک ترقی ہو گئی ہے - ہم اس کا ذکر بعد میں کرینگے -

"بیلون" سے سیر و تفریح اور ان جنگی فوائد کے علاوہ علمی تحقیقات میں بھی بہت
مدد ملی ہے - سنہ ۱۸۰۳ء سے قبل علمی تحقیقات کے لئے "بیلون" میں اُڑنے کا پتہ نہیں ملتا - سب سے
پہلے اسی سال ایک روسی علمی سوسائٹی کی تحریک پر رابرٹسن بعض علمی مسائل کی تحقیق
کے لئے اولاً بمقام ہمبرگ اور سنہ ۱۸۰۴ء میں دوبارہ سہ بارہ بمقام پیٹرسبرگ غبارہ میں
بیٹھ کر اُڑا - یہ بعض مرتبہ ۲۲ ہ ۲۳ فٹ بلندی تک پہنچ گیا تھا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب
نہیں ہوا -

اسی سال فرانس کی ایک علمی سوسائٹی کی تحریک پر بعض علمی مسائل خصوصاً بلند مقامات
کی جاذبیت وغیرہ امور کی تحقیق کے لئے گایلساک (Gaylussac) نے
بمقام پیرس دو تین بار "بیلون" کے ذریعہ بلند پروازی کی چنانچہ پہلی مرتبہ یہ تیرہ ہزار
فٹ اور دوبارہ تیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچا اور کئی تجربات حاصل کئے - "مقیاس الحرارت"
(تھرمامیٹر) جو اس وقت پیرس میں ۸۲ درجہ تھا - تیئیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچنے تک

کو بیکار چیز سمجھ کر اُس کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا مگر ۷۱-۱۸۷۰ء کی جنگِ فرانس و جرمنی کے موقع پر مارشل لیبوف سے پھر "بیلونی لشکر" تیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ اسی طرح اہلِ جرمنی نے بھی اپنی گورنمنٹ سے درخواست کی اور "بیلون پارٹی" مقرر کیگئی۔ لیکن غیر ماہر اشخاص کے زیرِ نگرانی اس کا انتظام ہونے سے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوا اور یہ صیغہ پھر نکال دیا گیا۔ جب "جرمنی" فوج نے پیرس کا محاصرہ کر لیا اُس وقت "بیلون" کی اہمیت اس طرح ثابت ہوئی کہ اس نازک موقع پر اہلِ فرانس نے اُن مقامات کی تلاش کے لئے جو ہنوز دشمن کے قبضہ میں نہیں گئے تھے "بیلون" سے کام لینا چاہا مگر کچھ عرصہ سے اس کا استعمال متروک ہو جانے سے اس مقصد کے مفید کوئی "بیلون" شہر بھر میں دستیاب نہیں ہوا تو فوراً خاص طور پر ریشمی کپڑے کے ستر "بیلون" سات سات ہزار مکعب فٹ وسیع تیار کر کے السی کا تیل اور سفیدہ پکا کر اُن پر پالش کر دی گئی اور باقی کل باتیں معمولی بیلونوں کی سی تھیں۔ سب سے پہلا "بیلون" ۲۳ جولائی کو ۲۷۲ خطوط و کاغذات اور چند پالتو کبوتر ساتھ لے کر چلا اور اوفر میں جا اُترا اور وہاں سے کبوتروں کے ذریعہ ضروری حالات سے پائے تخت کو اطلاع دی گئی۔ اسی طرح نامہ بر کبوتر ہر بیلون کا ضروری جزو ہے جن کے ذریعہ وقتاً فوقتاً "بیلون سوار" ضروری اطلاعیں بھیجتے رہتے تھے۔ غرض اس کے بعد اُس تاریخ سے آخر محاصرہ یعنی ۲۸ کانون ثانی ۱۸۷۱ء تک ۶۱ "بیلون" اُڑائے گئے جن میں سے ۵۴ صرف صیغہ ڈاک نے روانہ کئے تھے جن کے ذریعہ تخمیناً پچیس لاکھ خطوط دو سو اسّی من وزنی بھیجے گئے تھے۔

انہی "بیلونوں" میں سے ورسنگٹن نامی ایک بیلون جرمنی فوج کے پڑاؤ سے ڈھائی تین ہزار بلندی سے گزر رہا تھا تو غنیم نے اُس پر گولیاں چلائیں اور مسافرین

اس کا استعمال مفید سمجھا گیا اور دشمن کی نقل و حرکت اور دوسری کُل ایسی باتیں
جو نظر سے اوجھل ہوں۔ بیلون کے ذریعہ بلندی سے دیکھ لینے کا خیال پیدا ہوگیا
اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی اور بہت سے فوائد حاصل ہوئے چنانچہ
جنگ فلورس واقع ۱۷۹۴ء میں جنرل جارڈن کی فتح "بیلون" پارٹی ہی کی وجہ سے
ہوئی جو آسمان میں منڈلاتے ہوئے جرمنی فوج کا معائنہ کر لیتی اور اس کی نقل و
حرکت کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیتی رہتی تھی۔ اہلِ جرمن جو اس سے محض لاعلم
تھے نہایت متحیر تھے کہ ہماری حالت کا غنیم کو کس طرح پتہ لگ جاتا ہے اس کے
بعد سے موڈن علاقہ فرانس میں "بیلون" کی تعلیم کے لئے خاص طور پر ایک
مدرسہ قائم کر کے نوجیوں کو اس کی تعلیم ہونے لگی اور فرانس کی فوج میں کئی
بیلون تیار کئے گئے اور اکثر جنگ کے موقعوں پر اس سے بڑا کام نکلا چنانچہ
۱۸۵۹ء جنگ فرانس و اٹالی میں فرنچ فوج نے بیلون سے بہت فائدہ اُٹھایا
رفتہ رفتہ دوسری سلطنتوں میں بھی اس کا رواج ہوتا گیا چنانچہ ۱۸۶۱ء سے
۱۸۶۵ء تک کی مقامی جنگوں میں امریکہ کے صیغۂ جنگ نے لاموٹن اور لو
اور دوسرے ماہرینِ فن کے ماتحت ایک "بیلون" پارٹی مقرر کی تھی جس سے
بڑے بڑے فوائد حاصل ہوئے۔ سب سے پہلے جنرل لو نے ہی چھ سو فٹ
کی بلندی سے ایک برقی پیام بھیجا۔ جس کے بعد سے اکثر برقی پیامات ہی
کا رواج ہوتا گیا۔ ورنہ پہلے "بیلون سوار" چشم دید حالات و واقعات کاغذ پر
لکھ کر کسی وزنی شے سے وہ کاغذ باندھ کر نیچے پھینک دیا کرتا یا اُترنے کے
بعد وہ کُل کاغذات پیش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی بعض موقعوں پر یہی طریقہ
جاری ہے۔

کچھ عرصہ بعد چند وجوہات اور بعض حادثات کی وجہ سے فرانس میں بھی "بیلون"

زیادہ بلندی تک اُڑنے میں یہ تجویز کام نہیں دیتی تھی۔ اس لئے ایسی صورت میں اُترنے کے لئے "پیرا شوٹ" یعنی ایک قسم کی چھتری ایجاد کی گئی۔ جو ایک رسّی کے ذریعہ "بیلون" سے بندھی رہتی تھی جب اُترنا مقصود ہوتا وہ رسّی کاٹ دیجاتی اور "بیلون سوار" چھتری کو لیکر کود پڑتا۔ چھتری کھل جاتی اور اس میں ہوا بھر کر آہستہ آہستہ زمین پر اُتر آتا۔ چنانچہ اسکا استعمال ۱۷۹۷ء سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض صورتوں میں یہ تجویز بھی ناکافی ثابت ہوئی اور اس میں بڑی خرابی یہ تھی کہ بعض وقت "بیلون" سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا اس لئے اُترنے کے لئے ایک آلہ ایجاد کیا گیا یعنی بیلون میں اوپر کی جانب ایک ڈھکنا لگانا تجویز ہوا جو ڈوری کھینچنے پر کھلتا اور خود بخود بند ہو جاتا تھا۔ جب اُترنا مقصود ہوتا یہ ڈوری کھینچنے سے ڈھکنا کھل جاتا اور ہلکی گیس اس میں سے خارج ہو کر "بیلون" بھاری ہو جاتا اور طبعاً سر در نشیب ہونے لگتا۔ لیکن ڈھکنا کھولنے میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری درکار ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ زیادہ کھلا رہے اور گیس کی کثیر مقدار خارج ہو جائے تو "بیلون" اپنی مساوی الحجم ہوا سے زیادہ بھاری ہو جانے کی وجہ اوپر پھینکے ہوئے پتھر کی طرح اس زور سے زمین پر گرے کہ اُسکے دھماکے سے بیٹھنے والے کو سخت ضرر پہنچے۔

ہیڈروجن گیس چونکہ بڑی دقت سے فراہم ہوتی تھی اس لئے بنظر سہولت اس کے عوض "کول گیس" بھرنا تجویز ہوا اور سب سے پہلے پروفیسر گرین (انگریز) نے اس کی رائے دی۔

ہم "بیلون" کی ان مختصر اصطلاحات کا ذکر کرنے کے بعد پھر اُس کے تاریخی پہلو کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کے خیالات "بیلون" کی جانب زیادہ تر منعطف ہو گئے اور اُس سے مفید کام لینے کی دُھن ہو گئی تو جنگی اغراض کے لئے

کپڑا گیس کی قوتِ تمدّد کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے بیلون پر باریک رسّیوں کا جال تننا شروع کیا گیا۔ گیس کی کوئی حد معیّن نہیں تھی بہت سی اُلٹ پلٹ کے بعد اس کی مناسب مقدار "بیلون" کے اعتبار سے مقرر کی گئی۔ اسی طرح صابورہ[۵۱] کی بھی مقدار معیّن کی گئی۔ چنانچہ گلیچر ڈ جو فرانس میں مشہور پرواز کنندہ ہے اس کی یہ رائے ہے کہ اگر بیلون کی وسعت نو ہزار مکعب[۹۰۰۰] فٹ ہو تو اس میں صرف ایک ثلث یعنی تین ہزار مکعب فٹ گیس اور چھ سو[۶۰۰] پونڈ صابورہ بھرا جائے۔ اس طرح صرف "بیلون" کے پھٹنے کا بچاؤ ہو گیا اور اوپر چڑھتے جانے کی تجویز نکل آئی۔ لیکن "بیلون سوار" کا اُترنا اس کے مطلق اختیار میں نہ تھا اور "بیلون" شترِ بے مہار کی طرح یا تو سیدھے اُوپر چڑھتے جاتے یا ہوا کے تموّج سے اِدھر اُدھر منڈلاتے پھرتے اور کہیں کے کہیں نکل جاتے تھے اس لئے تھوڑی تھوڑی بلندی تک اُڑنے کی صورت میں اُترنے اور بیلون کو قابو میں رکھنے کے لئے اُس سے ایک لمبی رسّی باندھنا تجویز ہوا جس سے "بیلون" تموّجِ ہوا میں ڈگمگانے سے محفوظ رہتا تھا اور اُترنا چاہتے تو نیچے سے پتنگ کی طرح رسّی کو کھینچ لیتے تھے۔ اس کی ابتدا سنہ ۱۷۹۴ء کی جنگ فرانس و جرمنی سے پائی جاتی ہے جس میں فرنچ جرنل جارڈوں کی ماتحت "بیلون پارٹی" نے ہوائی تموّج سے "بیلون" کو روکنے کے لئے یہی تجویز اختیار کی تھی۔ چنانچہ فوجی غبارے جو جنگی اغراض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُن میں اب بھی بعض وقت یہی ہوتا ہے کہ ایک دراز رسّی[۵۲] کا ایک سرا "بیلون" سے اور دُوسرا سرا ایک آلہ سے باندھ دیتے ہیں جس سے رسّی حسبِ ضرورت بآسانی کھولی اور لپیٹی جا سکتی ہے۔

---

۵۱ وُہ ریت مٹی وغیرہ جو اس غرض سے بیلون میں رکھی جاتی ہے کہ ضرورت کے وقت اسکو پھینک پھینک کر بیلون کو ہلکا کر دیا جائے ۱۲ ۵۲ عموماً اس رسّی میں ٹیلیفون کا تار ہوتا ہے جس کے ذریعہ بیلون سوار اپنے چشم دید حالات کی اطلاع دیتا رہتا ہے ۱۲

ہوا میں اُڑنا

سلسلہ کے لئے دیکھو "مخزن" بابت اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء جلد ۲۰ نمبر ۱

سنہ ۱۷۸۵ء میں بلانشارڈ اور ڈاکٹر جان جفریس نے بوسٹن سے بیلون میں بیٹھ کر دوفر سے فرانس کی جانب گزرنے کی جُرأت کی اور یہ بمشکل ڈوبتے ڈوبتے بچے

اسی سال ایک انگریز لیڈی مسز سیج نے ۲۹ جُون کو بیلون میں اُڑ کر اپنی جُرأت کے جوہر دکھائے۔ یہی پہلی انگریز لیڈی تھی جس نے پرواز میں اپنے ابنائے وطن پر سبقت کی۔

اسی سال بیلون سے پہلا مُہلک حادثہ ظہور پذیر ہُوا۔ یعنی روزیار اور ایک نوجوان رُومان لانی نے ایک ہیڈروجنی بیلون کے ذریعہ فرانس سے انگلش چینل کو عبُور کر کے اِنگلستان پہنچنے کا قصد کیا۔ حسبِ ضرورت قوّتِ صعُود کے بڑھانے گھٹانے کے لئے ایک چھوٹا بیلون نیچے لٹکایا گیا تھا۔ جب "بیلون" بلند ہُوا تو اُوپر کی ہوا لطیف ہونے کی وجہ سے بیلون پر دباؤ کم ہوگیا اور ہیڈروجن کی قوّتِ تمدّد سے "بیلون" پھٹ گیا۔ یا جیسے بعض کا قول ہے کہ "بیلون" کسی بے احتیاطی سے جل گیا اور یہ دونوں ساحِل فرانس کے قریب تین ہزار فٹ کی بلندی سے چٹانوں پر گر کر پاش پاش ہوگئے

اس حادثہ سے لوگوں پر ایک سنسنی ضرور پھیل گئی۔ مگر اُنہوں نے ہوا میں اُڑنے کا خیال ترک نہیں کیا بلکہ اس کے بعد بھی سیکڑوں ہزاروں آدمی "بیلون" میں اُڑا کئے اور ہر زمانہ کے ماہرین اُن نقائص کی اصلاح کی جانب زیادہ تر توجہ دیتے رہے جن کی وجہ سے اس قسم کے حادثے ہُوا کرتے تھے چنانچہ "بیلون" کا

محمڈن یونیورسٹی کی تجویز کے متعلق بہت سے شکوک وقتاً فوقتاً پیش کئے گئے ہیں جن میں سے بیشتر کا جواب مندرجہ بالا تاریخی حالات میں موجود ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ مختص القوم یونیورسٹی بنانے کے نظائر نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکثر یونیورسٹیاں پہلے مختص القوم تھیں اور اب تک بعض میں باعتبار مقصد خصوصیت باقی ہے۔ گو دوسری قوم کے لوگوں کو ان میں داخل ہونیکی اجازت ہے اور یہ بات مجوزہ محمڈن یونیورسٹی میں بھی موجود ہوگی۔ ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ علیگڈھ میں تاحال فقط ایک کالج ہے۔ اسے یونیورسٹی کا رتبہ کیونکر حاصل ہوگا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسوقت انگلستان میں کئی یونیورسٹیاں ہیں جو فقط ایک ہی کالج رکھتی ہیں۔ اور کالجوں کا یونیورسٹی سے ملحق ہونا یونیورسٹی کی ہستی کے لئے کوئی لازمی صفت نہیں ہے بعض کا یہ خیال ہے کہ علیگڈھ کالج جب تک صرف آرٹس کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے یونیورسٹی کا لقب کیونکر دے سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بانیانِ یونیورسٹی عزم تو یہ رکھتے ہیں کہ علیگڈھ علوم و فنونِ مختلفہ کا مرکز بنجائے۔ مگر جب تک وہ اس منتہائے خیال کو نہ پہنچ سکیں۔ اس سے پہلے بھی کسی ایک یا دو صیغوں کی تکمیل ہی اسے یونیورسٹی بنا دینے کے لئے کافی ہوگی۔ اصل چیز جس کے مسلمان آرزومند ہیں اور جس کا ہر دوراندیش شخص کو آرزومند ہونا چاہیے۔ یہ ہے کہ اپنی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں ہو۔ شمس العلما مولینا شبلی نعمانی نے اس مطلب کو کس خوبی اور برجستگی سے اپنی نظم کے مطلع میں ادا کیا ہے۔ جو انہوں نے ۲۵ ماہ فروری کو لاہور کے اس عظیم الشان جلسہ میں پڑھی تھی جس میں علاوہ ریاست بہاولپور سے ایک گرانبہا عطیہ کی امید کے اہل پنجاب کیطرف سے اڑھائی لاکھ روپیہ کے وعدے یونیورسٹی فنڈ کے لئے ایک نشست میں ہو گئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں :-

ہمیں یک لفظ از یونیورسٹی مُدعا باشد ۔ کہ ایں سر رشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

عبدالقادر

اندرونی انتظام بالکل انکے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور اپنے اپنے طلبہ کی تعلیم کی نگرانی کالج ہی کرتے ہیں البتہ ہر مضمون کے لئے یونیورسٹی کیطرف سے اعلیٰ درجہ کے اُستاد مقرر ہیں جنکے لکچروں سے سب کالجوں کے طلبہ یکساں مستفید ہوسکتے ہیں۔ اور امتحانات اور سندات کا انتظام یونیورسٹی کے ہاتھوں میں ہے۔ مگر سکاٹلینڈ میں بعض یونیورسٹیاں مثل سینٹ اینڈریوز کے ایسی ہیں جن کے کالج ڈگریاں عطا کرنے کے لئے خود اپنے طلبہ کا امتحان لیتے ہیں۔ اور یونیورسٹی پڑھائی کا انتظام کرتی ہے۔

ممالک یورپ میں جرمنی وہ ملک ہے جس میں یونیورسٹیاں فرانس اٹلی اور انگلستان کے بعد قائم ہوئی ہیں اور وہ بہت سی باتوں میں فرانس کی یونیورسٹیوں سے اور بہت سی باتوں میں سکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں سے مشابہ ہیں۔ وہ پڑھانے والی جماعتیں ہیں اور اُن کے پروفیسر وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے فن میں مہارتِ خاص رکھتے ہیں اور مدتوں ایک فن کی تحصیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان بڑی بڑی قوم پروفیسروں کی تنخواہوں کے لئے مخصوص کی ہوئی ہیں جنکی آمد سے پروفیسر تنخواہیں پاتے ہیں اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو اُنکے لکچروں سے مستفید ہونیکے واسطے بہت کم فیس دینی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے فرائض کے متعلق جدید خیال یہ ہے کہ صرف طلبہ کو پڑھانا انکا کام نہیں ہے۔ بلکہ اس مضمون میں جس کے وہ پروفیسر ہیں کوئی نئی تحقیقات کرنا اور اسکی معلومات میں کچھ مفید اضافہ کرنا انکا خاص فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور اس خیال کی وجہ سے طلبہ کو سبق دینا اُن سے کم درجہ کے اساتذہ سے متعلق کیا جارہا ہے تاکہ انہیں زیادہ وقت علمی تحقیقات اور جدید معلومات کیلئے مل سکے۔

پُرانی یونیورسٹیوں کے سوا انگلستان میں بہت سی نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں۔ جن میں سے اکثر ایک ایک کالج والی ہیں۔ یعنی پہلے ایک کالج تھا جو ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ ان میں علومِ قدیمہ کی طرف کم توجہ ہے اور سائنس اور دیگر علومِ جدیدہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے یہ عام لوگوں کے لئے مفید تر ہیں۔ اب قدیم یونیورسٹیاں یا تو طبقۂ اُمرا کے لئے مخصوص ہوتی جاتی ہیں۔ یا اُن لوگوں کے لئے جو ملازمت کے بعض سیغوں کے لئے پُرانی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو کار آمد پاتے ہیں۔

کی۔ مقدم الذکر میں سب انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ علمی عہدہ دار جنہیں ریکٹر کہتے تھے۔ طالب علموں کے انتخاب سے مقرر ہوتے تھے۔ جنہیں اگر کبھی کسی جوابدہی کا موقعہ پڑے تو طالب علم ہی اُن سے جواب طلب کر سکتے تھے۔ یہ طلبہ عموماً پختہ عمر کے ہوتے تھے اور اپنا نفع نقصان سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ برعکس اس کے پیرس جہاں معلمین کے اتحاد کا نام یونیورسٹی تھا۔ طلبہ عموماً کم عمر ہوتے تھے اور انتظام اساتذہ کے ہاتھ ہوتا تھا اور طلبہ ہر طرح اساتذہ کی زیر نگرانی ہوتے تھے۔ یہ یونیورسٹی درحقیقت یورپ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں کا منبع ہے۔ نوٹرڈیم کے گرجا کے ساتھ ایک مدرسہ تھا جو اس یونیورسٹی کی ابتدا ہے۔ بعض کے نزدیک سنہ ۱۱۴۰ء میں اور بعض کے نزدیک سنہ ۱۱۷۰ء میں یہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس جماعت کو خاص خاص حقوق دیئے گئے تھے۔ گو سب ایک وقت میں نہیں ملے اور متواتر جدوجہد سے حاصل کئے گئے۔ ایک حق یہ تھا کہ جو لوگ یونیورسٹی کے زیر سایہ تھے وہ بعض ٹکسوں اور محصولوں اور دیوانی عدالتوں کے اختیار سماعت سے مستثنیٰ تھے اور جب کسی یونیورسٹی والے کے برخلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو وہ یہ حق رکھتا تھا کہ جس شہر میں یونیورسٹی ہے اس میں مقدمہ منتقل کرائے اور خود یونیورسٹی کے حکام اُس کے مقدمہ کو سنیں۔ اس کے علاوہ بعض اور چھوٹی چھوٹی رعائتیں اور حقوق یونیورسٹی سے متعلق تھے۔[1]

اکسفورڈ اور کیمبرج میں جو طریق کالجوں کا بعد میں مروج ہوا۔ وہ بھی پہلے پیرس ہی سے شروع ہوا۔ کئی مخیر آدمی کار ثواب سمجھکر چاہتے تھے کہ غریب طلبہ کے رہنے کے لئے کوئی جگہ بنا دیں۔ تاکہ انہیں دوران تعلیم میں رہنے کی جگہ ڈھونڈھنے اور کرایہ کی زیرباری اُٹھانے کی تکلیف نہ ہو۔ اس طرح متعدد مکانات بن گئے۔ جن میں سے ہر ایک میں ایک خاص تعداد طلبہ کی ایک مستند عالم کی نگرانی میں رہنے لگی۔ نگران عالم کو ماسٹر کہتے تھے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج میں یہی عمارتیں جدا جدا کالج قرار پائیں جن کا

[1] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا۔

یورپ میں یونیورسٹیوں کی ابتدا اور انکی ترقی کے حالات بجائے خود دلچسپ ہونے کے علاوہ ہمارے لئے بہت کچھ سبق آموز ہیں اور انکی ترقی کی دشوار گزار منزل میں راہبر کا کام دے سکتے ہیں۔ اس لئے کسی قدر اور بسط کے ساتھ اُن کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ یونیورسٹیاں جس حالت میں ہمیں اب نظر آ رہی ہیں۔ قائم ہونے کے وقت اُن کی یہ صورت نہیں تھی۔ بتدریج بڑھتے بڑھتے اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں۔ علما کا یہ طبعی میلان کہ علمی مشاغل میں ایک دوسرے کی مدد سے فائدہ اُٹھائیں اور مل کر علمی مشکلات کو حل کریں۔ اوّل اوّل ان جماعتوں کے قیام کا باعث ہوا۔ پہلے تو کلیسا ایسی جماعتوں کے وجود سے خوش نہ تھا۔ مگر پھر یہ سمجھکر کہ انہیں ہاتھ میں لینا انہیں مخالف بنانے سے زیادہ مفید ہے۔ کلیسا نے اُن کے وجود کو تسلیم کرنا شروع کیا اور ایسی جماعتیں پاپائے رُوما کے فرمانِ خاص یا بادشاہ کے حکم سے قائم ہونے لگیں۔ یا تسلیم کی گئیں۔ چنانچہ شاہ فریڈرک ثانی نے نیپلز یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ پوپ گریگوری نہم نے ٹولوس کی یونیورسٹی قائم کی۔ اور پوپ انوسنٹ چہارم نے خود روما میں یونیورسٹی بنائی۔ بولونا کی یونیورسٹی حقیقت میں چار یونیورسٹیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک لومبارڈ لوگوں کے لئے۔ دوسری ٹسکنی کے باشندوں کے لئے۔ تیسری شمالی کوہستان کی دوسری طرف کے ساکنوں کیواسطے اور چوتھی اہل رُوما کے لئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چاروں یونیورسٹیاں مختص القوم یونیورسٹیاں تھیں اور اُس وقت لفظ یونیورسٹی کا مفہوم ہر ایسی جماعت تھی جو باقاعدہ تعلیم کے مقصد سے قائم ہو۔ اُسی زمانہ میں پیرس کی یونیورسٹی میں یہی نمونہ قومی تقسیم کا موجود تھا۔ فرانسیسی زبان کے بولنے والے ایک جماعت تھے۔ نارمنڈی کے علاقہ کے لوگ دوسری جماعت۔ پکارڈین لوگ تیسری جماعت اور انگلش چوتھی۔ گو انگلش حصہ کا نام بعد میں جرمن رکھا گیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کی یونیورسٹیاں کچھ بولونا اور کچھ پیرس کے نمونہ پر بنی تھیں۔ بولونا اصل میں متعلّمین کی جماعت تھی۔ اور پیرس معلّمین

لفظ یونیورسٹی لغت کے اعتبار سے لاطینی زبان کے ایک لفظ یونیورسٹیاس سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں کل بمقابل جزو۔ اور جماعت۔ گروہ۔ کمپنی۔ یا ایسوسی ایشن۔ اسی اشتقاق کی وجہ سے لفظ کلیہ عربی زبان میں اسکا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ جماعت یا کمپنی کے معنوں میں لفظ یونیورسٹیاس اہل روما کے قوانین میں مستعمل تھا۔ اور اصطلاحی طور پر کسی ایسی جماعت کے لئے جو کسی خاص اور مسلسل مقصد کے لئے قائم ہو استعمال ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یورپ کی تاریخ کے قرون وسطی میں علمی درسگاہوں کے لئے کام آنے لگا جس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ معلموں کی کل جماعت یا متعلمین کی کل سوسائٹی۔ یا دونو۔ جسے مجموعی طور پر کچھ حقوق و اختیارات حاصل ہوں۔ اور جو اپنے انتظام کیلئے آپ قواعد مرتب کر سکے۔ گو رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے مفہوم میں یہ داخل ہو گیا کہ علوم کی تمام ضروری شاخیں یونیورسٹی میں پڑھائی جاویں اور آج کل سب بڑی بڑی یونیورسٹیاں سب بڑے بڑے علوم میں درس دیتی ہیں۔ لیکن بارھویں صدی عیسوی میں جب یہ لفظ پہلے پہل یورپ میں تعلیم گاہوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ تو یہ کوئی ضروری شرط نہیں تھی۔ پیرس کی یونیورسٹی فرانس میں اور کیمبرج اور اکسفورڈ کی یونیورسٹیاں انگلستان میں پہلے صرف ایک صیغے کی تعلیم گاہیں تھیں یعنی فقط آرٹس فیکلٹی رکھتی تھیں اور سلرنو اور مون پیے میں صرف طبیہ فیکلٹی تھی۔ بعض اصحاب کیمبرج اور اکسفورڈ کی موجودہ حالت سے استدلال کرتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کے وجود کیلئے ضروری ہے۔ کہ اس میں متعدد کالج ہوں جنکے مجموعہ کا نام یونیورسٹی رکھا جائے۔ مگر یہ ضروری نہیں۔ کالجوں کا تعدد یونیورسٹی کی لازمی صفت نہیں۔ جرمنی میں بہت سی یونیورسٹیاں ایسی ہیں جنکے ماتحت کوئی کالج نہیں۔ اور خود اکسفورڈ اور کیمبرج میں یونیورسٹیاں پہلے موجود تھیں اور کالج فیاض لوگوں کے ذاتی عطیوں سے بعد میں قائم ہوئے [1]

[1] یہ حالات امپیریل ڈکشنری میں درج ہیں اور وہاں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

ہیں دولتِ علم کسی قوم کو بغیر پانی کی طرح روپیہ بہائے حاصل نہیں ہوتی۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایک مرتبہ تحصیل علم کے لئے چاندی صرف کر کے ترقی یافتہ قومیں اپنی علوم کی بدولت دونوں ہاتھوں سے سونا سمیٹتی ہیں اور جو خرچ ہوتا ہے۔ اُس سے بدرجہا زیادہ نفع اٹھاتی ہیں لیکن پہلے دل کھول کر روپیہ لگاتی ہیں۔ اور ہم اگر چاہیں کہ ترقی میں ان کے برابر پہنچ جائیں تو ہمیں بھی فیاضی سے کام لینا ہوگا۔

گو ہمارے کان یونیورسٹی کے لفظ سے ایک عرصہ سے آشنا ہیں اور اب ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام بھی ایک ممکن العمل خیال نظر آرہا ہے۔ تاہم عجیب بات ہے کہ مسلمان جو ایک زمانہ میں قرطبہ اور بغداد کی یونیورسٹیوں کے بانی تھے اور جو مشعل علم لیکر یورپ میں پہنچے تھے۔ آج یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یونیورسٹی کیا چیز ہے۔ اور مسلمانوں پر کیا منحصر ہے۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ عام اس سے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ یونیورسٹی کے صحیح مفہوم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یونیورسٹیاں ہندوستان میں نئی چیز ہیں جو انگریزی عملداری میں وجود میں آئی ہیں اور دوسری یہ کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں ایسے نمونہ پر بنی ہیں کہ وہ مقصدِ اصلی جو بیشتر ممالک یورپ میں یونیورسٹی کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ اُن سے پورا نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کا کام امتحان لیکر سند دینا ہے اور تعلیم و تعلم کالجوں اور دیگر درسگاہوں کے سپرد ہے۔ جن پر پہلے یونیورسٹیوں کی کوئی نگرانی نہیں ہوتی تھی اور اب نئے ایکٹ یونیورسٹی ہائے ہند کے بعد کسی قدر نگرانی یونیورسٹیوں کی طرف سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن اُس سے یونیورسٹیوں کی اس صفت میں فرق نہیں آتا کہ اس ملک میں وہ فقط امتحان لینے والی جماعتیں ہیں۔ مگر یورپ کی یونیورسٹیوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یونیورسٹیاں پڑھنے والوں یا پڑھانے والوں کی جماعتیں تھیں اور اب تک بہت سی قدیم یونیورسٹیوں میں وہی شان باقی ہے۔

اُس مقلب القلوب نے جس کے ہاتھ میں تمام عالم کے دلوں کی باگ ہے - یہ بات سر آغاخاں بالقابہ کے دل میں بے سبب نہیں ڈالی - بلکہ کوئی اہم نتیجہ اس سے پیدا ہونے والا ہو - نہ صرف مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہو کہ ایک بزرگِ قوم جو شاہی نژاد ہونیکے علاوہ وجاہت اور دولت میں والیانِ مُلک کا ہم رتبہ ہو - اِس طرح گدایانِ قوم کی جماعت کی سرگروہی اختیار کرے - بلکہ حقیقت یہ ہو کہ تاریخِ عالم میں اِس قسم کی مثالیں کمیاب ہیں - پس ایسے سوال کا رد کرنا کسی بامروّت شخص کے اختیار میں نہیں -

اس لئے یہ تو ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ سر آغاخاں کا وفد انشاء اللہ ہر مقام پر وہاں کے باشندوں کی توفیق کے مطابق کامیاب ہوگا - اور جس رفتار سے اکابرِ قوم عطیئے دے رہے ہیں یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ بیس لاکھ روپیہ جو اس وقت سر آغاخاں نے جمع کرنا تجویز کیا ہو - جمع ہو جائیگا - بلکہ اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو غیر ممکن نہیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے - کہ یہ رقم بمقابلہ اُس مقصدِ اعظم کے جو مسلمانانِ ہند کے پیشِ نظر ہو - قلیل ہو - جن لوگوں نے ہز ہائی نس کا وہ اڈریس دیکھا ہے - جو صاحب ممدوح نے گذشتہ دہلی دربار کے موقع پر اجلاسِ کانفرنس منعقدہ دہلی میں بہ حیثیت صدرِ جلسہ پڑھا تھا - انہیں یاد ہوگا کہ اس وقت اُنہوں نے یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے ایک کروڑ روپیہ کا اندازہ لگایا تھا - اب صرف بیس لاکھ کا مطالبہ کرنے سے یہ مقصود ہو - کہ اتنی رقم موجود ہو جائے - جو اس امر کی ضمانت ہو کہ یونیورسٹی بننے کی اجازت اگر مل جائے تو آغازِ کار میں روپیہ نہ ہونے کی رکاوٹ پیدا نہ ہو - اور ہمیں یہ منصب حاصل ہو کر اپنی اس ہمت کی بنا پر کہ ہم نے تھوڑے سے عرصہ میں اس قدر رقم بہم پہنچا لی ہو - ہم سرخروئی کے ساتھ اپنے شہنشاہ قیصرِ ہند ہز مجسٹی جارج پنجم کے حضور میں یونیورسٹی کے چارٹر کی درخواست کر سکیں - ورنہ جو عظیم الشان کام شروع ہونے کو ہو - اُس کے لئے جتنا سرمایہ ہو کم ہو - یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور اُنکے خزانے اور سرمائے اس امر کے شاہد ہیں کہ ایسی ادارہ

مجوزہ محمدن یونیورسٹی

ذیل کا مضمون ایک لکچر سے اقتباس ہے جو لاہور کے ایک جلسہ میں ہز ہائی نس سر آغا خاں کے ڈیپوٹیشن کے پنجاب میں آنے کی تیاری کے زمانہ میں دیا گیا تھا لکچر کا بیشتر حصہ زبانی تھا جو بعد میں قلمبند نہیں ہو سکا - چونکہ یہ وُہ حصہ ہے جس میں یورپ میں یونیورسٹیوں کی ابتدائی حالت کا تاریخی ذکر ہے - اِس لئے اسے اوراقِ مخزن میں جگہ دی جاتی ہے :-

زبانِ خلق کو اگر بجا طور پر نقارۂ خدا کہا گیا ہے تو مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی ہندوستان میں قائم کرنے کا مبارک خواب جو علیگڈھ کالج کے نامور بانی اور مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچے خیر خواہ اور رہبر سر سید مرحوم نے آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر دیکھا تھا - یقیناً عملی صورت اختیار کرنے کو ہے - اسوقت ہر کہ و مہ کی زبان پر یہ الفاظ ہیں کہ اب یونیورسٹی قائم ہوئی سمجھو - اور اگر خدا کو منظور ہے تو یہ الفاظ عنقریب واقعات ہو جائینگے - اسباب و علل کا سلسلہ بھی اِس تجویز کی کامیابی کی طرف اشارہ کر رہا ہے - ہز ہائی نس سر آغا خاں جیسے مقتدر شخص کا اس جوش سے محمدن یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے اُٹھنا اور ہندوستان بھر کا دورہ کرنا اور ہر فرد قوم کے آگے قوم کے لئے دستِ سوال دراز کرنا کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے اور صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ

طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب رئیس اعظم دہلی

جو خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف ہند میں اس کار اہم کیلئے سبکی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں تو وہ انہی کی ذات سے ہیں اور انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک احساس فرض کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس مہتم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ **ہندستانی دواخانہ** انکے احساس فرض کا ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمر ہے گو اسکی ظاہری حیثیت ایک تجارتی حیثیت ہے لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔ طب یونانی کی بقا کا سامان ہے شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طرز شناخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور پر اطبا برتتے ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اعلیٰ نسخے جو صرف روسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل اصل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ و زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے

نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک جوہر بے بہا ہے اور ہر ایک ذی جسم اس کے وجود کا گذرگاہ۔ اس لئے تمام ارباب وطن کو ان اعلیٰ اور منتخب یونانی اور ویدک ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام سے بنتی ہیں فائدہ اٹھانیکا اور اسکے ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقعہ ملسکتا ہے۔ خوبی انتظام اور حسن معاملہ کے بہت تھوڑے عرصہ میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے +

خط کا ٹھیک پتہ منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی

قرآن مجید کا ایک نیا معجزہ

قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ تو قریباً ہر ایک مسلمان	(1/11)
کو معلوم ہے لیکن اس کا یہ نیا معجزہ صنعت تحریر ہے چنانچہ	(2/10)
حمائل شریف اعجاز صنعت جس کا یہ اشتہار ہے اس کے ۲۰۰ صفحات	(3/9)
ہیں اور ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں پس چھٹی یعنے درمیانی سطر سے	(4/8)
اوپر اور نیچے پانچ پانچ سطریں ہیں اور صنعت تحریر یہ ہے	(5/7)
کہ اس حمائل شریف کے تمام صفحات میں ہر ایک صفحہ کی درمیانی سطر سے	(6)
اوپر والی پانچوں سطروں کا نیچے والی پانچوں سطروں سے مقابلہ ہے یعنے	(7/5)
ہر صفحہ میں جن جن حروف سے اوپر والی سطریں شروع ہوتی ہیں انہیں	(8/4)
حروف سے نیچے والی سطریں شروع ہوتی ہیں اور درمیانی چھٹی سطر کا مقابلہ مقابل	(9/3)
کے صفحہ کی درمیانی چھٹی سطر سے ہے ۔ پس آپ سوچ سکتے ہیں کہ سارے	(10/2)
قرآن شریف میں ایسی صنعتی تحریر کا ہونا معجزہ قرآن نہیں تو اور کیا ہے؟	(1/11)

نوٹ اس صفحہ اشتہار میں بھی اسی صنعت تحریر کا نمونہ دکھایا گیا ہے چنانچہ ہر ایک سطر کے شروع میں ہر دو مقابلہ والی سطروں کا نمبر درج ہے۔

ملنے کا پتہ مولوی حکیم غلام محی الدین گھمٹی بازار لاہور

چھپکر تیّار ہے

خیالستان

یعنی

سید سجّاد حیدر صاحب بی۔ اے کے مصنّفہ قصّوں اور مضامین کا مجموعہ

یہ کتاب پونے چار سو صفحوں سے زیادہ حجم کی چھوٹی خوبصورت تقطیع پر نہایت خوش قلم چھپی ہے۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ سرورق کا کاغذ سفید ولایتی جس پر سُرخ و سبز رنگ کے بیل بوٹے ہیں۔ ایک مختصر سی تمہید جناب میر نیرنگ صاحب بی۔ اے نے لکھکر اس دلچسپ مجموعہ کے کتاب کی صورت میں پیش ہونے کی ضرورت ظاہر کی ہے۔

سید سجّاد حیدر صاحب کے اچھوتے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ محتاج بیان نہیں۔ صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات ایسی فرمائشیں آئی ہیں کہ مخزن کا ایک پرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فا[illegible]ں مضمون تھا۔ تلاش کر کے ایک روپیہ کا وی۔ پی کر دیجئے۔ اب انکے وہ سب مض[illegible] جو مخزن میں نکلے ہیں اور دیگر مضامین جو اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یکجا نہایت اہتمام اور خوبصورتی سے چھپے ہوئے ہدیہ ناظرین ہیں۔ **قیمت** علاوہ محصولڈاک **دو روپے** (۲) شائقین جلد منگوائیں۔

منیجر رسالہ مخزن میکلگن روڈ لاہور

پانچ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلاشراکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بنگیا ہے ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۳ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اسکی اسقدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور شرطیہ نجات سے محروم رہا ہے۔ سنیئے روح کیا چیز ہے؟ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہزور بنجاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر پی۔ این صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ظلہٗ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے نظیر بتایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک دیکر ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کرکے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی لاگ سے چاق اور چوبند کرکے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تلواریں بھی ماریں تو بھی چیٹ ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لکچروں معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور موجودہ ہنیا زمانہ مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اسوقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت عمل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کرکے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم بیٹھے ہوں روح حیات تریاق کامل تیر بہدف دوا ہے بلکہ اعصاب کی ایک طاقت افزا غذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ہی دن وہ لذت ابدی حاصل ہوتی ہے۔ استعمال سے آپ خود اسکی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائینگے جو ہم بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (عہ)

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیا گر پروپرائٹر شفاخانہ عام لاہور سے طلب کرو

عرق ماء اللحم انگریزی دو آتشہ

جس میں انگور سیب۔ بہی اور تیتر بٹیر مرغ اور ایک سو جڑی بوٹیاں اور مشک و زعفران
ملا کر دو آتشہ کشید کیا جاتا ہے۔ نصف صدی سے ہر سال تیار ہوتا ہے اور لاکھوں بوتلیں ملک
بھر میں فروخت ہو چکی ہیں۔ کیا دو امین خالص ڈاکٹر کوئی طبیب یہ دیسی بوتل میں فروخت کر سکتا ہے ہرگز نہیں

عرق ماء اللحم کا پہلا اثر پھیپھڑہ پر ہوتا ہے کہ اسکی نازک ساخت کو مضبوط کر کے گلنے سڑنے سے بچاتا ہے۔ بلغم پیدا ہونی بند ہو جاتی ہے۔ ضیق النفس (دمہ) کو تا دمی۔ کھانسی تر جلد دور ہو جاتی ہے۔ اور جن بچوں میں سل دق کی استعداد موجود ہو کوئی ان کے خاندان میں تپ دق۔ سل۔ بخار۔ کھانسی سے مرا ہو تو لطور حفظ ما تقدم اسکے پینے سے روک سکتا ہے۔ جن طالب علموں کی چھاتی تنگ اور اس پر چربی کم ہو۔ ذہین۔ ہوشیار ہوں انکو ضرور یہ عرق پینا چاہیئے۔ تاکہ وہ کثرت محنت سر لاغری کی وجہ سے بے دق موت کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

دوسرا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ تمام نروس سسٹم کا ضعف اور کمزوری جس سے حافظہ بگڑ جاتا ہے۔ سر میں درد رہتا ہے۔ سر گھومتا ہے۔ سر میں بوجھ رہتا ہے۔ آنکھیں کمزور۔ تکان۔ پٹھوں میں اکڑاؤ اور بے چینی دور ہو جاتی ہے۔ تریاق مضرات شراب ہے۔

تیسرا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی رگ کو باقاعدہ کرنے سے دل کی دھڑکن تپش دل غشی اور سانس پھولنا بند ہو جاتا ہے۔

چوتھا اثر جگر پر یہ ہوتا ہے کہ اخلاط ردیہ و مادہ سوداویہ کی پیدائش غیر معمولی کو روک دیتا ہے اور اس کے افعال باقاعدہ بناتا ہے۔

پانچواں اثر معدہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ دور ہونے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ ہاضمہ کی طاقت بڑھ جاتی ہے جو کھاؤ ہضم۔

چھٹا اثر مثانہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف مثانہ کی باعث کثرت اور رقت جریان بند ہو جاتا ہے اور افعال مثانہ اصلی حالت پر آجاتے ہیں۔

ساتواں اثر اعضائے تناسل مردانہ و زنانہ پر یہ ہوتا ہے کہ قوائے ڈوبے ہوئے دوبارہ پیدا ہونے سے انسان کی خوشگوار زندگی گزرتی ہے۔ گھر کے لوگ خوش۔ کاروبار کے قابل محنت برداشت کر سکتا ہے۔ اعضائے رئیسہ...

آٹھواں اثر خون پر یہ ہوتا ہے کہ گندگی کو خون سے اور اخلاط ردیہ و زہریلے اجزاء کو تحلیل کر کے خون صالح بکثرت پیدا کرتا ہے جس سے لاغر فربہ اور بلغمی مزاج سے بلغم کو تبدیل خون میں کر کے جسم میں تازہ جان پھونک دیتا ہے۔ جس سے چہرے کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔

الغرض عرق ماء اللحم بیمار کو بیکار اور خفتہ کو بیدار۔ غافل کو ہوشیار اور ہوشیار کو بار فتار بنا دیتا ہے۔

قیمت ایک بوتل دو روپے (عہ) چھ بوتل گیارہ روپے (لعہ) درجن بوتل (عنعہ)

نوٹ۔ (۱) بروبخات میں تین بوتل سے کم روانہ نہ ہوگا۔ (۲) نئے خریدار قیمت منگی مدینہ فی الفور روانہ فرماویں (۳) ریل کے ذریعہ منگانے پر محصول کم لگیگا۔ ریلوے اسٹیشن و لائن کا پتہ صاف لکھیں۔ کتاب **حل المشکلات** پتہ لکھنے والوں کو مفت دیجائیگی

حکیم ڈاکٹر حاجی غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور

مخزن الجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت۔ (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک (۸؍)

رسوم دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ۔ قیمت مع محصولڈاک ۱۲؍

منازل السائرہ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا اڈیشن (۸؍)

خوابِ ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن (۸؍)

ابومسلم خراسانی۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن الجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت (۸؍)

مکتوباتِ آزاد۔ اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ با تصویر۔ (۶؍)

کلامِ نیرنگ۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۶؍

انتخابِ مخزن۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ قیمت علاوہ محصولڈاک (عہ)

دردِ جانستاں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ۔ ۸؍

دربار نمبر۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ ۱؍

مثنویاتِ میرحسن۔ مثنوی بے نظیر و بدرِ منیر کے ساتھ مثنوی گلزارِ ارم ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کر کے شامل کر دی گئی ہے (عہ)

سیرِ تبت۔ انگریزی کتاب فرم ایرس ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ۔ تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ۔ ۱۰؍

مرقعِ خوشخطی۔ فنِ خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب [illegible] عرف رقم لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا جسکو دیکھکر خط کے نازک نکات باسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اس کے اہتمام میں مدِنظر رکھا ہے دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اسوقت ملک میں موجود نہیں اسپر منشی صاحب کی تصویر ہے ۵؍

درخواستیں بنام مینیجر مخزن۔ لاہور آنی چاہئیں۔

دیکھا جو ہم نے تم کو تو آنکھیں نکال لیں
آئنہ گھورتا ہے اسے بھی سزا ملے

اس کا نشان پوچھ رہے ہو تم ای کمال
جسکا خیال میں نہ کہیں نقش پا ملے

(از جناب احمد علی صاحب شوق - قدوائی لکھنوی)

وہ خوش کہ ہی جگر کو نظر میں لئے ہوئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے

آتا ہوا عدم سے تو بزم وجود میں
آئے ہیں وہ عدم کو کمر میں لئے ہوئے

زلفوں سے دل کو پھینک بھی دو ورنہ عمر بھر
بیٹھے رہو گے درد کو سر میں لئے ہوئے

کہتے ہیں وہ حیا سے پسینے میں ڈوب کر
ہر کوئی مجھ کو دیدہ تر میں لئے ہوئے

وسعت ہمارے عشق جنوں زا کی دیکھنا
دنیا کے حسن کو ہے یہ سر میں لئے ہوئے

جو تم نے دی نسیم کو - اور وہ ہے کوچہ گرد
ہم کو ملی تھی راہگذر میں لئے ہوئے

کیا شوق اسی پہ چرخ تنک ظرف کو ہر کبر
ایک اشرفی ہے جیب سحر میں لئے ہوئے

(از جناب عیش بھوپالی)

میری حسرت اور خالی جائے گی
ہوش کی لو یہ نہ ٹالی جائے گی

روکنے والے ہزاروں ہوں تو کیا!
جان ہے گر جانے والی جائے گی

ایسی کیلئے جائیگی اس دل کے ساتھ
[illegible]ی تصویر خیالی جائے گی

مر کے بھی جانے سے چھٹتی ہے کہاں
جان پھر قالب میں ڈالی جائے گی

اللہ اللہ قدر میرے دل کی یہ
پھر اسی پر خاک ڈالی جائے گی

آئینہ دیکھا تو میرا ہرج کیا
تیری شان بے مثالی جائے گی

دن بہت گذرے زمانہ ہو گیا
یہ میری آشفتہ حالی جائے گی

رُو ٹھ جانے دو طبیعت کو مری
ہرج کیا ہے پھر منالی جائے گی

تازہ غزلیں

(از حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف الصدق حضرت جلال لکھنوی)

اس طرح دل دکھائیے جس میں مزا ملے	وہ درد ہو کہ جس کی نہ ہرگز دوا ملے
تاکا ہے دل کسی کا جو یہ پوچھتے ہیں وہ	چوری کرے کوئی تو اُسے کیا سزا ملے
ہے میرے دل کو اُن سے تمنا وصال کی	جنکو خیال میں بھی جو دیکھو جدا ملے
اُٹھ اُٹھ کے بیٹھتا ہے کسی کا غبار کیوں	ہے منتظر کہ دامنِ بادِ صبا ملے
تھا رُخ دل و جگر کی طرف سے پھرا ہوا	اُس کج ادا کے تیر بھی تو کج ادا ملے
بیخوف ہو کے پھر تو خطا پر خطا کریں	بڑھ جائیں حوصلے جو سزا پر سزا ملے
اُن کو جفائیں کرکے مٹانے سے کام ہے	حسرت ملے امید ملے مدعا ملے
شکوہ کسی سے دل کے نہ ملنے کا کیا کریں	دو حرف لفظِ دل میں ہیں وہ بھی جدا ملے
تسکین بھی ہوا تو تڑپ بھی علاج ہے	ہم سب میں خوش ہیں درد ملے یا دوا ملے
بنتا ہے یہ جو دیر کا نقشا کسی کا دل	کعبہ اگر بنے تو اُسی میں خدا ملے
ہو لطف کی نگاہ بھی اہلِ گناہ پر	ملتی ہوئی کرم سے تمہاری سزا ملے
دل چھین لیں ادا سے اشارے نگاہ کے	تب لطف ہے کہ شوخ کسی کی حیا ملے
دل بھی گئے ہیں ضبط زباں بھی چھپائے ہے	مشکل ہے مدعی کو مرا مدعا ملے
بولا سما کے دل میں یہ تیرِ نگاہِ ناز	لے دیکھ ہم ہجومِ تمنا سے آ ملے
دل جا رہا ہے کوچۂ دلدار کی طرف	آنکھیں خیال کرتی ہیں وہ نقشِ پا ملے
یہ آرزو ہے سینے سے مجھ کو لگائیے	یہ چاہتا ہوں دردِ جگر کی دوا ملے
بیتاب سا دل جو ہو تو سنبھلتا ہے کس طرح	ہم پوچھ لیں کہیں جو کوئی مبتلا ملے

چھپائے ہیں

بستر راحت پہ فرماتے ہیں جو جلوہ گری
کاہلی کی اُن سے رہتی ہے سدا ہمبستری

اُن سے کب ہوتا ہے کوئی کام اچھا خلق میں
اُنکی بیکاری نہیں کرتی ہے رسوا خلق میں

روز ہو جاتے ہیں دنیا میں ہزاروں واقعات
اُنکو ملتی ہی نہیں ہے خواب غفلت سے نجات

خوب یاد آیا مجھے اِک عالمِ پُرفن کا قول
قابلِ تحسین ہے کہ اب جانسن کا قول

فی الحقیقت جسکو کہنا چاہئیے کچھ کاہلی
واقفِ ناقابلیت ہی کی ہے خو جاہلی

یعنی ہیں ناقابلیت سے تو واقف سربسر
بس کمی کو وہ نہیں تسلیم کرتے خود مگر

جو ہے ٹیلر کا سخن اس بات میں یہ زور ہے
آدمی اس کاہلی سے زندہ زیر گور ہے

مثل مُردے کی ہے جسکو کاہلی کا ہے مرض
کچھ امید اس سے خدا کو نے خدائی کو غرض

بے خبر رہتا ہے وہ دنیا کی محسوسات سے
بے تعلق اختلافات و ضروریات سے

زندگی کے دن یوں پورے اسلیے جیتا ہے
مثل حیوانات اب زندگی بیتا ہے وہ

میوہ ہائے باغ دنیا رات دن خوراک ہے
زندگی جس طرح سے کیڑوں کی زیر خاک ہے

عرصہ مرگ آ کے ہستی سے بھی ہوتا نابود وہ
لیکن اس عرصہ میں کچھ کرتے نہیں مردود وہ

ہل چلاتے ہیں نہ کرتے بار برداری ہیں وہ
اِک مریض لاعلاج درد ناچاری ہیں وہ

کرتے ہیں جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں سب بے فائدہ
موجبِ نقصان رسانی ہے سبب بے فائدہ

وقت اور طاقت کو کر دیتی ہے ضائع کاہلی
خلق میں ہے سب سے بڑھکر صرف بیجا کاہلی

(ماخوذ از انگریزی) سید امیر حیدر بخت

دوزخی سمجھا ہوں راشی مرتشی دونوں کو میں | آپ اپنا کیسہ دینار رہنے دیجئے

نبضیں ذو الفطرہ ہوئیں مانا مریضِ قوم کی | آپ یونہیں اس کی اب رفتار رہنے دیجئے

پردۂ امیدِ صحت میں ہے ذاتی انتفاع | ہیں یہ ساری کوششیں بیکار رہنے دیجئے

دیجئے غیروں کو چندہ حیف مذہب کے لئے | آپ اپنا بذل و ایثار رہنے دیجئے

ہو خیال اس کا کہیں پیدا تنکر رنجی نہ ہو | آپ یہ شیرینیٔ گفتار رہنے دیجئے

مجھ سے تقلیدِ آپ کے آئین کی ممکن نہیں | مجھ کو آپ آزاد و خود مختار رہنے دیجئے

اتحادی قوتِ ملکی کے پیرو ہوں جناب | اپنے ملت کا مجھے غمخوار رہنے دیجئے

صدرِ اعظم مجلسِ مشروطہ کے ہو جائیں آپ | مجھ کو حضرت محوِ استغفار رہنے دیجئے

شکلِ اقلیدس نہیں ہے یہ جسے سمجھے ہیں آپ | یونہیں قسمت کا خطِ پرکار رہنے دیجئے

بڑھ گیا پارہ کہیں اصلی حرارت سے جناب
شعلہ باریٔ مزاجِ حار رہنے دیجئے

کاہلی

کاہلی سے اچھے اچھوں کی خراب اوقات ہے | مشکلوں کا زندگی بھر سامنا دن رات ہے

سچ ہے سستی سے جہاں میں آدمی بیکار ہے | سارے آزاروں سے بدتر ایک یہ آزار ہے

جاں کو بھی ایماں کو بھی بس موجبِ نقصاں ہے یہ | شک نہیں کچھ باعثِ بربادیٔ انساں ہے یہ

کاہلی ہے باعثِ افزائشِ آلام و غم | شادمانی و خوشی ہوتی ہیں اس عادت سے کم

بھاری ہو جاتی ہے آخر کاہلوں کی زندگی | روز جب تعطیل ہو تو کیا خوشی تعطیل کی

ہاں مزا تعطیل کا ملتا ہے کچھ محنت کے بعد | لطفِ راحت آدمی پاتا ہے کچھ محنت کے بعد

آجکل تشریح ہوتی ہے نئے اجسام کی
ہر بنِ مو کو نہ آتش بار رہنے دیجئے

اب زمانہ ایسی باتوں کا اثر لیتا نہیں
شکوہ ہائے گنبدِ دوّار رہنے دیجئے

بن پڑے حضرت تو خادم قوم کے بن جائیے
اب گل و بلبل کے یہ اشعار رہنے دیجئے

جائیے کالج میں پڑھئے بھی علومِ مغربی
اب یہ حمد اللہ اے سرکار رہنے دیجئے

کچھ نہ کچھ تو دیکھئے یورپ کی تحقیقات سے
منطقِ پارینہ کے اسفار رہنے دیجئے

واں ابھی تک ہو چکا ترسیمِ عناصر کا ظہور
آپ آب و خاک و باد و نار رہنے دیجئے

سُنکے یہ شیخِ طریقت ہو گئے مُلّا جلال
بولے اپنی شوخیٔ گفتار رہنے دیجئے

مجھ کو کافی ہیں حدیثیں شارعِ اسلام کی
لندن و پیرس کے آپ اخبار رہنے دیجئے

دل ہے میرا چاشنی گیر مزاج المومنین
آپ اپنی شوخیٔ گفتار رہنے دیجئے

آپ سے میں لوں سند ہرگز نہیں ہے احتیاج
یہ اجارہ میرا اے سرکار رہنے دیجئے

قلزمِ فطرت کے اُس پار آپ کر سکتے ہیں سیر
ہوں میں تر دامن مجھے اِس پار رہنے دیجئے

میں نے مانا آپ پکّے مادّی ہیں اے جناب
اشتہارِ واجب الاظہار رہنے دیجئے

قول لیکن آپ ہی جانیں مجھے تو اے جناب
پیروِ قولِ شہِ ابرار رہنے دیجئے

حفظ کب تک ہو سکے ملفوظاتِ اسپنسر کے اب
کچھ تو یادِ احمدِ مختار رہنے دیجئے

میں نے مانا تار برقی میں ہے الہامی اثر
خیر اب اس قسم کے اذکار رہنے دیجئے

ہیں خلافِ پردۂ نسواں اگر ہوں بھی تو کیا
شوق سے انکو سرِ بازار رہنے دیجئے

جھوٹا قرآں کل عدالت میں اٹھا بے تھا کون
[illegible] اپنی اب اظہار رہنے دیجئے

دیکھیگا آپ انہیں فسر خزانے جب وہ آئیں
شاعرِ مفلس ہوں میں یہ یار رہنے دیجئے

دوربینیں کام دینگی اور نہ آلاتِ رصد
اس ستارہ کو یونہیں مدار رہنے دیجئے

بندہ پرور بھیجئے خط لکھ کے اردو میں مجھے
کس سے پڑھواتا پھروں انگار رہنے دیجئے

دیکھئے جاکر کلیسا میں بتانِ مغربی
مجھ کو اس مسجد ہی کا غمخوار رہنے دیجئے

اشہری تا بجا یاد کرو گے ان کو
آہ وشیون سے تمہیں ضبطِ فغاں ہو بہتر

قطعۂ عزیز

میرے ایک دوست نے یہ طرح مجھ کو بھیجی اور قطعہ کی فرمائش کی تھی اسکی
ایک نقل ہدیۂ مخزن کرتا ہوں :— (عزیز لکھنوی)

حسرتِ مُردہ کا ماتم دار رہنے دیجئے — میرے سینہ میں دلِ غمخوار رہنے دیجئے
جنبشِ ابرو ہے کافی نیم بسمل کیلئے — دیکھئے میری طرف تلوار رہنے دیجئے
آپ کیوں دامن سے پوچھیں خون کے آنسو مرے — ان ستاروں کو یونہیں سیار رہنے دیجئے
باز آیا مہربانی سے میں باز آیا حضور — آپ مجھ کو جان سے بیزار رہنے دیجئے
دل اگر یاد آئیگا حسرت سے کر لونگا — کچھ تو ان پہ خوں بھرا تلوا رہنے دیجئے
روح تازہ ہے یہ ہر اک آبلہ کے واسطے — پائے زخمی ہیں مرے کچھ خار رہنے دیجئے
کیا نگاہِ ناز سے پھر ہوگا جراحی عمل — میرے دل کا زخم دندان دار رہنے دیجئے
پارہ پارہ جسمِ مُردہ کس لئے کرتے ہیں آپ — زہرِ غم کے کچھ ذرا آثار رہنے دیجئے
دل کے ذرے مجتمع ہو کر بنے کیوں تن طور — بس بس اے موسیٰ یہیں اسرار رہنے دیجئے
اور ہی گرمی ہے اب مشقِ مزاجِ حسن میں — وہ پرانا عشق اور وہ پیار رہنے دیجئے
عشق کا طرزِ تمدن دور نے بدلا ہے اب — قصۂ [illegible] غیر رہنے دیجئے
قیس کے افسانہ اور مجنوں کے افسانہ کو بھی — اب یہ اگلے وقت کے اذکار رہنے دیجئے
اب نمائش حسن کی ہر سال ہوتی ہے حضور — نازکیت از پئے [illegible] اصرار رہنے دیجئے
اس صدی کے مرنے والے جی نہیں سکتے کبھی — وہ قیامت خیز اب رفتار رہنے دیجئے

برق
حسن میز

آ گئی اُن کی قضا رہ گئی مسجد باقی
پڑھ سکیں اُن میں نہ وہ ہائے نماز آخر

شوقِ تعمیر میں تھیں شاہجہانِ ثانی
جود و اکرام میں تھیں کہتی نہ اپنا ہمسر

ہائے اس طرح اکیلا تو نہ دیکھا تھا کبھی
پاس حاجب ہے نہ دربان ہے نہ کوئی نوکر

آہ یوں بنتِ سکندر ہو زمیں میں پنہاں
یوں چھپے خاک میں سلطانِ جہاں کی دختر

بادشاہوں کی صفت رکھتی تھی ان کی فطرت
تاجداروں کے خیالات تھے اُن کے یکسر

عالی والیہ بھوپال

ہو گئے فرطِ نحل سے تھے دوشالے کمبل
ہو گئے سیلہ و مندیل تھے ململ سے بتر

یا خدا کی ترے بندوں پہ بڑی اس نے بخشش
بخش دے تو بھی اُسے جنتِ علیا یکسر

یا خدا واسطہ آدم و حوا تجھ کو
یا الٰہی تجھے سوگند شفیعِ محشر

یا الٰہی تجھے معصومیِ زہرا کی قسم
یا الٰہی تجھے از بہر جنابِ حیدر

اُس کو سادات کی تعظیم جو منظور ہوئی
تو بھی تعظیم سے رکھ اُس کو قریبِ کوثر

اُس نے دلداریِ اطفالِ یتیماں کی ہے
اُن کے اشکوں سے تو دھو ڈال گنہ کا دفتر

آیا پھر نوحہ کناں باغِ حیات افزا میں
جس میں تھے حسرت و ارمان کھڑے پیٹتے سر

قمریاں سوگ میں بیٹھی تھیں جھکائے گردن
بلبلیں نوچ رہی تھیں نیستاں میں پر

پھول کملائے ہوئے شاخوں پہ غنچے لٹکے
بیلیں مرجھائی ہوئی پھولوں کی تھیں خاک بسر

پتے ملتے کفِ افسوس نظر آتے تھے
نخلِ ماتم تھا بنا باغ میں ہر ایک شجر

اس میں مدفون ہیں نوابِ نظیر الدولہ
تھے جو بھوپال میں سلطانِ جہاں کے شوہر

دفن ہیں آصف و بلقیس یہیں زیرِ زمیں
جیسے ہوں بدلی میں چھپیں ساتھ قمر کے اختر

تھے جو
بدلی میں چھپیں

کتنی ہی ہونہار تھیں یہی دونو بہنیں
آنے پائے نہ تھے گلزارِ تمنا میں ثمر

ایک تھی حافظۂ مصحفِ قرآنِ کریم
لڑکیاں ایسی کہاں ہند میں آتی ہیں نظر

بیلیں شادی کی منڈھے نہ چڑھنے پائیں
پھولنے پائے نہ تھے ہائے جوانی کے شجر

آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھو
اور دیکھو یہ ہے دنیائے دنی کا منظر

کیسی آنکھیں تھیں کہ شرمندہ ہو نرگس اُن سے — کیسے رُخسار تھے جن سے ہو پشیماں گُلِ تر
کوٹ کی دھج میری آنکھوں میں ہے اب تک پھرتی — تاج کس درجہ تھا مرحوم کے کھلتا سر پر
بارہ سیر انکی بتاتے ہیں غذا تھی پہلے — شوقِ ورزش کا تھا کرتے تھے بہت ڈنڈ مگدر
لیک بیمار ہوئے جب تو ہوئی یہ حالت — گھل گیا جسم ہوئے سوکھ کے بالکل لاغر
پانچ ماشہ انہیں بتلایا تھا ساگو دانہ — اس کے کھانے میں بھی ہوتا تھا تکلّف اکثر
احسن اللہ کو دلی سے بلایا لیکن — ایک یاقوتی کو معجون نے بخشا نہ اثر
حکیم احسن اللہ خاں
تھک گیا تھا میں بہت اس لئے واپس آیا — دُوسرے روز گیا صُبح کو سُوئے دیگر
شہر بھوپال سے باہر جو گیا تو دیکھا — اک حظیرہ ہے بنی قبر ہے اُس کے اندر
امتیاز اس سے نمایاں ہے پتا دیتی ہے — اس میں اِک حاتمِ ثانی ہے وزیرِ کشور
منشی امتیاز علیخاں
میری تاریخ کا اس پر کتبہ کندہ ہے — جو کہ ہے آیۂ قرآنِ خدائے اکبر
قبر صدیق حسن خاں کی اسی سمت ملی — جو تھے علّامۂ بھوپال میانِ کشور
عقدِ ثانی تھا کیا شاہ جہاں نے ان سے — اور اب ان کا شرف کیا کہوں اس سے بڑھکر
ہائے دُنیا بھی عجب محفلِ عبرت دیکھی — شمع کے پھول سرہانے تھے نہ پروانے کے پر
عاقبت دیکھی تو ہموار ہے راہِ سُنّت — آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
پھر ملی جانبِ چپ راہ میں چلتے چلتے — قُدسیہ بیگم بھوپال کی قبرِ انور
کرتے حفّاظ تھے قرآں کی تلاوت پیہم — ہوتے نازل طبقِ نور فرشتے لیکر
یاں سے چلکر میں گیا باغ نشاط افزا میں — جسمیں طوبیٰ سے نظر آئیں سرافراز شجر
دیکھی اس باغ میں اِک قبر مصفّا میں نے — مدفنِ شاہ جہاں بیگم والا گوہر
دیکھنا ہو جسے ہمّت کا نمونہ اُن کی — دیکھے بھوپال میں وُہ تاج محل کو جاکر
ایک مسجد وُہ بنا کی تھی کہ ثانی اُس کا — دیکھنے میں نظر آتا نہ میانِ کشور
فرش تھا شیشہ کا اٹلی سے منگا کر رکھا — اور بلّور کا بنوایا تھا اُس کا منبر

رازِ نہفتہ تیری شہادت بتا گئی قاتل کی تیغ چوم کے تھر گئی سنا گئی

ہے بند بوالہوس پہ در ایوانِ یار کا

خنجر کی دھار رہ ہے شبستانِ یار کا

بھوپال

مولوی سید امجد علی صاحب اشہری مرحوم و مغفور کا کلام جب کبھی مخزن میں نکلا۔ نہایت شوق سے پڑھا گیا۔ مندرجہ ذیل نظم اُن کی پرانے مسودات میں ملی ہے۔ اسے ہم تبرکاً چھاپتے ہیں۔ ہاتے ع اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مَیں اٹاوہ سے چلا صورتِ نبضِ مضطر آیا بھوپال میں خود آپ میں آتا ہی بشر

خستگی کھونے کو مَیں راہ کی سویا شب کو صبح کو اُٹھ کے چلا دیکھنے آثارِ سحر

سورۂ نور زباں پہ ہوئی جاری میرے فرحت افزا ہیں ہوا فاتحہ پڑھنے کو گزر

اس میں مدفون ہیں نواب سکندر بیگم جو زمانہ میں ہوئیں نور جہانِ دیگر

کیا بتاؤں تمہیں کیسی تھی کتابی صورت کیا کہوں کیسی تھی پُر نور جبینِ انور

سطوت و رعب تھا صورت سے نمایاں اُنکی سارے اعضا کا تناسب تھا مناسب یکسر

قدسیہ بیگم بھوپال تھیں مادر اُن کی جہانگیر کی خاتون خجستہ گوہر

انتظام اُن کا ہے مشہورِ زمانہ ایسا جو ہے ضرب المثل عام میانِ کشور

قبر باقی پہ ہوا لوٹ کے پھر فاتحہ خواں تھے سکندر کے جو داماد تہمتن پیکر

آپ ہی اپنا تخلص باقی انکو سمجھتا تھا جہاں تھے یہ امراؤ کبھی شاہ جہاں کے شوہر

کیا کہوں تم سے میں کیسا تھا سجیلا قامت کیسا سینہ تھا گلا کیسا تھا کیسی تھی کمر

سید الشہدا حسینؓ

تجھ پر سلام اے شہِ جانبازِ کربلا! اے یکہ تازِ عرصۂ خوشنودیٔ خدا!
تنہا اِدھر تو لشکرِ مور و ملخ اُدھر بیکس پہ یعنی نرغۂ افواجِ فتنہ گر!

نارِی محاصرین تھے نُورِ الٰہ کے
قبطی تھے گرد مُوسیِ طُورِ الٰہ کے

کیا جانے کوئی کیا تھا بیابانِ کربلا صد دشتِ حشر گوشۂ میدانِ کربلا
غربت پیاس بھوک کڑاکے کی دھوپ تھی سہمی ہوئی تھی جان ہر اک جاندار کی
غش کھا رہے تمام جوانمرد مرد تھے چہرے برنگِ چہرۂ مدقوق زرد تھے
بازارِ کشت و خون کی گرمی وہ الاماں لاشوں کے ڈھیر کشتوں کے پشتے یہاں وہاں

پائے ثبات تیرے کب لڑکھڑائے ہیں؟
بل کب تری جبینِ شجاعت پہ آئے ہیں؟

دنیا پہ مر رہے ہیں جہاں کے ستیزہ جو ہیں پیروانِ آز یہاں کے ستیزہ جو
روحِ فدا کے معرکۂ کارزار میں کی تو نے جاں نثار رہِ کردگار میں
باطل پرست حق سے نہ تجھ کو ہٹا سکے مورِ ضعیف کوہ کو کیونکر ہلا سکے

مضبو[illegible]ال و خون سے تیرے بنا دیں
تصویرِ درد و غم ہے ترے ماجرائے دیں

اے آنکہ از نمازِ تو شانِ نمازِ عشق! شرحِ حکایتِ تو بیانِ نمازِ عشق!
امت نے تجھ پہ ہاتھ جفا کے اٹھائے ہیں تو نے اٹھائے ہیں تو دعا کے اٹھائے ہیں
یہ حوصلہ یہ صبر یہ گردہ یہ دل کہاں! انسان کے وجود میں یہ آب و گل کہاں!

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے سرد جھونکے — تجھے دے رہے ہیں لوری، میرے غمگسار سو جا
یہ تری صدا، یہ نالہ، مجھے متہم نہ کر دے — میرے پردہ دار سو جا، میرے رازدار سو جا
تجھے خوں رلا رہا ہے تیرا دمبدم تڑپنا — ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سو جا
ابھی دہان پان ہی تو نہیں عاشقی کے قابل — یہ تپش کا آہ! شیوہ نہ کر اختیار سو جا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم! تجھے گود میں اٹھا لوں — تجھے سینے سے لگا لوں۔ تجھے کر لوں پیار سو جا
تجھے جن کا ہے تصور۔ اے مست جامِ الفت — انہیں انکھڑیوں کے صدقے! مرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے۔ شب غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم! دلِ بیقرار سو جا

[illegible]

شاعر خلقی ہوتا ہے

جلوۂ ماہ سے اسے نسبت — کرمکِ شب کو لاکھ تابندہ
ذرہ کب ضیا سے ہوتا ہے — صورتِ مہر کب درخشندہ
باز آ اس خیالِ باطل سے — ورنہ آخر کو ہوگا شرمندہ
شاعری کسب سے اگر آتی — اک زمانہ تھا اس کا جویندہ
مٹے ہوتے یہ شاعرِ خلقی — نام رہتا نہ ایک کا زندہ
تجھ کو اس میں اگر ہے کچھ پس و پیش — اک سند ہے یہ بیتِ آئندہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

[illegible]

کنارِ ٹیمس وُہ ہنگامۂ نشاط وُہ دھوم محاذِ آبِ سمن رُوہ جھمگھٹے وُہ ہجوم
وُہ بال رُوم میں رقص و سرود و عیش و نشاط کہ جسکے آگے نہیں جشنِ جم کی کوئی بساط
بھرے ہُوئے ہیں تھیٹر قمر جبینوں سے نظر کو بھی نہیں ملتی جگہ حسینوں سے
سماں یہ دیکھ کے جو لوگ بھول جاتے ہیں وُہ راہِ منزلِ مقصود بھول جاتے ہیں
بہارِ گلشنِ دُنیا ہے آدمی کے لئے مگر بنا نہیں انسان محض اسی کے لئے
ضیائے شمعِ شبستاں ہے رات بھر کیلئے فضائے منظرِ بُستاں ہے اِک نظر کے لئے
قرینِ عقل نہیں دل پہ ہو نظر غالب نظر فریب بھی کھائے تو دل نہ ہو طالب
وُہ دِل کہ خونِ شرافت ہے موجزن جس میں شعاعِ مہرِ سعادت ہے ضَو فگن جس میں
کمالِ علم ہی غایت ہے اہلِ بینش کی سمجھتے ہیں جو غرض اپنی آفرینش کی
اِسی سے ہجر گوارا بہ جبر کرتے ہیں خُدا کو سونپتے ہیں تم کو صبر کرتے ہیں
اکیلے جاتے ہو پردیس میں خدا حافظ جہاں مقام ہو ہر دیس میں خُدا حافظ

دِلِ بیقرار سو جا

ناظرینِ مخزن منشی دُرگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کے انتقالِ پُرملال کی خبر غالباً اخبارات میں دیکھ چکے ہونگے۔ ان کے گذر جانے سے اُردو علم ادب کا ایک سچا خادم دنیا سے اُٹھ گیا۔ افسوس کیسے کیسے لوگ کوچ کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی بھیجی ہوئی دو ایک نظمیں ہمارے ذخیرہ میں باقی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل نظم اپنے عنوان کے اعتبار سے شاعر کے حسبِ حال ہو چکا دلِ بیقرار مُدت العُمر تڑپ تڑپ کر آخر ایسی نیند سو گیا ہے جس سے حشر تک بیدار نہیں ہوگا:-

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا کہ گذر گئی شبِ آدھی۔ دلِ بیقرار سو جا

مری نگاہ میں اے ہمنشیں جہاں ہے سیاہ — شبِ فراق میں لطفِ قمر یہ خوب کہی
جنابِ شیخ کا ہو جاؤں معتقد معقول — نگاہِ یار رہے بے اثر یہ خوب کہی
شباب و بادہ و فکرِ مآل کار چہ خوش — جنونِ عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی

نظمِ رخصت

یہ نظم مسٹر وہاج الدین حیدر صاحب بیرسٹر لکھنؤ نے اپنے بھتیجوں نظام الدین حیدر اور وحید الدین حیدر کے لندن جانے کے وقت بھیجی تھی کہ جہاز پر قدم رکھتے ہی اُن کو ملے :-

نظام جاتے ہو لندن مگر خیال رہے! — وحید تم کو بھی اندیشۂ مآل رہے!
ہمارے دردِ جدائی کا کچھ اثر بھی ہے — ہمارا حال ہو کیا۔ کچھ تمہیں خبر بھی ہے!
خبر ہے تم کو یہ کیوں دے رہے ہیں اِذنِ سفر — تمہارے ہجر کا رکھتے ہیں دل پہ کیوں پتھر
یہ جانتے ہو کہ ہم سب کو آرزو کیا ہے؟ — جو بھیجتے ہیں تمہیں اُن کو جستجو کیا ہے!
یہ آرزو ہے کہ دُنیا میں شاد کام رہو — دُعا یہ ہے کہ زمانہ میں نیکنام رہو
سُنو کہ خواہشِ اوّل یہی ہے ہم سب کی — وہاں بھی تم کو رہے قدر اپنے مذہب کی
وُہ مذہبِ حنفی ضد جو ہے تعصب کا — کہ جس کا مسئلہ خُلق نقش ہے حُب کا
مگر بُرا نہ سمجھنا کسی کے مذہب کو — ہمیشہ چشمِ محبت سے دیکھنا سب کو
اُصول میں ہیں صریحًا تمام مذہب ایک — غرض ہے ایک ہی اصلاحِ نفس مطلب ایک
وہاں تمہیں نظر آئیگی اک نئی دُنیا — نظر فریب تماشا ہے جسکے گلشن کا
کھلے ہوئے ہیں بہارِ طرب کے گل ہر سُو — نگارِ عیش کے بکھرے ہی رہتے ہیں گیسو
نگاہ محوِ تماشائے شاہدِ گل ہے — دلوں کے تاک میں وارستہ زلفِ سنبل ہے

ہمیشہ چشم

کلامِ اکبر

مذہبی وعظ کا سودا نہ رہا گو سر میں — میرزایانہ تعلّی تو ہے لٹریچر میں
کھیتیاں خشک ہوئیں سوکھ گئے گلشن و باغ — عرش پر پھر بھی ہے ایران کی انشا کا دماغ
دہر کہتا ہے کہ اس آتشِ فارس کو بجھا — ڈارونیہ انہیں کرمک کے مضمون سمجھا
تازی و پارسی جب تک کہ نہ یہ بھولیں گے — ان کے اوہام سدا عرش ہی پر جھولینگے
خیر ماضی نہ سہی حال کی نظمیں دیکھو — حضرت اکبر و اقبال کی نظمیں دیکھو

ان کو کس بحر سے مضمون کے دُر ملتے ہیں
وُہ ترانے ہیں کہ افلاک سے سُر ملتے ہیں

حفظِ عصمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں — مسلموں کے جاہ و شانِ تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اسکی ضرورت ہی نہیں — میرزایانہ ادا تھی تمکنت کی بات تھی

خون میں غیرت رہی باقی تو سمجھیگا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی — شبِ گناہ و نمازِ سحر یہ خوب کہی
فقط نفیس سڑک خوشنما ڈنر ہر شب — یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی
تمہاری خاطرِ نازک کا ہے لحاظ فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر یہ خوب کہی
ہزار جان سے مشتاق خود ہوں خدمت کا — تمہارے کام میں اور دردِ سر یہ خوب کہی
درست ہیں نہ عقیدے نہیں عمل اچھے — دعائیں کیوں نہیں ہوتا اثر یہ خوب کہی

سے ان دونوں دوستوں کے خلوص و محبت کا کس حد تک اظہار ہوتا ہے؟ آہ! ظاہرداری اور نمائشی تہذیب اب ہمارے رگ و ریشہ میں گھر کر چکی ہے اور مفرط اخلاق ہماری صفاتِ حسنہ سے کب کا خارج ہو چکا۔ اسی افسوسناک انقلاب کو دیکھ کر حضرت لسان العصر کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ہے (اکبر)

نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیر سر ہے یا جنابِ مکرّمی ہے

سید جعفری رضوی

ایک آنہ فنڈ

لکھنؤ میں کچھ عرصہ سے ایک فنڈ قائم ہے۔ جس کا مقصد مساجد کی مرمت اور آبادی ہے۔ یہ فنڈ چھوٹی مقدار کے چندوں سے بہت بڑی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اس کی رفتارِ ترقی یہی طرح قائم رہے۔ حال میں سید خلیل احمد صاحب آنریری سکرٹری نے اس فنڈ کی دوسری روداد شائع کی جو دلچسپ معلومات سے پُر ہے اور جس سے اس جماعت کے کام میں خاطر خواہ ترقی نظر آرہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مساجد بہت کچھ توجہ اور امداد کی محتاج ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ مخیّر اصحاب اس کارِ خیر کی مدد فرما کر داخلِ حسنات ہوں گے۔

مَیں چاہتا ہُوں کہ آپ بھی اپنی امکانی امداد سے دریغ نہ فرمائیں"۔
"ہاں ہاں۔ مَیں آپ کو پُورا اطمینان دلاتا ہوں کہ مَیں آپ کا ہمخیال ہوں اور تعلیم نسواں کے مسئلہ سے تو مجھے خصوصیت کے ساتھ وابستگی ہے۔ لیکن کیا کروں۔ مکروہاتِ دُنیاوی سے سر اُٹھانے کی بھی فرصت جلسہ کا زمانہ بہت قریب ہی اور ابھی ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔ افوّاہ مَیں نے سُنا ہے کہ کوئی مولوی صاحب ہیں اُنہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے اور لوگوں کو اس جلسے کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی ہی۔ حامد! اِن مُلّانوں نے ناک میں دَم کر دیا ہی۔ یہ کسی پہلو چَین نہیں لینے دیتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچتا ہی اور مشکل سب سے بڑی یہ ہوتی ہی کہ عوام اِنہیں کم عقلوں کی تقلید کو جنّت کی کُنجی سمجھتے ہیں۔ اِن سے خُدا سمجھے"۔
"اِن تمام دقتوں کے باوصف ہمیں اپنے کام کی طرف غفلت نہ کرنا چاہئے ہاں اچّھا یاد آیا محمُود! مَیں نے لعل محمد (حامد کا ملازم) کے ذریعہ کل اُس کتاب کی قیمت آپ کی خدمت میں بھیجی تھی جو مَیں آپ کے یہاں سے ایک ہفتہ ہُوا ضرور تاً لے گیا تھا اور جس کے اتفاقیہ گم ہوجانے کا حال بھی میں کئی دن ہُوئے آپ سے عرض کر چکا ہُوں"۔
"بیشک مجھے وُہ رقم مل گئی ہی اور مَیں آپ کی اس توجّہ کا شکر گذار ہُوں"۔
"اب مَیں اپنی باتوں سے آپ کا زیادہ وقت نہیں صرف کرنا چاہتا اور اجازت طلبگار ہُوں"۔
"بہت خوب اب میرے کھانے کا وقت بھی آگیا ہے۔ گڈ بائی"۔
گفتگو میں سنجیدگی اور متانت کا پہلو قائم رکھنے کی کوشش پوری پوری کی گئی ہی۔ لیکن اس لب و لہجہ ان تکلّف آمیز الفاظ اور ان مہذب مگر خشک خیالات

پاسداری کے باوجود وہ ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھانے کے مجاز ہیں خواہ محمود حامد سے دِن بھر میں بیس دفعہ ملنے آئے۔ لیکن حامد ہی کو قسم ہے کہ اگر اُسے ایک پیالی چاء کے لئے بھی پُوچھے۔ اسی طرح جب تک کوئی موقع نہ آئے اور خاص طور پر دعوت کا پیام نہ بھیجا جائے اُس وقت تک حامد کو محمُود کے یہاں کھانا حرام ہے۔ باتیں کرنے میں اُسے یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ غیر ضروری امور میں مسٹر محمُود کا وقت نہ ضائع کرے نہ طول کلامی سے دماغ پراگندہ ہونے پائے۔ گفتگو پر اگر سرسری نگاہ ڈالیئے تو تصنع اور ریاکاری کے رنگ میں رنگی ہوئی پائیگا اور اُس میں اُس فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی کا نام تک نہیں جو دو قلبی دوستوں کی بات چیت میں ہونا از بس لازمی سمجھی جاتی ہیں۔

"ڈیر حامد! مجھے آپ سے ملکر بیحد مُسرت ہوئی۔ مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ آپ کا مزاج بخیریت ہوگا"۔

"تھینک یُو۔ مَیں آپ کے اس عنایت آمیز استفسار کا تشکریہ تہ دِل سے ادا کرتا ہُوں اور ایک خاص ضرورت سے مَیں آپ کو اسوقت تکلیف دینے پر مجبُور ہُوا ہوں کہ ...."

"اس بارے میں مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا اُس کے لئے مَیں ہر طرح حاضر ہُوں لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میری کوشش اس امر خاص میں شاید زیادہ کارگر نہ ہو۔ باوجودیکہ مسٹر فلاں کی مجھ پر نظرِ عنایت ہے مگر وہ کسی قدر خشک مزاج واقع ہُوئے ہیں اور اُن کے سامنے کسی ضرورت کو پیش کرتے ہُوئے پس و پیش ہوتا ہے کہ کہیں زبان نہ خراب ہو"۔

"ڈیر محمود! مَیں اس معاملہ میں آپ پر بار ڈالنا پسند نہ کرتا لیکن چونکہ یہ ایک قومی کام ہے اور آپ ہر کارِ خیر میں حصّہ لینے کے ایک طرح سے عادی ہیں اس لئے

اس ۔
ہے مگر وہ

مروّت کا لقب اُن خیالات کو دیا گیا ہے جو اظہارِ تدمّغ و تمکنت کے طریقے پر دوسروں کے سامنے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ قومی ہمدردی ہمارا صبح و شام کا وظیفہ ہے لیکن یہ اُس شاعر کی دُعا کی طرح بے اثر ہے جس نے اپنی نارسائی قسمت پر عاجز آ کر یہ کہدیا تھا کہ؎

مانگا کرینگے اب سے دُعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

تصویر کا ایک رُخ دیکھنے کے بعد بھی اگر آخری فیصلہ تک پہنچنا دشوار ہو تو آییے ہم عینی مثال و مشاہدے سے یہ بات آپ کے دل نشین کر دیں کہ غریب پُرانے قسم کے بزرگوں کو جنہیں ہم بعض اوقات پیر فرتوت کہکر اپنی دریدہ دہنی کا ثبوت دینے میں عار نہیں رکھتے۔ نئی اُمّت سے سچّے اور صحیح اخلاق و تہذیب میں کسی حد تک فائق ہیں یا نہیں۔

حامد و محمود دونوں نئی طرز کے تعلیم یافتہ نوجوان۔ دونوں مغربی وضع کے پابند اور دونوں سیج مچ کے صاحب بہادر ہیں۔ طرز معاشرت کی یکسانیت کے ساتھ خیالات کی یکرنگی نے دونوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا ہے۔ ناواقف لوگ جانتے ہیں کہ حامد و محمود ایک جان دو قالب ہیں۔ مگر آہ! یہاں وُہ سچی اُلفت نام کو بھی نہیں۔ بے تکلفی یہاں عنقا صفت معدوم ہے۔ یہاں اُس خلوص و یگانگت کا سایہ تک نہیں پڑا جس کی وجہ سے میر فرخندہ علی رشید کے والد کو بھائی جان [illegible] مجبور تھے اور جس نے سعادت کے کان میں پھونکدیا تھا کہ رشید تیرا بڑا بھائی ہے۔ یہاں تو ڈیر محمود ڈیر حامد کے القاب ہیں جو خواہ کسیقدر دلچسپ معلوم ہوں لیکن معنوی اعتبار سے ان الفاظ کے مہمل ہونے میں شُبہ نہیں۔

لیکن حامد و محمود کے دل میں بھی کبھی اسبات کا گمان نہ گذرا ہوگا کہ آپس کی

جانی کہنے

اُن میں ایک قابلِ تعریف بات یہ ہوتی ہے کہ ظاہرداری اور تصنع سے اُن کے
قول وفعل کو مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ جو بات اُن کے دل میں ہوتی ہے اُس کے
اظہار میں وُہ تامل نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ اَوروں کے جذبات کو صدمہ پہنچانا
گناہ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔ اُن کی وضع وقطع سیدھی سادی ہوتی ہے۔ اُن کا
طرزِ زندگی سادگی اور کفایت شعاری کا مکمل نمونہ ہوا کرتا ہے۔ اُن کی گفتگو
بےتکلف اور روزمرہ کی زبان میں اُنکے اصلی خیالات وخواہشات کا سچا عکس ہوتی
ہے۔ وُہ جس سے ملتے ہیں خلوصِ دل کے ساتھ اور بےغرض ملتے ہیں۔ غیروں
کی امداد میں اُن سے جو کوشش ممکن ہوتی ہے اُس سے اُنہیں دریغ نہیں ہوتا۔
غرضکہ وُہ نہایت راستباز اور متواضع ہوتے ہیں اور اُنہیں اخلاق مجسم کہنا
واقعیت کا اظہار کرنا ہے۔

اس کے برخلاف ہم پر نظر ڈالئے جو نئی روشنی کے شعاعوں سے اپنے دل
و دماغ کو منور کر چکے ہیں اور عالی خیال وتعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اُس
جماعت سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ جس کی حوصلہ افزا و دل خوش کن مساعی پر
مُلک کی نجات منحصر ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھئے اور ہماری اور اُن بڑے
بوڑھوں کی حالتوں کا موازنہ کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ وہاں
اگر نمائش اور ظاہرداری کی جھلک تک نظر نہ آئیگی تو ہم یہاں سر سے پیر تک
تصنع سے ملوّث دکھائی دینگے۔ جس چیز کا [illegible] ہم نے تہذیب رکھا ہے وُہ آپ
کو ہمارے یہاں چند معاشرتی پابندیوں کی صورت میں ملیگی۔ جس چیز کو ہم اخلاق
کہتے ہیں اُسے آپ ہمارے یہاں چند خوش آیند الفاظ کے بھیس میں پائینگے۔
ہمارے یہاں محبت وہمدردی اُس تصویر کا نام ہے جو اوپر سے نہایت خوش وضع
اور نظر فریب بنائی گئی ہے لیکن اُس میں جان نہیں۔ ہمارے یہاں اخلاص و

کا نام ہم نے
صورت

میں کچھ کتابیں ہیں۔ کتابوں میں آجکل کے ناول نہیں جو نوعمروں کو اپنے پیچھے باؤلا بنائے ہوئے ہیں بلکہ اُن میں زیادہ تر فارسی تصانیف ہیں۔ ان کو میر صاحب نہایت عزیز رکھتے ہیں اور فرصت میں ان کے مطالعہ سے حظ حاصل کرتے ہیں اور اکثر اُن کے پُرلطف مضامین اپنے یار دوستوں کو بھی سُناتے ہیں۔

اس وقت ایک نوجوان ان کا مخاطب ہے۔ یہ میر صاحب کے ایک دوست کا صاحبزادہ ہے۔ میر صاحب اور اس کے والد میں بہت ارتباط ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہمدردی و محبت کرتے ہیں۔ یہانتک کہ میر صاحب اپنے دوست کو جن کا سن ان سے کسیقدر زیادہ ہے۔ بھائی جان کہا کرتے ہیں۔ رشید کو دیکھکر میر صاحب بہت مسرور ہیں اور اُن کی خوشی کا اظہار اُنکی حرکات وسکنات سے ہو رہا ہے۔ دیکھئے باتیں بھی کتنے مزے کی ہیں کہ دلی محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ باتیں کیا ملنساری اور بزرگانہ عنایت کی ہُو بہو تصویر ہیں۔

نئی روشنی والے پُرانی وضع کے بزرگوں کو خواہ کسی قدر ذلّت کی نگاہ سے دیکھیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ وضعداری اور خلوص و محبّت کے خاص طور پر پابند ہوتے ہیں۔ محدود خیالات اور کم نظری کے باوصف اُن میں بعض مخصوص صفات ایسی پائی جاتی ہیں جو ہمارے ملک کے نئے طبقہ میں بالکل مفقود نظر آتی ہیں۔ ان میں وُہ اوصاف بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں جو حقیقی اُلفت اور صحیح ہمدردی کی سچّی تصویر کہلانے کے مستحق ہیں۔ اُن کا خلق ظاہری نمائش اور بناوٹ سے معرّا ہوتا ہے۔ اُن کا اخلاق نہایت وسیع اور ہر کہ ومہ کے ساتھ یکساں رہتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وُہ قومی ہمدردی سے محض ناواقف ہوتے ہیں۔ تاہم فرداً فرداً وُہ اپنے دوستوں آشناؤں۔ مہمانوں اور عزیزوں کے ساتھ ایثار نفس اور خالص اُنسیت کا برتاؤ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

حلوہ سعادت اپنی خالہ اماں کے یہاں سے لایا تھا۔ اُن کو مربّے اچار۔ چٹنی وغیرہ بنانے کا بہت شوق ہے۔"

"بھئی اب جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مَیں تو سمجھتا ہوں شام تک جانا۔ اب یہیں کچھ دیر آرام کرو۔"

"خیر! اگر ایسی ہی مجبوری ہے تو مَیں زیادہ اصرار نہیں کرتا۔ لیکن میاں رشید کبھی کبھی اس طرف آنکلنا چھوٹے کو بہت بہت پیار کرلینا۔ آج تم سے اس کی علالت کا حال سُنا ہے۔ میری طبیعت لگی رہیگی۔"

"اچھا (گلے لگا کر) خدا حافظ (رشید کے ہاتھ میں دو روپیہ رکھدیتے ہیں اور رشید واپس کرنے کی کوشش کرتا ہے)۔

"نہیں نہیں مَیں نہ مانوں گا۔ خالی ہاتھ تھوڑے جاؤ گے۔ بھئی اچھا اگر تمہیں لینے میں عار ہے تو راستے میں کہیں سے چھوٹے کے لئے مٹھائی لیتے جانا اور دیکھو مخدوم تمہارے ساتھ آتا ہے۔ اس مرتبان میں کچھ مربّہ اسے دیدیا ہے گھر میں سبوں کو دیدینا ....

میر فرخندہ علی پُرانی وضع کے ایک متوسط الحال پیر مرد اپنی نشستگاہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں۔ یہ کمرہ ان کا گویا ڈرائنگ رُوم ہے۔ لیکن یہاں آپ کو آرائش کا وُہ سامان نظر نہ آئیگا جسکے بغیر کسی مہذب جنٹلمین کی عزت میں بٹہ لگجاتا ہے۔ پھر بھی دیکھئے باوجود اپنی سادگی کے [illegible] قدر دلچسپ ہے۔ دری کا فرش ہے۔ اُس پر سفید براق چاندنی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ صدر میں ایک قالین لگا ہُوا ہے اور اُس پر دیوار سے ملا ہُوا ایک گاؤتکیہ رکھا ہے۔ تکیہ پر بھی صاف غلاف چڑھا ہُوا ہے۔ ایک کونے میں آگرے کی بنی ہُوئی خوبصورت جانماز بچھی ہے اور اس کے سرے پر عقیق البحر کی ایک تسبیح رکھی ہے۔ جانب مغرب ایک مختصر الماری

یہ جگہہ کس قدر

آئے ہیں۔ دونوں بھائی طور رشید تم نے تو اسے پہچان لیا ہوگا۔ لیکن شاید اس نے تمہیں نہ پہچانا ہو (سعادت سے) یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ تمہارے چچا جان جو لا لا کر مٹھائی اور کھلونے دیا کرتے تھے اور تمہیں بہت پیار کرتے تھے۔ اُن کے یہ بیٹے ہیں۔"

"اچھا سعادت! اب اپنے بھیا کو کھانا نہ کھلواؤ گے۔ دیکھو تیار ہوگا۔ لو لاؤ۔"

"دیکھو میاں رشید! تم تکلف نہیں چھوڑتے۔ ارے بھائی کھانے میں تو کسی کو تکلف نہ کرنا چاہئے اور پھر یہ تو تمہارا گھر ہے۔ گھر میں آدمی کو کس بات کا لحاظ ہوتا ہے خوب سیر ہو کر کھاؤ۔"

"گل چمن! دیکھ رشید کے لئے اور میٹھا لانا۔ سعادت! یہ کباب کی طشتری رشید کی طرف بڑھا دو۔ رشید! دیکھو یہ میٹھی چٹنی کتنی لذیذ ہے اور یہ پیٹھے کا مربہ خاص قسم کا ہے۔ اس ٹکڑے کو دیکھو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بالکل کچے ہوں۔ مگر ذائقہ میں بہت اچھے ہیں۔ کھانے میں بھی کرکراہٹ پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ترکیب سے بنتا ہے۔"

"بس واہ! ابھی اور کھاؤ۔ تم تو اس قدر تکلف کرتے ہو جس کی انتہا نہیں۔ اچھا بالائی کے ساتھ تھوڑا سا میٹھا اور کھا لو۔ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دو ایک قاش مربے کی اور لو۔ منہ نمکین کرنے کے لئے اچھا تھوڑا سا شامی کباب چکھ لو۔"

منہ نمکین

"بخدا! میں نے تمہاری وجہ سے کوئی تکلف نہیں کیا۔ گھر میں جو کچھ معمولی طور سے پکتا تھا وہی تمہارے سامنے آیا ہے۔ صرف میٹھا اور پکوا لیا تھا اور یہ مربے وغیرہ تو میرے ہاں ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ گاجر کا

لیاقت حاصل کریگا۔ الحمدللہ کہ تم نے میری بات رکھ لی۔ ہاں بیٹا! دیکھو تم یہاں
تکلف نہ کرو۔ یہ تمہارا گھر ہے مَیں تم کو سعادت (ان کا لڑکا) سے کم نہیں سمجھتا۔
اچھا آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اچکن اُتار کر کیل سے لگا دو"۔

واہ بھئی واہ! اب کوئی جانے کا وقت ہے۔ کھانا تیار ہے۔ کھا کر آرام
سے یہیں لیٹنا۔ شام تک چلے جانا۔ اس وقت دُھوپ بھی زیادہ ہو گئی ہے
تکلیف ہوگی۔ اور ابھی تو تم سعادت سے نہیں ملے وُہ اب آتا ہی ہوگا۔
کل سے اپنی خالہ اماں کے یہاں گیا ہے۔ اُن کا تو اصرار تھا کہ مَیں سعادت
کو دو چار دن نہ آنے دونگی مگر مَیں نے کہا کہ نہیں اس کے پڑھنے کا ہرج ہوگا"۔

"ہاں سعادت اب مکتب جاتا ہے۔ پہلے تو ڈیڑھ سال تک مَیں نے خود
اُسے گھر پر پڑھایا۔ اور جب دو چار فارسی کی کتابیں نکل گئیں تو مَیں نے اُسے مولوی
مظہر اسلام صاحب کے سپرد کر دیا ہے۔ مولوی صاحب بیچارے بہت نیک
آدمی ہیں اور لڑکوں کو ایسی محبت کے ساتھ پڑھاتے ہیں کہ وہ اُن سے بہت
مانوس ہو جاتے ہیں۔ اب سعادت کا یہ حال ہے کہ مکتب جانے سے ذرا
بھی جی نہیں چُراتا۔ بلکہ اگر روکو بھی تو نہیں مانتا۔ کل کی بات ہے کہ گھر
میں حضرت (ان کے پیر) کی دیگ تھی۔ مَیں نے اپنے تمام دوستوں اور
عزیزوں کو مدعو کیا تھا۔ تمہاری چچی (ان کی بیوی) نے سعادت سے کہا
کہ آج مکتب نہ جانا۔ گھر پر ہی رہنا۔ سب [illegible]ئینگے۔ دیکھنا بھالنا۔ مگر
لوگ آئینگے
وُہ نہ مانا۔ مَیں نے سمجھا کہ شاید میرے خیال سے یہ ایسا کہتا ہے مَیں نے
بھی اس سے کہا کہ ہاں آج پڑھنے نہ جانا۔ ہم مولوی صاحب سے کہدینگے۔
اس پر وُہ کہنے لگا کہ نہیں باوا! مَیں جلدی چلا آؤنگا۔ سبق کا ہیکو ناغہ ہو"۔

"لو سعادت بھی آگیا۔ سعادت ادھر آؤ۔ دیکھو تمہارے رشید بھیّا

تصویر کے دو رُخ

"رشید۔ اخاہ کب آئے۔ رہے تو اچھے۔ کہو لکھنؤ اور دیوبند میں کیسی گذری۔ سُنتے ہیں کہ ان دونوں جگہوں میں عربی فارسی کی تعلیم کا انتظام اچھا ہے اور غریب و نادار طالبعلموں کو بھی مخیر و مستطیع لوگ امداد پہنچاتے ہیں۔ تم نے خوب مُستعدی سے پڑھا ہوگا۔ ماشاء اللہ تم پہلے ہی سے طبیعت دار تھے۔ یہاں بھی جب تک تم رہے اپنے ہم سبق لڑکوں میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ ذہین تم تھے ہی اور تمہیں عربی فارسی پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ اُستاد تو تم سے خوش رہے ہونگے اور تمہارے ساتھیوں نے بھی تمہاری خداداد لیاقت دیکھکر کہا ہوگا کہ یہ بھی کچھ ہے۔ ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو کہ آجکل لوگوں کی طبیعتیں انگریزی پر اتنی مٹی ہوئی ہیں کہ عربی فارسی کا نام تک نہیں لیتے بیٹا! انگریزی پڑھنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اُسی کے ساتھ ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے مذہب کو نہ بھُولیں اور خُدا و رسُول کو پہچانیں۔ خُدا ان لوگوں کی ہمت میں برکت دے جو اس زمانے میں بیچاری عربی فارسی کی دستگیری کرتے ہیں"۔

"رشید! تم تو بہت اچھی اچھی باتیں سیکھ کر آئے ہو۔ اب تو ہم کو جو بات نہ معلوم ہوگی تم سے پُوچھا کرینگے اور تم بھی بتانے میں لحاظ نہ کرنا۔ دیکھو تو تم کتنی اچھی تقریر کرتے ہو اور بات بات میں قرآن و حدیث کی سند لاتے ہو۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ ہم تو پہلے ہی بھائی جان سے کہتے تھے کہ انشاء اللہ تعالیٰ رشید بہت

جب تک ہر فرد بشر جس میں ہم عورتیں بھی شامل ہیں۔ اپنی فلاح کی کوشش کرے
اور جو کچھ بن پڑے کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ ہماری ترقی مشکل ہے۔ ہمارا فلاحِ ملک و
ملت میں دخل دینا اور اپنی بہبودی اور بہتری کی کوشش کرنا کوئی نئی
بات نہیں۔ غیر ملک تو رہے درکنار ہمارے اپنے ہندوستان میں عورتیں
ہمیشہ ملکی خدمات بجا لاتی رہی ہیں۔ سوشل ترقیوں کی کوشش تو خیر
ان کے بس کی ہی بات ہے۔ ہندو اور مسلمان بہنوں نے بعض موقعوں
پر ملکی امور میں عجیب و غریب بہادری دکھائی ہے۔ راجپوتانہ
کی تواریخ کے صفحات راجکماریوں کے کارناموں سے بھرے
پڑے ہیں۔ ہمارے پیارے ہند کی مستورات ہمیشہ سے اپنے اس
بڑے فرض سے ایسی غافل نہیں تھیں جیسی کہ اب ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے
ملک اور ملت کے لئے جان دینے کو آمادہ تھیں اور اس زندگی کو جو خدمات
ملکی اور قومی میں صرف ہوئی۔ ابدی زندگی کہتی تھیں۔ مجھے اس مضمون کو
اپنی بہنوں کے آگے پڑھکر ان کو اپنے فرائض یاد دلانا منظور ہے۔
ہمارے ملک کی فلاح بغیر ہماری مدد کے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ
بقول ایک لائق خاتون کے عمارتِ قومی کے معمار مرد نہیں بلکہ ہم ہیں۔ ہم
سب کو واجب ہے کہ تھوڑا تھوڑا حق اپنی قوم کی مائیں اور بہنیں ہونے کا
ادا کریں اور ان کاموں کی بنا ڈالدیں کہ [illegible] تو نہیں مگر وقت پا کر وہ نتائج
پیدا کرینگے۔ جن سے ہماری قوم کی فلاح میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ اور ہم
سب اس اشتیاق کے ساتھ اس مبارک وقت کی منتظر رہیں۔ جب ہمارے لگائے
ہوئے پودے برگ و بار لائینگے ؞

مِس نرندر ناتھ

کے لئے بھی ہرگز پسندیدہ نہیں۔ خدا کے غیر فانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں بھی رفتہ رفتہ ہی ترقی کرتی ہیں اور یہی اصول نباتات۔ جمادات۔ حیوانات سب پر حاوی ہے۔ ترقی ملک و ملت بھی ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ جو ایک روز اپنی ترقی سے اہل دنیا کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ انگلستان جیسا اسوقت ہے صدیوں کی کوشش کے بعد بنا۔ وہاں کی عمارتِ قومی کے معماروں اور تہذیب بنانے والوں میں ہزاروں مثالیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی خدمتِ ملکی و قومی میں وقف کر دی اور انکا نام بھی کسی کان تک نہ پہنچا۔ نہ ان کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ نہ ماتمی جلسے ہوئے۔ نہ کسی نے فاتحہ پڑھی۔ اور نہ کوئی چشم تر ہوئی۔ اگرچہ اُنہوں نے دنیا میں نام نہ پایا۔ عمر بھر اپنی کوششوں کو کامیاب ہوتا نہ دیکھا۔ مگر اپنا فرض ادا کیا اور مثال قائم کر گئے۔ اور آنے والوں سے اُمید رکھی کہ وہ اُنکی ڈالی ہوئی بنیاد کو مکمل کرینگے۔ دُنیا ایک میدان کارزار ہے جس میں فتح کا فخر اور تعریف حاصل کرنے والے معدودے چند ہیں۔ اگرچہ ظفر چھوٹے چھوٹے کاموں پر ہی مبنی ہے۔ خداوند دو عالم نے انسان کو وہ قوت ارادہ بخشی ہے کہ اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے تو ہرگز کوئی بات مانع نہیں ہوسکتی ایک انگریز فلسفی جان سٹوارٹ مل کا قول ہے کہ ہم یہ بخوبی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم کسی جادو کے زور سے [illegible] اس بات کی پابندی پر مجبور نہیں۔ اور جو کچھ بہتر سمجھیں کر سکتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف خیال کرنا اپنی قابلیتوں کو گھٹانا اور اپنے رُتبہ کی ہتک کرنا ہے۔ آئین و قوانین کا مقرر ہونا اور سب کا ان پر عمل کرنا اس بات کی پوری پوری دلیل ہے۔ ایک دوسرا مصنف کہتا ہے کہ سب سے بڑا کمینہ وہ ہے جسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں۔ اور جو اپنے ارادہ کو پورا نہیں کرتا

ہے کیسا یہ انقلاب جاری زماں ہیں سائر مکاں ہیں ساری
نہ اس سے خاکی بچا نہ ناری فلک پہ پہنچا زمیں پہ چھا کر

اب ہماری نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو مُلک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جنکو ملت کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے۔ زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کی طرف متوجہ نہیں۔ ایسی قوم کو سنبھالنا اسکی بگڑی بنانا۔ اسکی حالت درست کرنا کسی ایک فرقہ کی کوشش سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر شخص کی بڑی جانفشانی سے ہو سکتا ہے۔ کسی عالیشان اور خوبصورت عمارت کے بنانے میں طرح طرح کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ نرمی سختی نزاکت پختگی وغیرہ وغیرہ۔ عمارتِ قومی کی بنیاد میں اگر انکسار کی ضرورت ہو تو ہم سب کو بھی کنکر بنکر پڑ جانا چاہیئے۔ وہ وقت بھی آئیگا کہ ہم اسکو ایک عالیشان اور خوبصورت عمارت بنا ہوا دیکھینگے۔ اب صرف زبانی جمع خرچ ہی کی ضرورت نہیں بلکہ سخت محنت کی حاجت ہے۔ جو ابھی تک کہیں نظر نہیں آتی۔

تعریف یا شہرت

اس نیک کام کا آغاز کسی خاص تعریف یا شہرت حاصل کرنے کے خیال سے نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ صرف اپنے مُلک کی محبت اور فرض کے خیال سے۔ مُلک رُوم میں ایک زمانہ تھا جب وہاں کے پہلوان درندوں اور جنگلی جانوروں سے نہایت بہادری کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔ مگر ان کی وہ بہادری اور دلیری اس خیال سے کہ وہ صرف روپیہ کے لالچ اور لوگوں سے تعریف حاصل کرنے

کی نعمتوں سے حظ اٹھانا ۔ کوئی آسان کھیل نہ رہا ۔ بلکہ اس سفر کی راہ پُر خطر اور منزلیں بہت ہی دشوار گذار بن گئیں ۔ ایک یونانی مصنف کا قول ہے کہ انسان ایک نقطہ کی مانند ہے جسکا مرکز صرف ایک اور دائرے بہت سے ہیں ۔ پہلا دائرہ والدین وغیرہ کا ۔ دُوسرا گھربار بال بچوں کا ۔ تیسرا دیگر عزیز و اقربا کا ۔ چوتھا ملک و ملت کا ۔ ہمیں اکثر خیال آتا ہے کہ اگر ان سب فرائض سے آزاد ہوتے تو شاید ہماری زندگی بہت اچھی طرح کٹتی ۔ مگر یہ خیال محض غلط ہے ۔ شروع شروع میں تو ان سب فرائض سے الگ ہو بیٹھنا شاید کچھ بھلا معلوم ہو ۔ مگر رفتہ رفتہ اس قسم کی آزادی ضرور دُوبھر معلوم ہونے لگے گی ۔ اور جی چاہیگا کہ اُسی طرح پابند فرائض ہو جاویں اور ان تمام فرائض کو جن کی ادائگی روز ازل سے ہمارے اوپر فرض کی گئی ہے ادا کریں اور اس راحت کی وجہ سے جو اس سے حاصل ہو ۔ اطمینان سے بیٹھیں ۔ ایک دُوسرا مصنف کہتا ہے کہ فرض ادا کرنے سے وہ فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے جو کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو تختِ زرّین پر بیٹھکر اور مرصّع تاج سر پر رکھکر بھی نہیں ہوتی ۔

میں اس وقت اُس فرض کی نسبت کچھ کہنا چاہتی ہُوں ۔ جس کا سب سے آخر نام لیا ہے یعنی فرض ملک و ملت ۔ یہ فرض کسی ایک شخص پر نہیں ہو بلکہ قوم کے ہر فرد پر اپنے ملک کو بنانا اور [illegible] گری ہُوئی حالت کو اُبھارنا ۔ کھُوئی ہُوئی عظمت اور برباد شدہ حرمت [illegible] ـنا ۔ وہ ملک جو کسی وقت دُنیا کی اعلیٰ ترین قوموں میں سے تھا مگر جس کی عظمت دورِ فلک نے جو کبھی کسی ملک یا قوم کی حالت ایک سی رہنے نہیں دیتا ۔ جس کا روزِ ازل سے بنا بنا کر بگاڑنا اور جگا جگا کر سُلا دینا شیوہ رہا ۔ آج ہماری حالت بھی دگرگوں کر دی ۔ یہاں تک کہ گذشتہ عظمتوں کے صرف تذکرے ہی باقی رہ گئے ہے ۔

اس کی کو سنبھالنا

ہجومِ فرائض

توکز محنتِ دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

یہ مضمون لاہور کی پردہ کلب کے ایک جلسہ میں جس میں ہندو مسلمان معزز خواتین اور بہت سی انگریز لیڈیاں شریک تھیں۔ برج کماری صاحبہ نے جو کہ دیوان نرندر ناتھ صاحب بہادر ایم۔ اے کی صاحبزادی ہیں پڑھا تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ ہم اسے نہایت خوشی سے چھاپتے ہیں۔

ایشور نے انسان کو خلعتِ ہفت پارچہ یعنی حواسِ خمسہ اور عقل و روح سے سرفرازی دے کر خطابِ اشرف المخلوقات عطا کیا جو اس کی حالت کے بالکل مناسب تھا۔ عقل کا بیش بہا تحفہ اپنی تمام پیدا کردہ مخلوقات میں سے اس کو بخشا۔ ہندوؤں کا فلسفہ بُدھی کو آتما کا اعلیٰ ترین وصف قرار دیتا ہے۔ ہماری مُسلمان بہنوں کی دینی کتاب قرآن شریف میں آیا ہے کہ خدا نے امانتِ عقل کو زمین آسمان اور پہاڑوں کے آگے پیش کیا۔ مگر سب نے اسکو لینے سے پہلو تہی کی اور ڈر گئے مگر انسان نے اس کو قبول کیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وُہ بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی نادان تھا۔ عقل کے قبول کرتے [illegible] ہزاروں فرائض لاکھوں بکھیڑے کروڑوں مخمصے۔ انسان پر پڑ گئے۔ جانوروں کی طرح صرف زندہ رہنا اپنی ضروریات مہیا کر لینا اور اپنا پیٹ پالنا ہی اس کا فرض نہ رہا۔ بلکہ اپنے ہمجنسوں کے فرائض انکے ناموس کا پاس انکے بہبود کی کوشش سب اس پر فرض ہوا۔ غرض اس چند روزہ زندگی میں فرائض کا بڑا بھاری ہجوم اس کے واسطے ہو گیا اور زندہ رہنا اور دُنیا

ہاں ایک آپ کا سوال یہ بھی ہے کہ ابن سعد خولی شمر سنان بن انس حُر مسلم عوسجہ عنتر مرحب کون تھے۔ یہ بھی تنقید کرنے والے کو بتانا چاہئے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ علم رجال سے حل ہو جائیگا اور اگر ایک مرتبہ ہم کسی جاہل کو بتا بھی دیں تو پھر بھول جائیگا۔ اب رہے اہل علم۔ انکی پیش نظر کتب علم رجال و انساب ہیں وُہ دیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں جناب واسطی جناب رشید مدظلہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور انکو یادگار جناب نفیس تحریر فرماتے ہیں۔ یاللعجب آپ اپنے ہمعصروں کا حال نہیں جانتے اور سیکڑوں برس گذشتہ کے اسمار کی تحقیق میں اتنی کوشش۔

سُنئے یادگار جناب نفیس :۔ برادر مکرم دُولہا صاحب ہو سکتے ہیں یا اخی معظم میر علی محمد صاحب عارف کو یادگار نفیس کہنا چاہئے۔ ہاں البتہ انیس کے نواسے ہونے کی وجہ سے۔ مخدوم و مکرم رشید صاحب یادگار کہے جاسکتے ہیں۔ بہرکیف یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اصل مقصد یہ ہے کہ جناب واسطی جناب رشید مدظلہ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ میر انیس کے تمام کلام پر تنقید لکھ ڈالئے اور تنقید میں ان مطالب کو پیش نظر رکھئے۔ لوازم شاعری تخیل امنیی۔ فنون سپہگری علم رجال علم انساب تشریح آلات حرب و ضرب۔ تفصیل اقسام اسلحہ توضیح غزوات جناب رسالت مآب صلعم فہرست اسمار مجاہدین و انصار شمار افواج کفار نقشہ میدان کربلا وغیرہ وغیرہ [illegible] رہ نہ جائے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم میرے مخدوم کی عمر میں پچاس سال اس کام کے لئے اور عنایت فرمائیے کہ وُہ اپنے فرائض حصول معاش یعنی مرثیہ گوئی کو چھوڑکر ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ مگر خوف یہ ہے کہ اسکو بھی لوگ نقش رابع کہکر خاموش ہو جائینگے +

سید مہدی حسن احسن لکھنوی

فہرست
وغیرہ وغیرہ کو

غریب کیا جواب دے سکتے ہیں۔ کسی کام کا اہل ہونا اور بات ہے اور کسی کام کو عموماً
اختیار کرنا اس کے کچھ اور معنی ہیں۔

ایک مقام پر فاضل مضمون نگار صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"دو برس ہوئے کہ راقم کو ایک لکھنوی ذاکر کی عزت میزبانی نصیب ہوئی۔ خاندان
میر صاحب سے تعلق تلمذ بیان کرتے تھے۔ مرثیوں کے چیدہ چیدہ بند سنانے لگے
پھیلا سروہی کھانڈا وغیرہ الفاظ جو آئے تو ایک صاحب پوچھ بیٹھے کہ حضرت
پھیلا سروہی اور کھانڈا میں کیا فرق ہے؟

تیور بدل کر فرمایا کہ یہ بال کی کھال نکالنا بر قصابوں کی طرح کچھ پنجابیوں ہی کو خوب
آتا ہے۔ اُنہوں نے پھر پوچھا کہ حضور! یہ اُپی ہوئی کیا؟ بڑی سنجیدگی سے جواب دیا
کہ یہی اُپی ہوئی"۔

مرثیہ خواں صاحب کے جواب سے اُنکی تہذیب بتا رہی ہے کہ وُہ کس درجہ کے
مرثیہ خواں تھے مگر مرثیہ خواں سے زیادہ میں سوال کرنے والے کی حالت پر افسوس کرتا
ہوں کہ وُہ (پھیلا) بھی نوع اسلحہ سے سمجھے۔ کھانڈا یہ بھدا لفظ مجھے یقین نہیں
آتا کہ میر انیس کے کلام میں کہیں ہو ایک مقام پر حضرت و آسی میر انیس کے نقادوں
سے فرمایش کرتے ہیں کہ میر صاحب کے کلام میں جا بجا تلمیحاً احد خندق خیبر
بدر صفین وغیرہ کا ذکر آگیا ہے۔ نقاد کو یہ بھی بتانا چاہیئے کہ یہ مقامات کہاں
ہیں اور کس سنہ میں ان مقامات پر غزوات واقع ہوئے۔

یہ مقامات کہاں ہیں۔ اسکو جغرافیہ بتائیگا اور کون کون لڑائی کس سنہ
میں ہوئی۔ اس مسئلہ کو تاریخ حل کریگی۔ پھر آپ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ
کمان چلّہ گوشہ وغیرہ سے لوگ ناواقف ہیں۔ تیر اور خدنگ سوفار پیکان ناوک
کسے کہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

مرثیہ تو مرثیہ ہے جب علمائے دین سیکڑوں حدیثوں کو وضعی اور اختراعی قرار دے رہے ہیں اور آجتک اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا تو مرثیہ خوانوں نے اپنے فائدہ کے لئے اگر ایسے تصرفات کئے تو اصلی چیز پر کیا الزام آسکتا ہے۔ جو لوگ تحقیق سے کام لیں اُنکو میر انیس کے صحیح مرثیے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ اب رہی کتابت رسم الخط یا خواندگی کی غلطی اس کا مسئلہ بھی کاتب اور خواندہ کے سر تھوپا جائیگا مصنفین اس الزام سے ہمیشہ بری ہیں آتی احتیاطیں تو آج تک نہ کسی سے ہوسکیں اور نہ آیندہ ہوسکتی ہیں۔

یہی فقرہ جناب واسطی تحریر فرماتے ہیں کہ "میر صاحب کے عزیزوں نے اُن مرثیوں کو اس طرح چھپالیا جیسے چوری کا مال"۔ میرے نزدیک یہ غلط فہمی ہے بلکہ اس طرح چھپالیا جیسے کوئی شخص بیش قیمت جواہر کو چوروں سے چھپاتا ہے۔ پھر بھی اگر چور کبھی اتفاق سے کامیاب ہوگئے تو بجائے ایک بیش قیمت ہیرے کے کہیں کانچ کا نگینہ لگا دیا اور کہیں پتھر کا ٹکڑا نصب کر دیا جس سے آج مخالفین کو اعتراضوں کا موقع ملا۔ میر صاحب کے خاندان سے جو مرثیہ تقسیم ہوا وہ صحیح نکلا اس کے بعد ایک دوسرے سے سیکڑوں نقلیں اُتارتے ہیں۔ رفتہ رفتہ غلطیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اُن غلطیوں کا صحیح کرنا خاندان میر انیس کا کام نہ تھا اور نہ یہ امر ممکن تھا کہ سیکڑوں مرثیے تلاش کرکے اُنکی تصحیح کی جاتی۔

دوسری یہ بات کہ بہت سے مرثیہ خوان اس قسم کے ہیں کہ جو سال بھر حجامت بناتے ہیں یا تار کشی کر[illegible] فتوح حاصل کرنے کے لئے نخاس سے دو دو پیسے والے چھپے ہوئے [illegible] مول لیکر نہایت شان و شوکت سے شہر کے باہر نکلتے ہیں اور اپنے آپ کو ارشد تلامذہ انیس و نفیس ظاہر کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو معزز حضرات کو اُن کی میزبانی کا شرف کیونکر حاصل ہو اور ان کو فائدہ کیونکر پہنچے۔ اب اگر ایسے لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ اپنی ہوئی کسے کہتے ہیں تو وہ

[illegible]

آپ نے اپنے دل میں طے کرلیا کہ اُو ہنہ ایک عالم کی تصنیف کے مقابل میں احسن نے کیا لکھا ہوگا اور اشہری مرحوم نے کیا توپ داغی ہوگی۔ مجھے خود اسبات کا اقرار ہے کہ میرے مخدوم علامہ شبلی علمی دُنیا میں ایک قابلِ قدر شخص ہیں مگر نفسِ معاملہ سے اغماض کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ اشہری مرحوم کی حیاتِ انیس میں صداقتِ واقعات سے مجھے انکار ہے تاہم اُنکی کتاب میں جس قدر محاسن ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں اُن کی مدح سرائی کی ہے۔ اسی طرح ان تینوں کتابوں پر کافی نظر ڈال کر ہر ایک کی مخصوصات کا تذکرہ اگر آپ فرماتے تو ایک غریب کم علم بھی آپ کی رائے کا منت پذیر ہوتا۔ آپنے اولیت کا سہرا علامہ شبلی کے سر پر باندھا مگر اولویت کا اِنعام دینے میں سب سے زیادہ آپ نے بیدردی اور کم توجہی فرمائی۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون کو ملاحظہ کرنے کے بعد آپ حیاتِ انیس اور واقعاتِ انیس پر دوبارہ نظر ڈالینگے اور انشاء اللہ اپنے مضمون مندرجہ رسالہ مخزن کا موضوع آپ واقعاتِ انیس میں پائینگے کیونکہ تنقید کا حصہ واقعاتِ انیس کے لئے مخصوص ہے۔ اب رہا یہ امر کہ میر انیس کے مرثیے جائداد کی طرح تقسیم ہوگئے تو اس میں شک ہی کیا ہے۔ خاندان انیس کی معاش کا مدارجب مرثیہ خوانی پر ہے تو مرثیوں کو اُنکی جائداد کہنا نہایت درست ہے۔ اُنکا حق تھا اُنھوں نے لیا اور قبضہ کرلیا کیونکہ اُن مرثیوں سے اُنکو اپنی مالی منفعت اور ترقی خاندان کی اُمید تھی۔ وہ وارث تھے۔ میراث کے مستحق تھے۔ [illegible] ہیں کوئی مقامِ استعجاب و اعتراض نہیں اور نہ کوئی حق تلفی کہہ سکتا ہے۔ [illegible] بندوں کی بابت میرا یہ جواب ہے کہ پیشہ ور مرثیہ خوانوں نے اپنی ضرورت کے لئے ان بزرگوں کے کلام میں تصرف کیا۔ دیہاتی اور قصباتی لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے کسی نئے مرثیے کا مطلع پرانے میں داخل کردیا۔ کسی کے بند کسی میں ملائے۔ کسی کی جنگ کسی میں داخل کی اور مالی فائدہ اُٹھایا یہ محض اُنکی ابلہ فریبیاں ہیں۔ اس فعل کا اثر میر صاحب یا اُنکے خاندان پر کیا پڑ سکتا ہے

مستحق سمجھے تو بعض الحاقی بندوں کی

کا ایک صحیح نسخہ تو تیار کر دیتے اِس بے دردی مُردہ دلی بے حسی اور بے پروائی کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا بلکہ یہاں تک تخل ختیار کیا کہ میر صاحب کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرثیے بھی مرحوم کے گھرانے والوں نے آپس میں اس طرح تقسیم کر لیئے جیسے جائداد اور انہیں اس طرح چھپا لیا جیسے چوری کا مال۔ اکثر متداول اور مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند الحاقی بیان کئے جاتے ہیں۔ رسم الخط اور کتابت کی غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ نا قدری اور بے توجہی پر غصہ اور افسوس آتا ہے"۔

جناب واسطی کو یہ تو معلوم ہے کہ میر انیس کے متعلق مختلف مضامین کے علاوہ تین مبسوط کتابیں تین سال کے اندر چھپ کر شائع ہوگئیں اور اپنے اپنے طور پر مقبولیت حاصل کر چکیں مگر دنیا میں اقتدار پرستی اور وجاہت پسندی کی ہوا ایسی تیز چل رہی ہے کہ انصاف کے پھول پامال ہوتے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کی تصنیف کی بابت حضرت واسطی اس طرح مدح سرائی فرماتے ہیں:- "علامہ شبلیؒ آپ جگ جگ جئیں۔ آپ کی کوششوں کو چار چاند لگیں کہ آپ نے میر صاحب کے کلام کو اصولی نظر سے ملاحظہ فرمایا۔ موازنہ انیس و دبیر کو میں آپ کے اولیات میں سے سمجھتا ہوں آپ وُہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے زمانہ حال کے اصول تنقید کے موافق میر صاحب کے کلام پر ریویو لکھا"۔ خیال فرمایئے اور انصاف کیجئے کہ جب آپ علامہ شبلی کی بابت جوش عقیدت میں ایسی رطب [illegible] انیس او غریب احسن اور مرحوم شہری کی تالیف کو نقش ثانی اور ثالث بنا کر خاموش [illegible] تو ہم جیسے بے سواد کم علم اہل قلم کا حوصلہ پست ہو جائے یا نہیں۔ جب ہماری محنت اس طرح خاک میں ملائی جائے تو دوسرے اہل قلم کو بمقابل ان شمس العلماؤں کے دنیا میں کچھ کام کرنے کا حوصلہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ شبلی کی تالیف کو جوش عقیدت اور اقتدار پرستی کی وجہ سے آپ نے بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا اور واقعات انیس اور حیات انیس کا نام سُنکر

طلب الیٰ فرمائیں
خاموش ہوجاتے تو

تعمق اور ذوق ہوتا تو انکو معلوم ہو جاتا کہ میر انیس کے کلام اور میر انیس کی شہرت کس میرسی کی حالت میں نہیں اور ہندوستان کا کوئی شاعر یا اہل کمال میر انیس کی شہرت کے قریب ابھی تک نہیں پہنچا اور نہ سو پچاس سال کی دوڑ میں پہنچ سکتا ہے۔

قطع نظر اسکے مشرقی دُنیا میں ابھی تک وُہ طریقہ ہی جاری نہیں کہ جس ذریعہ سے اہل کمال کی شہرت غیر مُلکوں کے باشندوں تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ جو کچھ بات میر انیس کو حاصل ہُوئی یا محض تائید آسمانی یا تاثیر فلسفۂ شاعری سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان میں اُردو لٹریچر کی ترقی کا زمانہ دیکھتے ہُوئے لندن کے لٹریچر سے مقابلہ کرنا کیسی غلطی کی بات ہے جس قوم کو اپنی زبان کی درستی اور اُسکو اعلیٰ پیمانہ پر لانے میں صدیاں گذر گئی ہُوں۔ اس کے مقابل میں اُردو کے طلوُع ہونیوالے آفتاب نے اپنی ایک منزل بھی طے نہیں کی ہے۔ ایسی حالت میں مغربی اہل کمال اور مشرقی شعرا کا موازنہ کرنا جادۂ تحقیق و انصاف سے انحراف کرنا ہے۔ ہندوستان کے مشاہیر اہل کمال سے قطع نظر کر کے اب مجھے صرف میر انیس کی شہرت کی بابت جناب واسطی کو مطمئن کرنے کی ضرورت ہے۔

سُنیئے ہندوستان کے شہروں میں نصف باشندوں کے گھروں میں میر انیس کا متبرک کلام موجُود ہے۔ ہندوستان کے بچّے اور عورتیں بھی اس مقدس نام سے ناواقف نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ پھر اَور شہرت اور مقبولیت کس چیز کا نام ہے۔ انیس انیس پُرانے خیال والوں کے بستروں میں اور انگریزی تعلیم یافتوں کی میزوں پر موجُود ہیں۔ موجودہ اہل قلم کیسی ہی بے پروائی کریں مگر اس قدرتی شہرت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ فاضل مضمون نگار ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:۔ میر صاحب کی سوانح عمری اور انکے حالات زندگی۔ اُنکے کلام پر تنقید لکھنا تو ایک مہتم بالشان کام تھا اُنکے معتقدین بلکہ اعزّہ اور اقربا سے اتنا نہ ہو سکا کہ مرحوم کے کلیات

میر انیس اور ہم

اس عنوان میں ایک مضمون رسالہ مخزن نومبر سنہ ۱۹۱۰ء میں میری نظر سے گذرا۔ یہ مضمون جناب واسطی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے میر انیس اعلی اللہ مقامہ کو ایک شاعر وہبی مانا ہے اور اُن کی شاعری کی نوعیت کو بہر وجوہ اعلیٰ معیار پر تسلیم کیا ہے لیکن اس رَو میں فاضل نامہ نگار سے جو غلط فہمی واقع ہوئی ہے وُہ مخزن کے ناظرین اور ہندوستان کی پبلک کو غلطی میں ڈالتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کمی کو پُورا کر دیا جائے۔ فاضل مضمون نگار یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اگر یہ بزرگ لندن میں پیدا ہوتے تو اس وقت اُنکے کمال کی چار دانگ عالم میں دھوم ہوتی" مَیں عرض کرتا ہُوں کہ جس طرح مغربی اہلِ کمال کی شہرت ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں عالمگیر ہے اسی طرح اس شاعر فلسفی کی شہرت سات سمندر پار پہنچکر (انسائیکلوپیڈیا) کے صفحاتِ زریں میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب میں ترقی علم و فن کا آفتاب معراجِ کمال پر ہے۔ اور ہندوستان پر جہالت و غفلت کی تاریکی چھائی ہے۔ مگر مورخانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملکوں میں علم و عمل پھیلانے کا زمانہ وہاں کے باشندوں کو تقریباً چار سو سال سے نصیب ہے اور ہند[illegible] مغربی کے آفتاب کی شعاعیں صرف پچاس سال سے نُور افشانی کر رہی ہیں۔ لہذا اس کمی پر نظر ڈالتے ہوئے ہم کو حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھنا پڑتا ہے کہ باوجود عدم اسباب و علل میر انیس کی شہرت کمال کو مقبولیت کے فرشتوں نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ فاضل مضمون نگار نے میر انیس کی شہرت اور مقبولیت پر محض ایک سطحی نظر ڈالی ہے اگر انکی نظر تحقیق میں ذرا

ساتھ تھا۔ اثنائے راہ میں ان فراریوں کو باقلا کے کھیت میں سے گذرنا پڑا۔ مگر اس حکیم نے اس کھیت کو نہ روندنا چاہا۔ اور وہیں کھڑا رہ گیا۔ فوج مظفر نے اُس کو وہیں اپنا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے بہت سے شاگرد سوار معدودے چند کے قتل کر دیئے گئے۔ ان ہی تقیۃ السیف میں اس کا شاگرد اشیتاس باشندہ طرنطینہ تھا کہ جو اپنے وقت کا سب سے بڑا مہندس تھا +

(ترجمہ از عربی) محمد خلیل الرحمٰن

غزل

کوئی عالم میں باوفا ہی نہیں
اب کوئی ہم کو پوچھتا ہی نہیں

کہکے بیت الصنم سے ہم بیٹے
کیا ہمارا کوئی خدا ہی نہیں

دیدنی ہے مرا تحیر بھی
کوئی عالم میں آشنا ہی نہیں

تم سے کہتا ہوں دردِ دل اپنا
کچھ سنا تم نے یا سنا ہی نہیں

کہکے یہ مر گیا مریضِ غم
اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

دل نہیں جب تو کیا جیوں میں جاکر
میری کشتی کا ناخدا ہی نہیں

اے مرا حال پوچھنے والے
زیست کا کوئی آسرا ہی نہیں

تم تھے اور ہم تھے دورِ ساغر تھا
ہائے وہ وقت بھولتا ہی نہیں

چشمِ تر دل میں جس سے طوفاں تھا
وہ تو قطرہ ابھی بہا ہی نہیں

آہ کرتے ہیں کہہ و گردوں سے
[illegible] زا ہی نہیں

جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا
وائے [illegible] یا ہم سے بولتا ہی نہیں

لاکھ دنیا نے کھائے ہیں چکر
اپنے مرکز سے میں ہٹا ہی نہیں

واہ کیا زندگی ہماری تھی
رہ کے دنیا میں کچھ کیا ہی نہیں

اے شبِ ہجر کس سے حال کہوں
کوئی اس وقت جاگتا ہی نہیں

کیا اٹھیں ہم عزیزؔ مقتل سے
فیصلہ تو ابھی ہوا ہی نہیں

اس حکیم کا قول ہے کہ زمین گول ہے ۔ عالم کے درمیان میں واقع ہے ۔ اور ہر طرف آباد ہے ۔ یعنی اگر ایک شخص کے قدم سے لیکر خط کھینچا جائے تو وُہ خط دُوسری طرف کے آدمی کے قدم پر ختم ہوگا ۔ یہی خط اس کرہ کا قطر کہنا چاہئیے۔

بقولِ فیثا غورس جو ہُوا محیطِ زمین ہے وُہ نہایت آہستہ چلتی ہے اور بھاری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دُنیا کے تمام حیوانات میں مرنے کی قابلیت ہے ۔ برخلاف اس کے جو ہُوا محیطِ آسمان ہے وُہ نہایت رقیق ہے اور بہت تیز چلنے والی ۔ اسی وجہ سے جو ذوی الارواح آسمان میں ہیں وُہ غیر فانی ہیں اور اپنے ازلی و ابدی ہونے کی وجہ سے حق رکھتے ہیں کہ اُن کو خُدا کہا جائے ۔ چنانچہ چاند اور سُورج اور تمام ستارے یہی خدا ہیں ۔ کیونکہ وُہ اس رقیق ہُوا اور اس حرارت میں واقع ہیں جسکے اثر سے زوال نہیں ہوسکتا ۔

اس حکیم کی وجہ مَوت میں مختلف اقوال ہیں ۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنے بہت سے شاگرد نکال دیئے جس سے اُن کو سخت غصہ آیا ۔ اور اُنہوں نے اس مکان میں آگ لگا دی جس میں یہ حکیم مقیم تھا ۔ بعض نے لکھا ہے کہ شاہ اقروطیہ نیاط نے اس خوف سے اُس کے گھر میں آگ لگا دی تھی کہ کہیں جمعیت بہم پہنچا کر اس کا تخت و تاج نہ چھین لے ۔ جب فیثاغورس نے ہر طرف شعلے اُٹھتے ہُوئے دیکھے تو اپنے چالیس شاگردوں کو ساتھ لیکر وہاں سے بھاگ نکلا اور ایک ایسے جنگل [illegible] وہاں بھُوکوں مرگیا ۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس جنگل میں باقلا بہت ہوتا [illegible] ۔ مگر اس نے نہ باقلا کھایا نہ کھیتوں کو روندا اور اسی حال میں مرگیا ۔ بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ وقت نے ایک دُوسری قوم پر فوج کشی کی ۔ یہ قوم اس حکیم کی مداح اور صحبت یافتہ تھی ۔ اس لئے فیثاغورس نے ان کا ساتھ دیا ۔ اور جب یہ شکست کھا کر بھاگے تو فیثاغورس بھی اُن کے

جنگل میں پہنچ کر گھیر لیا گیا تھا ۔ مگر

اسی خوشی میں شادی مرگ ہوگیا۔ لیکن حکیم لوئر تھیر نے لکھا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔
یہ حکیم اپنے شاگردوں کی آپس میں دوستی قائم رکھنے میں بہت ساعی رہتا تھا۔ اور اکثر اُن کو بذریعۂ اشارات کے تعلیم دیتا تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم میزان میں پُورے نہ اترو یعنی حدودِ قانون سے نہ گذر جاؤ۔ کہا کرتا تھا جو کچھ تمہیں میسّر ہو اُس کو ایک ہی وقت نہ کھاجاؤ۔ یعنی آئندہ کا خیال رکھو۔
اپنے شاگردوں کو تاکید کر دی تھی کہ ہر شخص سوتے وقت اپنے نفس سے مخاطب ہو کر یہ کہے کہ اے نفس آج تو نے کیا کیا۔ کہاں رہا۔ اور کیا کیا اچھا یا بُرا کام کیا وغیرہ۔ شاگردوں کو حکم تھا کہ اپنا ظاہر حال اصل حال سے موافق رکھیں۔ خوشی و رنج کا اظہار نہ کریں۔ والدین کے ساتھ نیکی کرتے رہیں۔ ورزش کریں تاکہ بہت موٹے نہ ہو جائیں۔ اپنے استادوں کا ادب کریں۔ اور اپنی عمر بے سفر میں ضائع نہ کریں۔ عبادتِ الٰہی کی سخت تاکید رکھتا تھا۔
اس حکیم کا ایک تاتاری غلام زاموکلینر نامی تھا جس نے اپنے آقا سے تمام علوم سیکھے تھے اور اس کے قواعد معارف معلوم کئے تھے۔ جب وہ اپنے وطن میں واپس گیا تو تاتاریوں نے اس کا بڑا احترام کیا۔ اس کے لئے قربانیاں کیں اور اس کو بڑے آدمیوں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔
فیثاغورس کا خیال تھا کہ تمام اشیا کی اصل ایک ہی ہے۔ اُسی سے اعداد نکلتے ہیں۔ اُسی سے نقطے۔ نقطوں سے خطوط۔ خطوط سے سطوح۔ سطوح سے اجسام اور اجسام سے عناصر اربعہ یعنی آب۔ آتش۔ ہوا۔ خاک۔ جس سے عالم بنا ہے۔ جو ہمیشہ تحلیل اور متغیر ہوتا رہتا ہے۔ ایک چیز دُوسرے میں جا ملتی ہے۔ جواہر عالم میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ جو کچھ تبدیلی نظر آتی ہے وُہ محض تغیر ہے۔

کی اصل ایک
سے خطوط۔
آتش

فیثاغورس کہا کرتا تھا کہ لوگ بحالتِ حیاتِ دُنیا اُن لوگوں کی طرح ہیں جو کسی میلے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض تو آئے اور سَیر کر کے چلے گئے۔ بعض نے خرید فروخت کی۔ بعض نے اپنے جدال و قتال سے لوگوں کو سیر دکھائی۔ بعض محض اسیر فخر ہیں اور بعض بندۂ حرص۔ بہت کم ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہا کرتا تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے لئے کسی چیز کی خواہش یا دُعا نہ کرے کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے لئے کونسا امر مناسب ہے اور کونسا نہیں۔

فیثاغورس کہتا تھا کہ انسان کی عمر کے چار مساوی حصے ہیں۔ بیس برس کی عمر تک وہ بچہ رہتا ہے۔ چالیس برس کی عمر تک جوان۔ ساٹھ تک مرد جوان اسی تک بوڑھا۔ اس کے بعد جو عمر گذرے وُہ زندگی میں شمار نہیں ہے بلکہ وبالِ جان ہے۔

اس حکیم کو علم ہندسہ و ہیئت کا بڑا شوق تھا۔ اسی نے یہ بات معلوم کی ہے کہ جو ستارہ بعض وقت صبح کو نکلتا ہے وُہی ستارہ بعض وقت شام کو نکلا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اسی نے اسکو ثابت کیا ہے کہ مثلث قائم الزاویہ کے وتر کا مربع باقی دونوں ضلعوں کے مربع کے مجموعہ کے برابر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب فیثاغورس نے مسئلہ [illegible] ثابت کیا تو اس کو بے انتہا خوشی ہُوئی۔ یہاں تک اسکو الہام الٰہی سمجھا۔ اور [illegible] کیا کہ سَو گائیں برائے اظہار شکر قربانی کرے۔ اگرچہ یہ امر تمام کتابوں میں درج ہے۔ لیکن جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ وُہ ذوی الارواح کی قربانی جائز نہیں رکھتا تھا تو قابلِ اعتبار نہیں رہتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح اُسکے متبع آٹے اور شہد کی گائے اور بکری بنا کر قربانی کرتے ہیں اُس نے بھی کر دی ہو تو ممکن ہے۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو

مسئلہ ثابت کیا
اور خو الہ ارادہ کیا کہ سچ مچ
کی قربانی

پھر تہ خانہ میں گھس کر اندر سے قفل لگا لیا ۔ اور ایک سال برابر باہر نہ نکلا ۔ اور جب نکلا تو نہایت نحیف و لاغر ۔ ژولیدہ مو ۔ پریشان رُو تھا ۔ اور لوگوں کو جمع کر کے کہنے لگا کہ میں دوزخ کی سیر کے لئے گیا تھا ۔ اور اپنی تصدیق کے لئے اُس یادداشت کے رُو سے جو اُس کی ماں نے اُس کے واسطے تیار کر رکھی تھی وُہ تمام واقعات بیان کر دیئے جو اُسکی غیر حاضری میں گذرے تھے ۔ چنانچہ لوگ اسکو معمولی انسانوں سے کچھ زیادہ سمجھنے لگے ۔

ایک روز فیثا غورث معمولی سالانہ کھیلوں میں شامل تھا کہ اُس نے ایک آواز ماری جسکو سُن کر ایک گدھ اُڑتا ہوا اُتر آیا ۔ جسکو دیکھکر لوگ حیران رہ گئے ۔ یہ بھی فیثا غورث کا ایک کرشمہ تھا ۔ اصل یہ ہے کہ وُہ ایک گدھ کو پوشیدہ طور پر اس کی مشق کرا چکا تھا کہ اس کی وُہی خاص آواز سُن کر اُتر آیا کرتا تھا ۔ اُس نے اپنا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لئے ایک یہ بھی ترکیب کر رکھی تھی کہ اپنے گھٹنے سے اوپر ایک ران سونے کی بنوا رکھی تھی ۔

بُتوں کے سامنے وُہ ہمیشہ آٹے یا گیہوں کی قربانی چڑھایا کرتا تھا ۔ اور کہتا تھا کہ ذی الارواح کی قربانی بُتوں کی گستاخی ہے ۔ کیونکہ وُہ ایسی قربانیوں سے سخت ناراض ہوتے ہیں ۔

فیثا غورث کے اصول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ شکم سیری کو کسی قدر کم کھانے پر ترجیح دیتا تھا ۔ تا کہ صحت قائم رہ سکے اور غور و فکر میں بندۂ شکم ہونا مانع نہ آ سکے ۔ اور عقل کو اپنے کام میں لگنے کا موقع مل سکے [illegible] وہ دوسروں سے کرانا چاہتا تھا ۔ پہلے اس کی مثال اپنی ذات پر قائم کرتا تھا ۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اُس نے پانی ہی پر کئی کئی دن گذار دیئے ہیں ۔ اور اگر غذا کھائی ہے تو بہت تھوڑے سے دانے یا شہد یا میوے یا کوئی ترکاری ۔ باقلہ وُہ کبھی نہ کھاتا تھا ۔ نہ اس کے چھوڑنے کی کوئی وجہ کسی کو معلوم تھی ۔

واقعات کو یاد رکھ سکوں۔ چنانچہ اُسوقت سے مجھے وُہ علم حاصل ہوگیا۔ جو کچھ وہاں میں واقع ہوتا ہے۔ وُہ مجھے معلوم ہے اور نیز میری پچھلی زندگیوں کے حالات مجھے پُوری طرح یاد ہیں۔ غرض ایثالیدیں کے قالب سے نکلکر میں اوفوربہ کے قالب میں آیا۔ جنگ تروادہ میں موجود تھا اور ایک شخص مینلاس نامی کے ہاتھ سے میں نے زخم شدید کھایا۔ اس کے بعد میں ہرموتیموس کے قالب میں آیا۔ اور اس حالت میں میں نے اس عطیہ کو ثابت کرنا چاہا جو مجھے عطارد سے حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ میں شہر ابرانخید میں جاکر ہیکل اپولون میں گیا اور وہاں میں نے وُہ سپر دیکھی۔ جو مینلاس نے اپنے مقابل سے بحالت جنگ چھینی تھی اور اپنی فتح کی یادگار میں اس ہیکل کو نذر کردی تھی۔ ہرموتیموس کے قالب سے نکل کر میں ایک چڑی مار کے جسم میں آیا اور اُس سے جدا ہوکر اس جسم فیثاغورسی میں ابت ناسخ میں میں اُس زندگی کو شمار نہیں کرتا ہوں کہ جو بقالب مُرغ وطاؤس میں نے گذاری ہے۔"

اسی ضمن میں فیثاغورس نے یہ بھی بیان کیا کہ جب میں میدانِ جہنم کی سیر کر رہا تھا تو اس وقت میں نے دیکھا کہ ہزیودس شاعر کی رُوح ایک ستون سے بندھی ہُوئی ہے اور اُس کے گلے میں طوق پڑے ہُوئے ہیں۔ اور وُہ سخت تشددیں اُٹھا رہی ہے۔ پھر ہومیرس شاعر کی رُوح کو دیکھا کہ وُہ ایک درخت پر ٹنگی ہُوئی ہے اور ہر طرف سانپ اُسکو لپیٹے ہوئے ہیں۔ یہ اُن جھوٹ[illegible] کی سزا ہے کہ جو بتوں کی شان میں کہے تھے۔ اسی میدان میں میں نے [illegible] کی رُوحوں کو سخت ترین عذاب میں دیکھا کہ جو اپنی عورتوں سے اچھی طرح پیش نہ آتے تھے اور اُنکو بُرا سمجھتے تھے۔

کہتے ہیں کہ فیثاغورس نے اپنے لئے ایک تہ خانہ بنوایا۔ اور اس میں داخل ہونے سے پہلے اپنی والدہ سے عہد لے لیا کہ جب تک میں اس تہ خانہ سے نہ نکلوں جو کچھ میرے پیچھے شہر بھر میں واقعات گذریں نہایت تحقیق کے ساتھ اُنکو قلمبند کرتی ہے۔

اُن جھوٹوں نے اُن لوگوں کی بیسنس

کرنے یا پاس بیٹھنے کا موقعہ مل جاتا تھا وہ اپنے آپ کو سعید ترین انسان سمجھتا تھا۔
فیثاغورس نے لوگوں کی درخواست پر ہر فرقہ کے لئے الگ الگ قوانین بنا دئے تھے۔ اس حکیم کا احترام اس درجہ تک لوگوں کے دلوں میں بڑھ گیا تھا کہ عوام الناس اپنے بتوں کی طرح اس کی بھی قسم کھایا کرتے تھے۔ اس کا قول تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے اوپر اس درجہ جبر کرے کہ وہ ایسا صاحبِ کمال ہو جائے کہ لوگ اس کا نام سنتے ہی اس کے کمال ہونے کی تصدیق کریں۔

فیثاغورس کا خیال تھا کہ اس عالم کو روح وادراک حاصل ہے۔ اسی روح سے اور بہت سی ارواح نکلتی ہیں۔ جو تمام آدمیوں اور حیوانات میں منقسم ہیں۔

فیثاغورس کا خیال تھا کہ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک جسم سے نکل کر بذریعہ ہوا کے دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے خواہ کوئی جسم اس کو ملجائے۔ مثلاً ممکن ہے کہ کسی انسان کی روح نکل کر کسی گھوڑے۔ بھیڑئیے۔ گدھے۔ مرغ یا مچھلی یا کسی اور کے جسم میں داخل ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کی روح انسان ہی میں اور حیوان کی حیوان ہی میں داخل ہو۔ بلکہ روح کو جو جسم ملجائیگا اُسی میں داخل ہو جائیگی۔ یہی وجہ تھی کہ فیثاغورس جانوروں کے کھانے سے منع کرتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کا یہ خیال تھا کہ ایک مکھی یا بھڑ کے مار ڈالنے کا اُتنا ہی گناہ ہے جتنا کہ ایک آدمی کے قتل کر دینے کا۔ کیونکہ تمام ارواح ایک ہیں اور وُہی تمام حیوانات میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

جب فیثاغورس نے ارادہ کیا کہ اپ[illegible] سے تناسخ ارواح تسلیم کرائے تو اس نے اُن سے بیان کیا کہ میں عطارد (دیوتائے [illegible]تانِ یونان) کا بیٹا ہوں۔ اور سب سے پہلے ایثالیدس کے قالب میں تھا۔ عطارد نے مجھ سے کہا تھا کہ بقاءِ دوام کے سوا جو کچھ تم مجھ سے طلب کرو۔ میں تمہیں عطا کر دوں۔ میں نے اُس سے ایسی قوت مانگی کہ جس کے ذریعہ سے میں دُنیا کے تمام حالات اور اپنی پچھلی زندگی کے حالات و

اپنے شاگردوں سے
(دیوتائے زیتابان

کہتے ہیں کہ شہزادہ "نوما" بھی ان ہی لوگوں میں ایک تھا کہ جو شہر اقروطون میں فیثا غورس کی ملازمت میں رہا اور اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے اُس کی خدمت وصُحبت نہ چھوڑی - لیکن تحقیق یہ ہے کہ شاہ نوما حکیم فیثا غورس سے بہت پہلے ہو گذرا تھا - یہ بات ضرور تھی کہ اس بادشاہ کی رائے کو یہ حکیم بہت ہی پسند کرتا تھا -

حکیم فیثا غورس کا قول تھا کہ ایک دوست کی چیز گویا تمام دوستوں کا مال ہی - دوستی تمام دوستوں کے درمیان میں رشتہ مساوات پیدا کرتی ہے - یہی وجہ تھی کہ اس کے تمام شاگرد یک جان وچندیں قالب تھے - کوئی چیز کسی خاص شخص کے لئے مخصوص نہ تھی - بلکہ ایک کی چیز سب کے استعمال میں آتی تھی - حتّٰی کہ نقدی کا بھی یہی حال تھا -

فیثا غورس کا ہر ایک شاگرد پانچ برس اُس کے پاس رہتا تھا - پہلے سال وُہ اپنے معلّم کے اصُول کو صرف سُنا کرتا تھا - اس کی یہ مجال نہ تھی کہ کسی معاملہ میں لب کشائی کرجائے - اس امتحان طویل اور اس شدّت کو برداشت کرنے کے بعد اسکو اجازت ہوتی تھی کہ وُہ کلام کرسکے اور فیثا غورس سے مل سکے یا بات کرسکے -

فیثا غورس نہایت صاحبِ رُعب وداب - معتدل القامت حسین صُورت شخص تھا ہمیشہ پاک وصاف سفید صوف کے کپڑے پہنتا تھا - حظوظِ نفس کی طرف کبھی مائل نہ ہوتا تھا - اگر کوئی اپنا راز اس کو بتلا دیتا تو وُہ اُس کو کبھی ظاہر نہ کرتا تھا - کسی شخص نے اس کو کبھی ہنستے - مذاق کرتے [illegible] بات زبان سے نکالتے نہ سنا - غیظ وغضب میں بھی کبھی کسی کو ملامت نہ کرتا تھا - اپنے غلاموں کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ مارتا تھا ان ہی صفات سے اُس کے شاگرد اس کی الوہیت کے قائل ہو گئے تھے - تمام ملک سے لوگ اس کے پاس فوج در فوج آتے تھے - اور اس کے حلقہ درس میں بیٹھکر اس کی باتیں سُنتے اور ان پر غور کرتے تھے - جس شخص کو اُس سے باتیں

کرتے یا فضول
کرتا ہوا

اپنے شاگرد سے بہت محبت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ فیرسیدس بیمار ہوا۔ حکیم فیثاغورس اس کی عیادت کے لئے گیا تو اُستاد نے شاگرد کو آتے دیکھکر اس خوف سے کہ کہیں میرا مرض متعدی نہ ہو اور فیثاغورس اس میں مُبتلا نہ ہو جائے فوراً دروازہ بند کرا دیا اور اپنی انگلیاں دروازے کے سُوراخ میں سے نکال کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ لو ان کو دیکھکر سمجھ جاؤ کہ میں کتنا نحیف و زار ہو گیا ہوں۔

فیرسیدس کے مرنیکے کئی سال بعد تک فیثاغورس وہیں رہا۔ اور اس زمانہ میں ہرمودامنط سے بہت ربط و ضبط رکھا۔ آخر شوقِ تعلّم و سیاحت نے اسکو ترکِ وطن پر مائل کیا۔ اپنا تمام اثاثہ فروخت کر کے وطن سے چل پڑا۔ ایک مدّت طویل مصر میں رہا اور بہت سے قسیسوں سے ملا اور اُنکے دین کی خفیہ رموز سیکھے۔ اسی زمانہ میں اُس کے بادشاہ بولیقراط نے امزیس بادشاہِ مصر کو اس حکیم کے عزّت و احترام کرنے کو لکھا۔ اس کے بعد فیثاغورس کلدانیوں کے مُلک میں اس غرض سے گیا کہ وہاں مجوسیوں کا علم سیکھے۔ پھر بلادِ مشرق میں پھرتا پھراتا مملکت اکریطہ میں پہنچا اور حکیم ابمینیدس سے مل کر دوستی پیدا کی۔ اور وہاں سے پھر اپنے وطن جزیرہ ساموس چلا گیا۔ یہاں آکر اُس نے دیکھا کہ اُس کے اہلِ وطن پر زیرِ حکم بولیقراط سخت ظلم و تعدی ہو رہا ہے۔ جس سے اُس کو سخت رنج ہوا۔ مگر سوا اس کے اور کچھ نہ بن پڑا کہ اُس نے خود ہمیشہ کے واسطے ترکِ وطن کر دیا اور ملک اٹلی کے شہر باترو[illegible] درمیلون کے مکان پر فروکش ہوا۔ اور یہیں بیٹھکر اُس نے تعلیم و تعلّم کا وہ سلسلہ جاری کیا کہ جس نے اسکو فلاسفہ اٹلی کا اُستاد الکل بنا دیا۔ چند ہی روز میں اسکا شہرہ تمام ملک اٹلی میں پھیل گیا۔ اور شاگردوں کی وہ کثرت ہوئی کہ تین سو سے زیادہ تعداد پہنچ گئی۔ ایک فرقہ ہی الگ بنگیا۔ جو ملک میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

سن [illegible] کروطون میں گیا

حکیم فیثاغورس

(سلسلۂ تاریخ الحکما)

حکیم فیثاغورس قریب ختم اولمپیاد سنہ ۶۰ء میں ظاہر ہوا اور سنہ ۶۲ء اولمپیاد میں ایطالیہ (اٹلی) کو چلا گیا۔ اور اسّی (بقولے نوّے) سال کی عمر میں اپنے ملک بقا ہو گیا۔

ملکِ اٹلی میں ایک فرقہ فلاسفہ یونیا کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اسی حکیم کے متبع ہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ یونان میں طالیس اور اٹلی میں فیثاغورس فلاسفہ کے استاد الکل ہیں۔

ارستیب غرفیانی نے لکھا ہے کہ اس حکیم کو فیثاغورس اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ اکثر اپنی قوتِ کہانت کے باعث غیب کی باتیں بتلایا کرتا تھا۔ اور آخر وہ باتیں اسی طرح واقع ہوتی تھیں جس طرح وہ بیان کرتا تھا۔

اسی حکیم نے سب سے پہلے بلحاظِ تواضع یا کسر نفسی اپنے آپ کو حکیم نہیں کہلایا بلکہ فلسفی کا لقب اختیار کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ یہ حکیم جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام امینسارک نقاش تھا۔ لیکن بعض محققین کا قول ہے کہ وہ طوسکا کا رہنے والا تھا اور [illegible] سے ایک چھوٹے سے جزیرہ میں پیدا ہوا تھا۔

فیثاغورس اپنے باپ کا ہنر نقاشی خوب جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے تین سونے کے پیالے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نقش و نگار کر کے مصر کے تین مشہور قسیسوں کو تحفہ میں بھیجے تھے۔

اس حکیم کو اپنے معلمِ اول فیرسید سے بے انتہا محبت تھی۔ اور استاد بھی

نہیں ہے۔ جواب دیکھکر اطمینان کرلیتا۔ مگر اس تحریر کو صحیح مانکر اتنا ضرور ہے کہ قولِ اوّل جناب شمس العلماً اس صورت میں معارض قولِ ثانی ہے۔ اس لئے کہ بلینک ورس کو نظمِ غیر مقفٰے بھی فرماتے ہیں اور پھر قید قافیہ بھی نظم ہی کے لئے ضروری ارشاد کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو اُسے شعر غیر مقفٰے کہنا چاہئے تھا۔

اگرچہ میں صاحبِ مذاق بزرگ نہیں اور نہ مثل مولانا حالی اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن جناب احسن نے نوٹ میں تحریر فرمایا تھا کہ (اگر مولانا حالی خود اس باب میں تحریر فرمائیں تو کیا کہنا ورنہ امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صاحبِ مذاق بزرگ اس مغالطے اور معمے کو ضرور حل فرمائینگے) میں نے اپنے آپ کو صرف کوئی نہ کوئی میں سمجھکر خامہ فرسائی کرکے دوسروں کا وقت لیا اور اپنا وقت صرف کیا ہے۔ اگر اس مضمون میں سے کچھ بھی پسندِ اربابِ کمال ہوجائے تو زہے قسمت +

سیّد اولاد حسین شادان بلگرامی

کلیاتِ اسمٰعیل

مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کے کلام کے دلدادہ یہ سُنکر خوش ہونگے کہ اُنکی دلچسپ سلیس اور معنی خیز نظموں کا بیش بہا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ اودی اورینٹل پبلشنگ کمپنی میرٹھ سے مل سکتا ہے۔ چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا ہے اور کاغذ عمدہ لگایا گیا ہے۔ سرورق پر جناب مولانا کی ہاف ٹون عکسی تصویر ہے۔ علاوہ درسی اور قومی نظموں کے مولانا کا دیوان بھی اس کلیات میں شامل ہے اور قابلِ دید ہے۔ کتاب کا حجم ۳۷۵ صفحہ ہے اور قیمت مع جلد صرف دو روپیہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام طور پر مقبول ہوگی +

ایک قول حکما کا بھی ایسا ملتا ہے کہ جس سے نظم و شعر دو جداگانہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ حکما کا قول ہے کہ نسبت تالیفیہ جس چیز میں پائی جاتی ہے باعث انجذاب و اہتزاز نفس ہوتی ہے۔ اور تالیفیہ عبارت ہے نسبت قدر تفاوت میان اوسط و اصغر بقدر تفاوت میان اوسط و اکبر مثل نسبت اصغر باکبر سے۔ اور بہت سے دقائق علوم و اسرار حکمت مبنی بر احکام نسبت ہیں۔ اسی نسبت شریفہ اعتدال کی وجہ سے کہ اجزائے عناصر میں ہے تعلق نفس بدن کے ساتھ پایا جاتا ہے اور جب زوال اس نسبت کا ہو جاتا ہے تو باعث قطع تعلق نفس و بدن ہوتا ہے۔ اور جب یہی نسبت اعضا میں پائی جاتی ہے تو حسن ہے اور اصوات میں پائی جائے تو نغمہ ہے اور کلام میں پائی جائے تو نظم و فصاحت ہے اور حرکات میں پائی جائے تو ناز و ادا ہے اور عناصر میں پائی جائے تو اعتدال مزاج ہے اور نفس میں پائی جائے تو عدالت ہے اور نفس ہر مقام میں عاشق و طالب اس نسبت کا ہے۔

یہ تعریف نظم کی عام تر ہے۔ نظم کی اس تعریف کے بعد شعر کی تعریف چاہے کلام موزون مخیل کہئے یا کلام موزون مخیل مقفٰی۔ بہر صورت نظم و شعر دو جداگانہ چیزیں ہونگی۔ اور مولانا حالی کا نظم و شعر کو دو جداگانہ چیزیں سمجھنا صاف و درست معلوم ہوگا۔

مولوی نجم الغنی صاحب کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی قافیہ کو نظم ہی کے لئے ضروری سمجھتے [illegible] نہ شعر کے لئے۔ اس تحریر میں سہو کاتب و ناقل کو اگر دخل نہیں ہے تو میری رائے اس کے برعکس ہے۔ یعنی نظم کے لئے قافیہ ضروری نہیں اور شعر کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ نظم مقابل نثر ہے۔ نہ شعر۔ پس نظم کو شعر سے عام ہونا چاہئے۔

مقدمہ دیوان جناب حالی دامت فیضہ میرا دیکھا ہوا ہے مگر میرے پاس موجود

جب کی تعریف [illegible] سمجھے ہیں [illegible] تھی

نثر مرجز میں تجویز وزن کر کے اُسے از قسم نظم شمار کرتے ہیں اور شعر میں بھی وزن مانتے ہیں پھر اختلاط تعریف منطق کہاں سے آیا۔

اس میں شک نہیں کہ کسی نے نظم و شعر میں کچھ فرق نہیں کیا ہے مگر بعض امور مقتضی اس بات کے ہیں کہ دونوں میں کچھ فرق ہو۔ مثلاً ایک مصرع بامعنی ہمارے سامنے آئے اُسے شعر اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ شعر میں چھ رکن یا آٹھ رکن ہونا چاہئیں۔ اور ایک مصرع میں تین یا چار ہی رکن ہونگے۔ اور بوجہ وزن نثر بھی نہیں کہہ سکتے۔ پھر آخر اس کا نام کیا رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ کلام منظوم کہیں۔

میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ نظم کو مقابل نثر ایک جنس یا مقسم قرار دیکر یہ تعریف کیجائے۔ کلام موزون مخیل۔ تاکہ تمام اقسام کلام موزون پر صادق آئے حتیٰ کہ فرد اور مصرع پر بھی اور نظم غیر مقفٰی پر بھی۔ اور شعر کو نظم کی نوع یا قسم مانکر یہ تعریف کیجائے۔ کلام موزون مخیل مقفٰی۔ پس گویا تقسیم کلام اس طرح ہو گئی۔ کلام کی دو قسمیں ہیں منثور و منظوم۔

کلام منثور کی تین قسمیں ہیں۔ مرجز و مسجع و عاری۔

اور کلام منظوم کی دو قسمیں ہیں نظم مقفٰی۔ و نظم غیر مقفٰی۔

نظم مقفٰی کی نو قسمیں ہیں۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مخمس۔ مسدس۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔

غیر مقفٰی کی ایک قسم ہے فرد۔ اور اس صنف میں بلینک ورس شامل ہے۔

مولوی نجم الغنی صاحب شعر کے لئے قافیہ کو ضروری بھی فرماتے ہیں اور فرد جو بلا قافیہ اکثروں کے نزدیک ہو اُس کو شعر بھی سمجھتے ہیں۔ جب تعریف شعر کلام موزون مقفٰی مانی گئی تو یہ تعریف فرد پر کیونکر صادق آئیگی۔

قصیدہ

ناظرین غور فرمائیں کہ یہ استدلال میرا اگر صحیح ہے تو میں نے یہ بات بالکل نئی نکالی ہے اور یہ جواب کسی نے آجتک نہیں لکھا ہے۔ عمد و قصد و سہو ادب جتنے جواب دیے جاتے ہیں سب ناکافی ہیں۔ کسی شعر میں جب وزن موجود ہے تو وہ حقیقۃً شعر ہے۔ چاہے عمد و قصد ہو یا نہو۔ اور اسی طرح سہو ادب سے آیت کو شعر نہ کہنا جبکہ وہ شعر ہو۔ شعر ہونے سے خارج نہیں کرتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ناظرین میرے اس مضمون میں بہت سی نئی باتیں پائینگے۔ اور بعض امور غیر حل کو اس میں حل دیکھینگے۔

بعض مصنفین فن عروض نے بالغ نظری سے کام نہ لیکر تعریف شعر میں قید قصد قائل لگا کر شعر بلا قصد کو شعر کو نہیں مانا ہے اور یہ بھی ان کی کم توجہی ہے۔ جب اس میں وزن شعری موجود ہے تو وہ شعر بھی ضرور ہے۔ فرض کرو کہ ایک شعر جو حقیقۃً بلا قصد نظم ہوا ہو اور وہ کسی وقت ہمارے سامنے آئے اور ہم کو کوئی علم قصد یا غیر قصد کا نہ ہو تو باوجود وزن شعر نہ کہا جائیگا تو اور کیا کہا جائیگا میرے نزدیک وہ شعر ضرور ہے مگر اس کا کہنے والا شاعر نہیں۔ اگر پھر بقصد و اختیار خود شعر نہیں کہہ سکتا کہ اسی وجہ سے یہ مقولہ مسلّم ہے۔ مَنْ قَالَ بَيْتَيْنِ فَهُوَ شَاعِرٌ کیونکہ ایک شعر تو بلا قصد ممکن ہے مگر دوسرا شعر اسی ردیف و قافیہ میں بلا قصد ممکن ہی نہیں۔ شعر کسی طرح سے اپنے قواعد پر صحیح اتر جائے۔ وہ شعر ہے مگر شاعر ہونے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت ہے۔ قائل " [illegible] شاعر نہیں۔ محققین فن عروض تعریف شعر میں قید قصد لگاتے ہیں اور [illegible] قافیہ۔ اور یہی تعریف صحیح ہے۔

بلا وقصد [illegible]
نہ قصد قافیہ

فرق نظم و شعر

شمس العلما جناب مولوی حالی صاحب نے تعریف منطق کو مختلط نہیں کیا ہے کیونکہ منطقین کے نزدیک شعر میں وزن کی بھی ضرورت نہیں ہے اور جناب مولوی لیقینا

جو بحر کامل میں ہے اور وزن اُس کا مستفعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن ہے۔ یہ شعر اس وجہ سے نہیں ہے کہ جزو آیت ہے اور بغیر اوّل و آخر کچھ ملائے ہُوئے اس کے معنے ناتمام ہیں۔ چنانچہ شروع اس آیت کا یہ ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ اور آخر اسکا یہ ہے مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔

دُوسری جگہ یہ جزو آیت اٹھائیسویں پارہ آخر سورہ تحریم میں۔

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ   تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ

بحر رمل میں ہے بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن دو بار جبکہ دونوں مصرعوں کی آخری۔ ت کو منون پڑھیں۔ اور اگر ساکن پڑھیں تو وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان ہوگا۔ اور اس آیت کی بھی وہی حالت ہے چنانچہ اس کا اوّل عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ ۔ اور آخر اس کا ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ہے اور بغیر اوّل و آخر ملے ہُوئے آیت سے معنے مستقل و مفید پیدا نہیں ہوتے ۔

او تیسری جگہ یہ جزو آیت پارہ الٓمّ بعد نصف میں ہے ۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ   ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

اس آیت کا بھی تعلق اوّل سے اور آخر سے۔ جب تک انفسکم نہ ملایا جائے بے معنی ہے۔ پس یہ سب آئتیں بھی بوجہ [illegible] ہونے کے کلمات ہیں اور بغیر انضمام بعض الفاظ دیگر معنے تمام نہیں ہوتے۔ اس بنا پر یہ کلام ہی نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ شعر۔ کیونکہ شعر کو کلام موضوع ہونا چاہئے۔ کلام غیر مفید کلام ہی نہیں۔ اور جب معنوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو ہر نثر سے جتنے شعر ہی چاہے نکال لو ۔

ہمارے اولڈ فیشن کے لوگ علم کو منحصر عربی میں سمجھتے ہیں آخر کسی وقت میں معانی بیان وغیرہ علوم کی تدوین نہ تھی اُسکو زبان پر لحاظ اور غور کرکے قواعد بلاغت ایجاد کئے۔ کیا اب یہ ممکن نہیں کہ بلا استمداد عربی کوئی صحیح المذاق قواعدِ بلاغت اُردو میں بھی ایجاد کر سکے اور نئی اصطلاحیں اُردو کے لئے نکالے۔ میرے نزدیک تو فیضانِ الٰہی میں کمی نہیں آئی ہے اور اب بھی موجد ہونا ممکن ہے۔ یہ امور یعنی ایجاد فنون وصنائع نبوت نہیں ہیں۔

آیات نہ نثر مرجز ہیں اور نہ شعر

جن آیات کو جناب مولوی صاحب نے نثر مرجز کہا ہے وُہ نثر مرجز دو وجوہ سے نہیں۔ اوّل تو نثر مرجز میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہُوں اور ان آیات میں وزن بحور موجود ہے۔ دُوسرے اُنکا فقرہ متقابل نہیں ہے جس سے یہ دیکھا جائے کہ الفاظ متقابلہ وزن میں متحد ہیں یا نہیں اور قافیہ پایا جاتا ہے یا نہیں کہ حکم مرجز لگایا جا سکے۔

اور شعر اس وجہ سے نہیں کہ شعر بحر مسدس میں چھ رُکن پر اور بحر مثمن میں آٹھ رکن پر تمام ہوتا ہے۔ اور ان آیات میں ایسا نہیں ہے لہٰذا کوئی آیت بھی ان میں سے شعر نہیں کیونکہ ہر آیت مرتو نہ میں یا تین رکن ہیں یا چار رُکن۔ حاصل یہ کہ مصرعے ضرور کا اطلاق نہیں ہوتا ہے اور یہ سب آیات مصاریع مختلفہ ہیں۔

قرآن شریف میں دو مصرعے ہموزن باعتبار ایک ساتھ برابر برابر کہیں نہیں ہیں ایک جگہ یہ جزو آیت دُوسرے پارہ کے آخر میں موزون ہے۔

يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

شعر نہیں
مصرعے شعر کا

جب زبان میں تغیر ہو جاتا ہے۔ اور تذکیر و تانیث میں زیادہ ہوتا ہے۔ تو ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ قواعد میں ترمیم ہوتی رہے۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ الفاظ عربیہ رائج اردو میں اعتبار قواعد عربی کا کیا جائے اور نہ ایسا کسی زبان میں ہوتا ہے۔ گلاس انگریزی زبان کا لفظ ہماری زبان میں نقل ہو گیا ہم اس کو مذکر بولتے ہیں۔ لیکن انگریزی میں وہ (نیوٹر) ہے یعنی نہ مونث نہ مذکر۔ انگریزی میں مذکر کے لئے (ہی) اور مونث کے لئے (شی) اور نیوٹر کے لئے (اِٹ) ضمائر ہیں۔ اور ہمارے یہاں یہ تیسری قسم ضمیر کی ہے ہی نہیں۔ تو چونکہ گلاس انگریزی سے اردو میں آیا ہے لہٰذا اصل انگریزی کے تتبع کے لئے اب ہم ایک ضمیر (نیوٹر) neuter ایجاد کریں۔

فارسی کے افعال میں تذکیر و تانیث نہیں ہے۔ مگر عرب جو اسمار کہ فارسی سے اپنی زبان میں لے گئے ہیں مثل فیل و نرجس وغیرہ ان اسمار کے ساتھ اپنی قرارداد کے موافق فعل مذکر یا مونث لاتے ہیں۔ اگر اصل کا لحاظ کیا جاتا تو چاہئے تھا کہ عربی میں ایسے افعال بھی ایجاد کرتے کہ وہ نہ مذکر ہوتے اور نہ مونث۔

اسی طرح اردو میں بھی الفاظِ عربیہ کی تذکیر و تانیث بلحاظ روزمرہ اردو ہونا چاہئے۔ عام اس سے کہ موافق عربی ہو یا نہ ہو۔ چونکہ یہ مسئلہ میرے بحث سے خارج ہے لہٰذا زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ افراط و تفریط ہر دو گروہ کے ذکر میں یہ بحث بھی ضمناً آگئی۔ اکثر لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں اور قواعد کو اصل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ زبان کے پابند قواعد ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب قواعد سے احصار نہیں ہو سکتا ہے اور زبان میں اس بنائے ہوئے قاعدہ کے خلاف بھی پایا جاتا ہے تو مجبوراً شاذ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قواعد اصل ہوں تو شواذ غلط ٹھہرینگے۔

سہو
مغالطہ میں پڑے

نوٹ اور مضمون دونوں میں اس امر پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ بلینک ورس نثر مرجز ہے اور اس کا وجود ہمارے یہاں پیشتر سے فارسی میں پایا جاتا ہے۔ اس پہلو پر بحث نہیں کی گئی کہ آیا نظم بلا قافیہ مشرقی لوگوں کو مرغوب ہے یا نہیں۔

زبان پابندِ قواعد نہیں

مولویصاحب یہ بہت صحیح ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک زبان کی تقلید دُوسری زبان میں پُورے طور پر نہیں ہو سکتی ہے۔ گو وُہ زبان اس دُوسری زبان کی تحت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہر زبان کی کچھ خصوصیات خاص ہیں۔ مگر جس قدر کہ ہمارے جدید روشن خیال اشخاص مغربی تقلید کے دلدادہ ہیں اسی قدر سیاسی تعلیم کے فریفتہ اپنی مشرقی تعلیم پر مستبد ہیں۔ چنانچہ جناب آغا رفیق صاحب بلند شہری فصیح الملک نمبر (۱۱) جلد ۴ میں تذکیر و تانیثِ الفاظ عربیہ سے بحث کرتے ہوئے قاعدہ کلیہ عربیہ کُلُّ الجَمعِ مُؤَنَّثٌ کا پابند ہم کو اُردو میں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے علاوہ اُس جمع کے کہ جس کا مفرد مؤنث ہو۔ ہمیں ہر ایسے جمع کو بھی مؤنث ہی بولنا چاہیئے کہ جس کا مفرد مذکر بھی ہو۔ کیونکہ کُلیہ بلا کسی قید کے ہے۔ اس لحاظ سے اوراق۔ اوصاف۔ اوقات بھی مؤنث ہی ہونگے۔ حالانکہ جناب احسن نے فصیح اللغات میں ان جمعوں کو مذکر لکھا ہے۔

جناب والا! زبان قواعد کی پابند نہیں اور قواعد پابندِ زبان ہوتے ہیں۔ زبان قواعد سے مقدم ہے اور قواعد زبان پر بنائے جاتے ہیں۔ پھر کیوں آپ زبان کو قواعد کے تحت میں لاتے ہیں۔ تذکیر و تانیث ہو یا کوئی دُوسری بات متعلق زبان ہو اس میں بول چال کی پابندی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک مُدّت بعد

کے کلمہ سے حرفِ اخیر میں موافق ہو۔ اور یہ تعریف سکاکی اور فقیر دہلوی نے لکھی ہے۔ اور نفیس کہتے ہیں۔ مسجع نثریست کہ در آخر فقرہ لفظے آرند و مقابل آں لفظ در فقرہ دیگر لفظے باشد کہ در روی و ردف یا ردفین و تاسیس و دخیل و حرفِ وصل وغیرآں موافق باین لفظ باشد و مقید بوزنے نبود۔ جیسے قاصد تمہارا خط لایا۔ اور تمہارا پیغام سُنایا۔ الف اول لایا اور سُنایا میں روی اور موافق ہے مگر وزن لایا اور سُنایا کا مختلف ہے۔

ان مختصر تعریف ہر سہ اقسام نثر کی یہ ہوئی کہ مسجع وہ نثر ہے کہ جس میں قافیہ ہو اور وزن نہ ہو۔ اور رجز وہ نثر ہے کہ جس میں وزن صرفی یا عروضی ہو اور قافیہ نہ ہو اور عاری وہ نثر ہے جس میں نہ وزن ہو اور نہ قافیہ۔ ان تینوں نثروں کی تعریفیں میں وزن سے [illegible] کچھ نہیں۔ اور یہی تعریف ملا حسین واعظ کاشفی نے بدیع الافکار میں تحریر فرمائی ہے۔ اور بیان اقسام نثر سے پہلے تعریف نثر یوں لکھی ہے۔ کلامے را گویند کہ موزون نباشد۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے یہ مضمون کس کے مضمون کو دیکھکر لکھا ہے۔ اگر جناب احسن کے دوست کے مضمونوں کو دیکھکر لکھا ہے تو اگرچہ وہ مضمون بھی میرا دیکھا ہوا نہیں ہے مگر جناب احسن کے نوٹ سے جس قدر مستنبط ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ بلینک ورس یعنی نظم غیر مقفی کے اردو میں بھی لکھے جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ نثر مرجز ہو یا کوئی اور چیز یا پیشتر سے نظم غیر مقفی کا وجود فارسی میں پایا جاتا ہو۔ آپ کا جو جی چاہے بلینک ورس کا نام اردو میں رکھئے مگر اس امر میں رائے ظاہر کرنا چاہئے کہ بلینک ورس کی اردو میں لکھے جانے کی ضرورت ہے یا نہیں اور اس سے نظم اردو میں سہولت و وسعت ہوگی یا نہیں۔ ر

بلینک ورس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

مولوی نجم الغنی صاحب نے بجائے ۳ اقسام نثر ایک چوتھی قسم مقفیٰ اور لکھی ہے۔ حالانکہ مقفیٰ کوئی مستقل قسم نثر کی نہیں۔ بلکہ مسجع میں داخل ہے۔ چنانچہ علامہ سکاکی تلخیص میں فرماتے ہیں السَّجعُ هُوَ فِی النَّثرِ کَالقَافِیَةِ فِی الشِّعرِ سجع کی تین قسمیں ہیں:- مطرف و مرصع و متوازی۔ متوازی کی ایک صورت مقفیٰ بھی ہے۔ قتیل و عبد الرزاق و صاحب غیاث و مؤلف فرہنگ انندراج و مصنف انتا رفیض رسان سب کے سب تین ہی قسمیں۔ مرجز و مسجع و عاری لکھتے ہیں۔ اور ملا حسین واعظ کاشفی نے بھی بدیع الافکار میں یہی تین قسمیں لکھی ہیں۔

پھر سجع کی تعریف و مثال میں بھی سہو ہوا ہے۔ فرماتے ہیں "مسجع وہ نثر ہے کہ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں اور حرف آخر میں بھی موافق ہوں یعنی پہلے فقرے کے تمام الفاظ دوسرے فقرے کے تمام الفاظ سے وزن و حروف آخر میں موافقت رکھتے ہوں جیسے کانِ ملاحت معدوم میان الخ۔ و جانِ صباحت موسوم دہان الخ۔ نہیں معلوم مولوی صاحب نے تعریف مسجع جو لکھی ہے یہاں وزن سے وزن بحور [illegible] نہیں مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح نثر مرجز میں بھی وزن سے مراد وزن صرفی ہی ہے۔

تعریف سجع جو مولوی صاحب نے لکھی ہے وہ تعریف مرصع ہے جو سجع کی تین قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ اور سجع ان تینوں قسموں کو شامل ہے۔ اور سجع کی تعریف یہ ہے کہ پہلے فقرے کے آخر کا کلمہ دوسرے فقرے کے آخر

وزن بحور [illegible] جیسے

عمل پیرا ہوں تمام ملک کا یہی طریق ہو رہا ہے ۔ پس ایک طرف اس طرح کی باہمی ہمدردی اور دوسری جانب اس طرح کی خلا ملا اور بیگانگی سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اشخاص باہمدگر ہمدرد اور دوست ہیں مگر قوم بحیثیتِ قوم ایک دوسرے کے دشمن اور مخالف ہے ۔ اور اس نتیجہ پر پہنچکر ایک طرف دونوں قوموں کے پہلے تعلقات اور دوسری طرف قومیت کی نسبت موجودہ عقاید اور خیالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخالفت اور عناد کے دو سبب ہیں ۔ دونوں فرقوں کے پہلے تعلقات میں انقلاب پیدا ہونے سے ایک حد تک خود غرضی پیدا ہوئی تھی اور کچھ عرصے کے بعد وہ معدوم ہو جانے کو تھی مگر قومیت کے موجودہ عقائد نے جو خاص اسباب سے پیدا ہوئے خود غرضی کو عداوت تک پہنچایا اور جب تک خیالات کی یہ حالت ہے ۔ عداوت کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی جائیگی ۔

(باقی دارد)

غزل

اہلِ ہستی کو عدم کا مرحلہ درپیش ہے	موت کو نزدیک جو سمجھے وہ دور اندیش ہے
میکدے میں عمر گزرے اور دامن تر نہ ہو	میکشو پیرِ مغاں پہنچا ہوا درویش ہے
کچھ نہ کچھ حسرت زدوں کے ہے ستانے میں مزہ	درد اُسی کی جان کا دشمن ہے جو دل ریش ہے
آخر سن میں ہوئی ہے شیخ کو عقبیٰ کی فکر	آدمی سیدھا ہے لیکن عاقبت اندیش ہے
آنکھ کی پتلی سے دنیا دیکھکر آنکھیں کھلیں	کوئی ہو کتنا ہی کم پھر بھی وہ ہم سے بیش ہے

کچھ ریاضت کی بھی ہے کشکول میں پونجی حفیظ
یا دکھانے کو گلے میں خرقۂ درویش ہے

حفیظ جونپوری

کے حقوق کا تذکرہ ہو۔ دُوسرے گروہ والے باوجود دوست ہونے کے اُسوقت وُہ بات
کرینگے جو اپنے فرقہ کی فیور میں ہو اور دُوسرے کی بات کاٹنے کو فرض سمجھینگے۔ کسی فریق
کا ایک ممبر برسرِ حکومت ہو تو اپنے محکمہ میں نیچے سے اوپر تک اپنے ہمقوموں کو جمع
کرنا خواہ اُنکا کوئی حق نہو اور دُوسری قوم کو بیدخل کرنا خواہ وُہ زبردست حقوق رکھتے
ہوں فرض و واجب جانتا ہے۔ ہندو مُسلمانوں کے فساد نئے نہیں۔ دو برتن بھی
پاس رکھے ہُوئے ٹکرا جاتے ہیں اور شریر اور فتنہ پرداز ہر قوم میں موجُود ہیں اور
بالعموم لڑائی ہوتی بھی جبھی ہے کہ ایک طرف سے شرارت ہو تو دُوسرے اس سے
بڑھکر شرارت کا ارتکاب کریں ورنہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی اور ایک فریق
بالکل صلح جو ہو تو چند شریروں کو خود ان کے ہمقوم بھی دبا سکتے ہیں اور اس لئے بلوے
میں زیادتی عموماً دونوں کی ہوتی ہے مگر ایسے موقعوں پر بجائے شریروں کا کھوج
لگانے اور اُن کی بدذاتی کو ظاہر کرنے کے۔ تمام حمایت کرنے والے تمام قانون
پیشہ اور تمام لیڈر اپنی قوم کو مظلوم اور دوسروں کو فتنہ پرداز ثابت کرنا اپنا فرض
سمجھتے ہیں۔ اور نہ صرف مقامی اشخاص بلکہ ہندوستان کے ایک سرے سے
دُوسرے سرے تک یہی فیلنگ کام کرنے لگتا ہے اور تمام مُلک میں ہر شخص اپنی
قوم کی مصیبت کا مرثیہ پڑھتا اور دُوسروں کے جور و ظلم کی فریاد کرتا دکھائی دیتا
ہے۔ ایک فریق گورنمنٹ سے کوئی درخواست کرتا ہے اور درخواست ضرور
نہیں کہ ہمیشہ ناواجب اور دُوسرے فریق کے حق میں مضر ہی ہو مگر مُلک کے
رہنما اخباروں اور مضمون نگاروں کی ڈیوٹی ہے کہ ہموطنوں کی ہر درخواست کو
غلط کہیں اور اپنی قوم کے حق میں ظلم سمجھیں۔ اور کبھی کسی درخواست اور
مسئلہ کی نسبت نہیں دیکھا گیا کہ ایک نے دُوسرے کے حق میں خیر کا کلمہ
کہا ہو۔ ور باستثنا خال خال نفوسِ قدسیہ کے جو شاذ و نادر اس کے خلاف

اور اگر کہا جائے کہ کامل سبب نہ سہی کسی قدر نفرت تو ان وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے الگ الگ نہ سہی۔ سب ملکر عداوت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں کہونگا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے نفرت کسی سبب سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ پیدا شدہ نفرت کو بڑھانے اور بھڑکانے کے لئے یہ سب باہیں بہانہ ضرور بن سکتی ہیں اور اس لئے یہ اور بھی ناممکن ہے کہ پہلے دلوں میں صفائی ہو اور یکایک گاؤکشی کو دیکھکر غصہ کی آگ بھڑکانے کا خیال آنے لگے۔ مذہبی اختلاف کو دیکھکر دل آزاری کی خواہش ہونے لگے۔ مسلمانوں کی حکومت کا خیال آئے اور بادشاہوں پر غلط الزام لگانے اور اسلام کو بدنام کرنے کی سوجھنے لگے اور حقوق طلب کریں تو اس کو بھی دشمنی کا باعث سمجھیں۔ غرض ہر ادا بری معلوم ہو اور ہر بات میں فی نکالی جائے۔ یہ ہو بھی سکتا ہے۔ اس صورت میں کہ عداوت پہلے موجود ہو اور آتشگیر مادہ کو صرف بتی دکھانے کی دیر ہو۔ اس لئے ہمیں ان سب امور سے پہلے کے واقعات میں اس ناگوار تخم کا پتہ لگانا چاہئے۔

عداوت کا وجود۔ مگر کیا عداوت موجود ضرور ہے؟ ہم تو دیکھتے ہیں اب بھی ہندو مسلمان ایک دوسرے کی تقریبوں میں شریک ہوتے ہیں اور ہر شخص کے دوستوں کے دائرہ میں اگر زیادہ ہمقوم ہیں تو چند دوسرے گروہ کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ کاروباری لین دین کے علاوہ برادرانہ لین دین بھی جاری ہے اور احسان و مروت کے نشان بھی کہیں کہیں دیکھے جاتے ہیں۔ کسی مسلمان کی کوشش سے ہندو کو اور ہندو کی کوشش سے مسلمان کو نوکری بھی ملجاتی ہے۔ فقیر صدا کرتا ہے اور ہندو پیسہ دیدیتے ہیں۔ سادھو الکھ جگاتا ہے اور مسلمان عورتیں کہتی ہیں ہندو ہے روٹی نہ لیگا آٹا دیدو۔ یہ کام ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی جہاں چند ہندو مسلمان جمع ہوں اور کسی پولیٹکل مسئلہ کا ذکر چھڑ جائے یا کسی فرقے

معاملات میں کئی کئی فریق موجود ہیں اور ہر فریق اپنی رائے الگ اور اپنے حقوق
جداگانہ رکھنے کا دعویدار ہے۔ ایسی حال میں عوام اور اُمراء کے حقوق میں
بحث ہو رہی ہے۔ عوام انکا جداگانہ مجلس قائم کرنے کا حق نہیں سمجھتے اور
اُمرا اپنے دیرینہ اختیارات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اپنی اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ
باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ لیکن باوجود اس کے انگلش نیشن ایک چیز ہے اور
عناد و عداوت کا کوئی نشان نہیں۔ حلف شاہی کے الفاظ پر رومن کیتھولک
فرقے کو اعتراض ہے۔ بعض پروٹسٹنٹ الفاظ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ پارلیمنٹ میں
بحث زور سے ہوئی۔ مگر کینہ وری سے واسطہ نہیں اور یہ سب اس لئے کہ پہلے سے
کوئی عناد موجود نہیں اور حقوق پر اصرار کرنا اور رائے میں اختلاف رکھنا تقاضائے
بشریت سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان میں رائے مختلف ہونے اور حقوق طلب کرنے
پر ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے تو سبب یہی کہ دل پہلے سے پھٹے ہوئے
ہیں۔ ہم شخصی معاملات میں دیکھتے کہ دو بھائی جائداد تقسیم کرنی چاہتے ہیں۔ اگر سلوک ہوتا ہی
تو چپ چاپ فیصلہ ہوجاتا ہے اور ایک بھائی کچھ زیادہ لے جائے تو کہا جاتا ہے کہ "
خیر بھائی لیگیا غیر تو نہیں" لیکن اگر پہلے سے دلوں میں کینہ ہوتا ہے یا بھڑکانے
والے جادو چلاتے ہیں تو زیادہ لینا ایک طرف بھائی کو اُس کا حق دینے میں بھی
تامل ہوتا ہے اور عدالتوں میں تمام جائداد کو برباد کر دینا گوارا کرتا ہے۔ یہی صورت
یہاں ہوئی کہ پہلے سے کاوش موجود ہے۔ مانگنے والوں کے دل میں نہیں تو
بھڑکانے والوں کے دل میں ہے۔ وہی پہلی کاوش خواہ کسی کے دل میں ہو۔ حقوق
طلب کرنے پر ظاہر ہوتی ہے اور عداوت کا موجب بنتی ہے۔

سب کا مجموعہ۔ غرض میرے خیال میں مذکورہ بالا اسباب میں سے کوئی ایک
بھی صفائی کے بعد عداوت پیدا کرنے کے لئے کامل سبب بننے کے قابل نہیں

ہاں چھوت کے مسائل ایسے عجیب اور خلافِ قیاس ہیں کہ سب کو دیکھنے کے
بعد غصہ نہیں آتا۔ تعجب رہ جاتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ صرف مسلمان کی
چھوت دیکھکر اکثر لوگوں میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام بھی آج کا نہیں اور
ہمارے باپ دادا صدیوں سے باوجود ان پر حاکم ہونے کے یہی سلوک دیکھنے
کے عادی ہیں اس لئے اب اگر محض اس وجہ سے غصہ آیا ہے تو کیوں آیا۔
اور کیا بات دل میں سمائی کہ جو کام سیکڑوں برس سے دیکھتے تھے اور بُرا نہ مانتے
تھے اب اسی کام پر دفعۃً جھلا اُٹھے۔ ضرور کوئی وجہ ہے اور وہی وجہ عداوت
کا باعث ہے۔

طلب حقوق۔ ایک وجہ یہ بھی خیال کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے گورنمنٹ
سے حقوق طلب کرنے میں ہندوؤں کا ساتھ نہیں دیا اور اپنے لئے جداگانہ
حقوق طلب کرنے لگے۔ جس پر ہندوؤں کو طیش آیا اور یہ بھی اُن کے حقوق کے
خلاف اور اپنے خاص حقوق کے متعلق کوشش کرنے لگے۔ اس واقعے سے
انکار نہیں اور بیشک مسلمانوں نے کانگریس اور سیلف گورنمنٹ کے بہت
سے مطالبات میں ہندوؤں سے اختلاف کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بعض
مطالبات کو جو ہندوؤں کی طرف سے پیش ہوتے نامناسب سمجھتے ہیں اور
اس خیال سے وہ مجبور ہیں کہ ایسے مطالبات میں شریک ہوں۔ کچھ حقوق
جو وہ جداگانہ طلب کرتے ہیں اُنکو اپنی قوم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور
حتی الوسع ہندوؤں کے حقوق میں دست اندازی کرنی نہیں چاہتے۔ پس اگر
اس سے پہلے دلوں میں صفائی ہوتی تو ملکی معاملات میں اختلاف رائے اور
حقوق کا معاملہ ایسا نہ تھا جس پر عناد پیدا ہو جاتا۔ ایسا اختلاف اور ایسے
قانونی جھگڑے دیگر ملکوں میں بھی ہوتے ہیں۔ انگلستان کے اندر پولیٹکل

دست اندازی

سلیم المزاج آدمی کے دماغ میں نہیں آسکتیں۔ چہ جائیکہ خواہ مخواہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم اُنکے ارتکاب کو اپنا مشن بنا لے اور رات دن تحریر و تقریر میں غلط روایتوں کا وظیفہ رٹے۔

چھوت کا مسئلہ۔ ہندؤں کا چھوت کا رواج بھی بعض لوگوں کو رنجش کا سبب معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی سودا لینے کے لئے ہم ہندو دکان پر جاتے ہیں اور وُہ کہتا ہے "میاں جی پرے پرے" اور اُدھر ہم سے زیادہ میلے لباس اور میلے جسم کا کوئی ہندو آکر اسی دوکان سے کوئی کھانے کی چیز ہاتھ میں اُٹھا کر بھاؤ پوچھتا ہے اور ہمارے ہاتھ پر مٹھائی کا دونا اُوپر سے پھینک دیا جاتا ہے۔ تو ایسا سلوک بیشک از حد ناگوار گذرتا ہے۔ ہندو اگر اس رسم کو ترک کردیں تو ملک کی قسمت میں برا انقلاب پیدا کرینگے۔ مگر جب دوکاندار خود میلے ہوتے ہیں اُن کے ہندو گاہک میلے ہوں جب بھی ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ہم صاف سُتھرے ہوں جب بھی دامن سے چھونے کے قابل نہیں۔ اس منظر کو دیکھکر میں تو دل میں ہنسا کرتا ہوں۔ کیونکہ ہم پر کیا منحصر ہے اُنکے ہاں آپس میں اعلیٰ ذات کا ہندو ادنیٰ ذات کے ہاتھ کا پکا نہیں کھا سکتا حقّہ نہیں پی سکتا۔ البتہ کلی پی سکتا ہے۔ کوئی برتن کو مُنہ لگا کر پانی پی لے جب تک مٹی سے مانج نہ لیا جائے سگا بھائی مُنہ نہ لگائے گا۔ ہاں چاندی یا سونے کا برتن ہو تو مانجنے کی ضرورت نہیں۔ اُس میں ناپاکی نہیں گھُستی۔ اپنے گھر کا کھانا کھانے بیٹھیں تو باپ بیٹا اور بھائی بھائی ایک برتن میں نہیں کھا سکتے۔ چوکے میں کھانا کھانے جائیں تو خود انکا اپنا بدن بھی گندہ ہے نہا کر آئیں۔ دھوبی کے دھوئے کپڑے گندے ہیں۔ نہا کر وہی دھوتی اپنے ہاتھ سے نچوڑلیں تو پاک ہو۔ وُہ باندھ کر کھانے بیٹھیں۔ غرض اُن کے

یہاں ہیں وہی وہاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر آریاؤں کا اختلاف مذہب مخالفت کا باعث ہو جب بھی اس کے علاوہ ایک اور سبب ضرور موجود ہے جس نے یہاں سے وہاں تک تمام ایسی جگہوں میں آگ لگا چھوڑی ہے جہاں آریا اثر نہیں پہنچا۔

مسلمان بادشاہوں کے مظالم۔ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم نہیں بھولتے اور وہ مسلمانوں سے صاف نہیں ہو سکتے اور مسلمان ہندوؤں کے ایسے تذکروں سے ناراض ہوتے ہیں۔ اس لئے عداوت چلی جاتی ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ اگر کسی خاص مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے کسی خاص ہندو یا کسی جماعت کو تکلیف پہنچی ہے تو ایسے بادشاہ بھی مسلمانوں ہی میں گذرے ہیں جو نہایت رحمدل و فیاض، منصف اور منتظم تھے تاریخ کو دیکھا جائے تو ایسوں کی تعداد زیادہ نکلیگی بہ نسبت ان لوگوں کے جنکے تعصب اور ظلم کی فریاد کی جاتی ہے۔ پس اگرچہ ہندوؤں کا مسلمانوں کے مظالم کو یاد کرنا اور دہرانا مسلمانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں کو اس کی ترغیب کیوں ہوئی۔ ایک آدھ بادشاہ کی جگہ وہ سب بادشاہوں کو ظالم کہیں اور ایک آدھ سچے واقعے کی جگہ سیکڑوں غلط روائتیں ظلم و جبر کے متعلق اُچھالا کریں اور بجائے کسی بادشاہ کا ذاتی فعل کہنے کے ان مفروضہ ظلموں کو مسلمان بادشاہوں کا اور اسلام کا خاصہ قرار دیں۔ اور پھر جب وہ سب معاملہ گذر چکا اور جو لوگ اُنکے خیال میں ظالم تھے مر چکے اور اب جو مسلمان زندہ ہیں انکو اُن افعال میں کوئی دخل نہیں تو ان لوگوں سے عداوت رکھیں۔ صرف اس وجہ سے کہ اُن کے ہم قوم بادشاہ گذشتہ زمانے میں ہم پر ظلم کیا کرتے تھے یہ سب زبردستیاں بغیر کسی پہلی کاوش کے

اور اسلام

دونوں فرقوں میں رنجش ہے اور اب ایک دوسرے کی گالی گلوچ اس رنجش کا بدلہ لینے اور مخالفانہ جذبہ کو بھڑکانے کا باعث ہو رہی ہے۔ اس لئے میں عداوت کا نشان ان دل آزار تحریروں سے پہلے دیکھتا ہوں اور باہم گر علت و معلول نہیں سمجھتا۔

اس استدلال میں ایک نقص رہ گیا کہ آریا پارٹی ایک جدید فرقہ ہے اور ان میں جدت کے سبب سے جوش بھی بے حد ہے۔ اگرچہ آریا نے پرانے ہندوؤں کے بہت سے وہ خیالات چھوڑ دیئے ہیں جن سے مسلمانوں کو اختلاف تھا اور اگر رواداری اور تحمل سے کام لیا جاتا تو مذہبی خیال سے پرانے ہندوؤں کی نسبت اُنکے ساتھ زیادہ دوستی ہو سکتی تھی۔ مگر اُنہوں نے چھوٹتے ہی تمام مذاہب کی تردید اس بدآہنگی سے کی کہ دلوں میں ناسور ڈالدیئے اور اُدھر بعض جواب دینے والے بھی ایسے جوشیلے نکلے کہ مخالفت کی آگ بیش از پیش بھڑکتی گئی۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی عداوت کا باعث ہندو مسلمانوں کا مذہبی اختلاف نہیں تو آریہ مسلمانوں کا مذہبی اختلاف ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہ تازہ پیدا ہوا ہے اور ابھی مخالفت کے عرصے کو طے نہیں کر چکا۔ لیکن میں جو عداوت کو اس اختلاف پر مبنی نہیں سمجھتا تو اس لئے کہ کچھ تو باعث ہوگا جس سے آریا نے مذہبی حیثیت سے قریب آنے کے باوجود مسلمانوں سے لڑائی اور زیادہ ٹھان لی اور دوسرے آریہ پارٹی کا اثر پنجاب اور ملک متحدہ میں زیادہ ہے اور اس سے آگے کہیں تو کچھ بھی نہیں اور کہیں ہے مگر کم۔ لیکن مخالفت اور کاوش اگر موجود ہے تو وہ پنجاب کے ہندو مسلمانوں میں جس قدر ہے اسی شدت سے بمبئی پریسیڈنسی اور بنگال کے روشن خیال طبقہ میں موجزن ہے اور جو شکایتیں

کو خدا جاننے والے کا اصرار اجنبی معلوم نہیں ہوتا اور ہم روزانہ اپنے دوستوں میں ایسی بحثیں کرتے رہتے ہیں اور جب تک تہذیب کی پابندی رہے رنج پیدا نہیں ہوتا اور پھر اگر کوئی شخص جوش میں تیز ہوجاتا ہے اور ناگوار کلمہ کہہ بیٹھتا ہے۔ اگر خالص دوستوں کا مجمع ہے تو اُس کو ہنسی میں اُڑا دیا جاتا ہے اور اس شخص کو غصیلا اور پاگل کہکر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مجمع میں دو ایسے شخص موجود ہوں جن میں پہلے سے رنجش ہے اور ان میں ایسی زیادتی ہوجائے تو پھر بات کا بتنگڑ بنجاتا ہے اور بحث سے لڑائی ہونے لگتی ہے۔ اُس وقت کہنے کو یہی کہا جاتا ہے کہ اُس نے بدتہذیبی کی تھی۔ ہمارے پیشواؤں کو بُرا کہا تھا یا کفر کا کلمہ بولا تھا۔ اس لئے غصہ آگیا۔ گر حقیقت میں لڑائی کا باعث وہی پہلی رنجش ہوتی ہے اور یہ فعل اُس رنجش کو پوشیدہ سے ظاہر کردینے کا اور آئندہ کے لئے بڑھا دینے کا باعث ہوتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ہندو مسلمانوں کا مذہب نیا نہیں۔ ہندوستان میں اس میل کو ہزار برس سے زائد گذر گئے اور اس عرصے میں جس قدر اشاعت مسلمانوں کے عقائد کی ہندوؤں میں اور ہندوؤں کے عقائد کی مسلمانوں میں ہوچکی ہے۔ آجکل کے پریس اور اخباروں نے اس سے زیادہ واقفیت کیا پیدا کردی ہوگی۔ اس لئے صرف اتنی بات سے آج مخالفت پیدا ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ رہیں مذہبی دل آزار تحریریں انکو اس آزاد زمانے میں شروع بیشک دو ایک ہندو مسلمان مذہبی دیوانوں نے کیا ہوگا۔ مگر بجائے انکے اس نئے فعل پر لعنت بھیجنے کے اب جو بعض آریا اور بعض مسلمان مذہبی اخبار نویس اور پیشہ ور بحث کرنے والوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دینے کا طریق اختیار کرلیا ہے اور پبلک اُن کی تحریروں کو اس شوق سے دیکھتی ہے کہ اُن کے برابر اشاعت اور اخباروں کی نہ ہوگی تو اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ پہلے سے

اور مخالفت کی جگہ صرف اختلاف رائے رہجاتا ہے اور دشمنی کی جگہ مصالحت عود کر آتی ہے ہندو مسلمانوں پر یہ سب مرحلے گذر چکے ہیں۔ اب نہ مسلمان اس ملک میں نئے آئے ہیں اور نہ ہندوؤں نے یہ خیالات پہلے پہل سُنے ہیں۔ اس لئے یہ تازہ عداوت جو پیدا ہوئی ہے اس کا باعث مذہبی اختلاف نہیں۔

مذہبی بحثیں۔ البتہ مذہبی بحثوں کی جیسی کچھ آزادی اور خیالات کو مشتہر کرنے کی جیسی کچھ سہولت اس زمانے میں ہے پہلے نہ تھی اور بیشک اس آزادی اور اس سہولت سے فائدہ اُٹھا کر ہر دو فریق نے اپنے خیالات کی اشاعت پہلے سے زیادہ کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ بہت کچھ سختی اور دل آزاری کا رواج ہو گیا ہے اور مُلک کے بہت سے دانا اس کو عداوت کا باعث قرار دیتے ہیں۔ گو اس میں تو شک نہیں کہ ایسے مباحثے جو تہذیب اور انسانیت سے بہت دور ہیں عداوت کو ترقی دیتے ہیں اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو چونکہ دونوں طرف جاہل زیادہ ہیں۔ ممکن نہیں کہ کبھی مصالحت پیدا ہو۔ اور بدقسمتی سے مُلک کا مذاق ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ان خلاف تہذیب تحریروں کو جائز سمجھا جاتا ہے اور محض حق کو تلاش کرنے کے لئے مہذبانہ گفتگو کسی کو پسند نہیں اس لئے اُمید نہیں ہے کہ یہ زہریلی ہوا ملک سے جلدی نکل جائیگی۔ لیکن ان سب باتوں کو مان کر بھی صرف مذہبی بحث کو عداوت کا سبب قرار دینے میں تامل ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ ایک تو مذہب اختلاف ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک عرصے کے بعد مخالفت کا باعث نہیں رہتا اور یہاں وہ عرصہ گذر چکا ہے اور ایک اپنے اختلافی خیالات کو تہذیب کے ساتھ ظاہر کرنا اور دوسرے کے خیال کو نرمی کے ساتھ غلط ثابت کرنا۔ یہ بھی ابتدا میں مخالفت کا باعث ہوا کرتا ہے اور نئے مذہب کی نرم بات بھی گوارا نہیں ہوتی مگر ایک عرصے میں یہ بات نہیں رہتی اور خدا کو نہ ماننے والے کا انکار اور حیاتیات

غرض اگرچہ میں دل سے چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اختیار سے اپنے ہمسایوں کے مذہبی نفرت کا خیال کر کے ہز مجسٹی امیر کابل کی مثال کی پیروی کریں اور جہانتک ہو سکے گاؤکشی کی رسم کو کم کر دیں۔ مگر اس خیال کو یقیناً غلط سمجھتا ہوں کہ گاؤکشی سے ہندو مسلمانوں میں عداوت پیدا ہوئی ہے۔ البتہ اب عداوت پیدا ہونے کے بعد اس خیال کو پیش کر کے نادانوں کو بھڑکایا جاتا ہے اور اس وجہ سے جو لوگ نفرت کرنے لگے ہیں دانا ہندوؤں کا فرض ہے کہ انکو سمجھائیں اور بھڑکانے والوں کی نیت ظاہر کریں۔ اس بارے میں بعض گورکھشا سبھاؤں نے جو روش اختیار کی ہے میرے نزدیک نہایت ہمدردانہ نہایت مفید اور نہایت مناسب ہے اور وہ لوگ مسلمانوں سے نفرت رکھنے اور گاؤکشی کے بہانہ سے مسلمانوں کو بھڑکانے کی بجائے اس طرح سے گائے کی خدمت زیادہ کر سکتے ہیں اور اگر اپاہج جانوروں کی خبر گیری کے ساتھ عمدہ نسل پیدا کرنے کا بھی انتظام کیا ہے تو ایک مفید نسل کو ترقی دینے کے خیال سے یہ بھی مناسب ہوگا کہ مسلمان ان لوگوں کا ہاتھ بٹائیں اور اس نسل کی حفاظت اور افزائش میں مدد دیں۔

مذہبی خیالات - بعض طبیعتوں کو مسلمانوں کا مسلمان اور ہندوؤں کا ہندو ہونا بھی اختلاف کا سبب معلوم ہوتا ہے اور وہ لوگ مذہبی اختلاف کے ساتھ قومی اتفاق کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ بیشک مذہبی اختلاف جبکہ کوئی مذہب نیا پیدا ہو مخالفت کا باعث ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ ادھر نیا مذہب لانے والوں میں ایک جوش ہوتا ہے اور اپنے عقاید کو زور کے ساتھ ظاہر کرتے اور انکی اشاعت کی آرزو رکھتے ہیں اور ادھر پرانے مذہب والے پہلی بار اپنے مذہب کی تردید سننی گوارا نہیں کرتے اور اس طرح پر حسب موقع جنگ و جدال، کشت و خون، مقدمات یا سخت کلامی تک نوبت پہنچتی ہے اور کئی کئی طرح کی رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن پھر رفتہ رفتہ ادھر والوں کا جوش کم ہونے لگتا ہے اور ادھر والوں کو نئی بات سنتے سنتے مساوات ہو جاتی ہے۔

مسلمان قابلِ عداوت ہیں تو دیگر جانوروں کی ہتیا کرنے والے ہندوؤں سے
سانپوں تک کو دُودھ پلانے والے ہندو ضرور مخالف ہونے چاہئیں لیکن ایسا
نہیں ہے اور واقع میں جو بات ایک شخص کے مذہب میں جائز مان لیجائے ناجائز
کہنے والے اُسکو مجبور کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ اس لئے جو لوگ ایسی باتوں
کی پروا نہیں کرتے اور دُوسرے کے افعال و اختیارات میں دخل نہیں دیتے
وُہ عقلمند ہیں۔ اور جو اس لئے عداوت رکھتے ہوں کہ دُوسرے لوگ ہمارے
مذہبی حکموں کی تعمیل کیوں نہیں کرتے اور جس فعل کو ہم ناجائز سمجھتے ہیں اُس کا ارتکاب
کیوں کرتے ہیں۔ قوم کے عقلمندوں پر فرض ہے کہ ایسے نادانوں کو سمجھائیں
نہ یہ کہ اُنکے لئے غیر مذہب والوں سے عداوت پیدا کریں۔

تیسرے اگر مسلمان گائے کو اس لئے ذبح کرتے ہوں کہ ان کو اس کی
ضرورت ہے یا وُہ صحیح طور پر یا نادانستہ اسکو مذہبی فرض سمجھتے ہیں تو خواہ ہندوؤں
کے نزدیک مسلمان ضرورت سمجھنے یا مذہبی حکم ماننے میں غلطی پر ہوں وُہ اپنے نقطہ
خیال سے مجبور ہیں اور ان کو ایسے فعل پر اگر وُہ غلط ہے انصاف کے رُو سے
سمجھانا فرض ہے نہ کہ عداوت کرنی اور نقصان پہنچانا۔ اور اگر اس لئے ذبح کرتے
ہیں کہ ہندوؤں کو رنج پہنچے تو ایسے ہمسائے جن کے ساتھ پُشت ہا پُشت سے
بود و باش ہے۔ اور آپس میں روزانہ ہزاروں طرح کا ضروری اور برادرانہ لین دین ہوتا
ہے انکو چڑانے اور رنج پہنچانے کا خیال پیدا ہو اس کا بھی کوئی باعث ہونا چاہئیے
بے وجہ ایسی حماقت نہیں ہو گی۔ اس لئے اگر مان لیا جائے کہ مسلمان اُنکو چڑاتے
ہیں تو عداوت کا وجود اس سے پہلے ہوگا جس سے چڑانے کا خیال پیدا ہوا۔
اس لئے عداوت کا باعث گاؤکشی نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور گاؤکشی کا فساد اُس کا
نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

ہو سکتی

تھا لیکن اختلاف ایک طرف ملک گیری کی لڑائیاں ختم ہو جانے اور ملک میں
امن قائم ہونے کے بعد ہمیشہ ہندو مسلمان شیر و شکر ہو جاتے رہے ہیں اور ایک
دوسرے کے لئے جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتے رہے۔ اور
اب جبکہ گائے یا دیگر حیوانات کو دیوتا سمجھنے کا خیال معدوم ہوتا جاتا ہے۔ عداوت
کی آگ بھڑکتی جاتی ہے اب بھی ہندو پارٹی کا جو حصہ قدیم مذہب پر قائم ہے
اور گائے کی پرستش کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس پارٹی میں عداوت کے
خیالات بہت کم ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مسلمان بزرگوں کو مانتے۔ اُنکے
مزاروں پر منتیں چڑھاتے اور مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے ہیں اور
اختلاف جسقدر ہے اُسی جدید پارٹی کو ہے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے
بہت قریب آ گئے ہیں اور خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے اور اپنے اصول
کے رو سے گائے کو بھیڑ بکری کی طرح صرف ایک مفید جانور مان سکتے ہیں پس
جب گائے کو مذہبی عظمت دینے والے اختلاف نہیں رکھتے یا کم رکھتے ہیں اور
اسکو جانور سمجھنے والوں کا دل صاف نہیں تو معلوم ہوا کہ گاؤکشی عداوت کا باعث
نہیں بلکہ عداوت کسی اور وجہ سے ہے اور اس کو بھڑکانے کے لئے گاؤکشی بطور
ایک موثر حیلہ کے پیش کیجاتی ہے۔

دوسرے گائے کی مذہبی عظمت بیشک ہندوؤں کے تمام قدیم
فرقوں میں ہے لیکن گائے کے علاوہ اور جانور بھی ہیں جنکو بعض فرقے واجب التعظیم
سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض یا یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوؤں کا اکثر حصہ جیو ہتیا کو ناجائز
اور ظلم جانتا ہے اور ان میں سے بعض مُنہ پر پٹی باندھتے ہیں اور پاؤں میں جوتی
نہیں پہنتے کہ فضا کے کیڑے نہ تلف ہوں ۔ ان سب کے خلاف خود بعض
ہندو گوشت کو علانیہ استعمال کرنے والے موجود ہیں۔ پس اگر گائے پر ظلم کرنے سے

اتفاق اور اس کے نتائج سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے۔

اگرچہ اس مضمون کی جانب توجہ نسبتاً عدم کے برابر ہے۔ مگر چونکہ اسباب عداوت بہت سے سُننے میں آتے ہیں ہر شخص نے کسی نہ کسی واقعہ کے باعث عداوت ہونے پر یقین کر چھوڑا ہے اس لئے متخیلہ کا رستہ صاف ہے اور تسلیم شدہ اسباب کو دیکھنے کے بعد عداوت کی حقیقی وجہ تک پہنچ جانا ممکن ہے۔

گاؤکشی۔ اکثر کہنے والے اور بالخصوص ہندو خیال کرتے ہیں کہ ان کے مذہب میں گائے کی تعظیم فرض ہے اور مُسلمان گاؤکشی کے عادی ہیں اس لئے ہندو اِس ظلم کو دیکھ نہیں سکتے اور مُسلمانوں سے عداوت رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس بارے میں اسقدر تسلیم کرنے میں تو مجھ کو تامل نہیں کہ اگر گائے کو ذبح کرنے کی ضرورت نہ ہو اور صرف اس خیال سے ذبح کیجائے کہ ہندو ہمسائے جلیں اور بیٹھے کھائیں تو ایسا فعل سخت مذموم ہے اور ہمارے مذہب نے ہمسایوں کی رعایت بلا قید مذہب فرض قرار دی ہے۔ قرآن پاک میں جَارِ الْجُنُبِ یعنی اجنبی ہمسائے پر احسان کرنے کا حکم ہے اور ہمارے ہادی (روحی فداہ) کا ارشاد ہے کہ مجھے ہمسائے کے ساتھ رعایت کرنے کی یہانتک تاکید کی گئی ہے کہ میں خیال کرتا تھا کہ شاید اسکو ورثہ میں شریک کیا جائیگا۔ اور ایک موقع پر ارشاد ہے کہ وُہ ہرگز مُسلمان نہیں جسکے ہمسائے کو اس سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور نیز اگر کسی کام میں کچھ فائدہ نہ ہو تو اسلام میں اسکو لغو کہتے ہیں اور قرآن نے لغو کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چہ جائیکہ اس [illegible] کے ساتھ ہمسایوں کے ناراض ہونے کی مضرت بھی ہو۔ لیکن مسلمانوں کے اس فعل کو باعثِ عداوت قرار دینے سے پہلے یہی سوچنا چاہئے کہ گاؤکشی کی رسم ہندوستان میں مُسلمانوں کے ساتھ آئی ہے اور اس زمانے میں ہندوؤں کے اندر گائے کے دیوتا اور اوتار ہونے کا خیال بھی [illegible] میں موجود

اس کے [illegible]

وعداوت کو بھڑکانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اتفاق پیدا کرنے کے تذکرے
اُنکے مقابل میں کچھ بھی نہیں۔ اور اخباروں کو تو اس ملک میں ابھی ملکی مصلحت اندیشی
اور خیرخواہی کو [illegible] کرنے میں تامل بھی ہے اور وُہ باستثنائے اندک قوم کے
بگڑے ہوئے مذاق سے فائدہ اُٹھاکر اپنی گرمی بازار سے مطلب رکھتے ہیں تعجب
اُن قومی مجلسوں پر ہے جن میں عموماً قوم کے روشن خیال بزرگوار اور قومی اور ملکی
مصلحتوں کو بخوبی سمجھنے اور سمجھانے والے جمع ہوتے ہیں وُہ بھی اکثر اپنی قومی حقوق
کی حفاظت کرتے ہوئے دُوسروں پر حملہ کرتے اور عداوت بھڑکاتے تو دیکھے جاتے
ہیں لیکن ہمنے سنا بعض آدمیوں کے کسی کانفرنس کسی کانگریس۔ کسی انجمن اور کسی
سبھا میں کوئی ریزولیوشن پیش نہیں ہوا کہ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کا اختلاف
ملک کے لئے اور دونوں قوموں کے لئے مضر ہے اور ضرورت ہے کہ ہر فریق عداوت
کے خیال کو مٹا کر اپنی قوم کے ساتھ دُوسری قوم کے فوائد کو بھی ملحوظ رکھے اور حتی الوسع
دوستانہ [illegible] پیدا کرے۔ تعلیمی ضرورت مسلّم ہے۔ پولیٹکل اغراض مقدم ہیں۔ اُنکے لئے
تو اکثر سنا گیا ہے [illegible] مضامین لکھنے کا اہتمام ہوا ہے اور اچھی تجویز پیش کرنے پر
توجہ کیجائیگی۔ مگر ملک میں اتفاق کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور ابتک کوئی
ایسی تحریک سُننے میں نہیں آئی تھی کہ عداوت و نفاق کے اسباب اور اُن کو
دُور کرنے کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے غور کیا جائے۔ البتہ اب اب
کچھ آواز پیدا ہوئی ہے اور کہیں کہیں یہ چرچے ہونے لگے ہیں اور چند ایک مضامین
بھی دیکھنے میں آئے ہیں لیکن مسئلہ مہتم بالشان ہے ایک دو تحریروں سے
حل ہونے والا نہیں۔ ضرورت ہے کہ ملک کے سب بہی خواہ غور کریں اور
اسباب عداوت کو تشخیص اور دفعیہ کی تدابیر کو معین فرمائیں۔ اور اس مرحلے کو شکستہ
دل سے اور قومی طرفداری سے الگ ہو کر طے کرنے کے بعد وُہ وقت آسکیگا کہ

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

"ہندو مسلمانوں کے تعلقات" ایک ایسا مبحث ہی جو اول تو ہمیشہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کا مدار اس مسئلہ کے حل ہونے پر موقوف ہی۔ لیکن ان دنوں میں خصوصیت سے زیادہ اہم ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حال میں ہندو مسلمانوں کے سربرآوردگان قوم نے الہ آباد میں ایک جلسہ کرکے یہ قرار دیا ہے کہ رفع تنازعات کی تدبیریں ہونی چاہئیں۔ مولوی محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے بہت عمدگی سے اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے:۔

تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ بلکہ کشیدگی عداوت تک پہنچ گئی ہے اور یہ بھی سب کو مسلم ہے کہ اس اختلاف سے اخلاقی۔ اقتصادی۔ سیاسی اور مذہبی غرض بہت سے نقصان ہیں جو فریقین برداشت کر رہے ہیں۔ نیز یہ خواہش بھی اکثر فہمیدہ افراد کو ہے کہ یہ اختلاف دور ہو جائے لیکن کوشش کی جانب آجتک ایک قدم بھی نہیں اُٹھا اور کوشش تو ایک جانب اخباروں میں جس قدر مضامین اس اختلاف کو بڑھانے اور ایک فریق کو دوسرے کے مظالم سُنانے اور کینہ

فروری ۱۹۱۰ء

جلد (۲۰) نمبر (۵)

ایڈیٹر شیخ عبد القادر بی اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

باہتمام منیجر نولکشور پریس میں چھپا اور منشی فضل الٰہی مرغوب رقم نے شائع کیا۔

قیمت سالانہ مع محصولڈاک قسم دوم ۶ عہ فی پرچہ ۱۰ / ۳

کیا واقعی سچائی نہیں ہے؟

تازہ شہادت جناب ... صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات اسکی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے۔

خضاب عالمگیر اسکی تعریف اسقدر ہی کافی ہے کہ یہ بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر دھبہ یا داغ نہیں دیتا۔ بالوں کو ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار بناتا ہے قیمت فی شیشی ۱۲؍

مرض افیون اس عرق کے چار روزہ استعمال سے افیون بلا تکلف چھوٹ جاتی ہے مروڑ اور دست نہیں آتے ہے

دافع بواسیر خونی ہو یا بادی تین دن میں خون بند ہو کر مسّے بلا مزمنیت نابود ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ بھر میں صحت کامل قیمت ۱۲؍

ممیرہ کا سرمہ دھند۔ غبار۔ جالا۔ پھولا۔ سرخی پڑوال۔ ککرے رونکا شرطیہ علاج موتیا بند کے لئے تیر بہدف۔ آنکھوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر ہے فی تولہ ۱۲؍ خاص ممیرہ فی تولہ ۱۲؍

اکسیر الحیات

حلق سے اترتے ہی فوراً کمزور اور معدہ پھٹنا پر اثر کرتی ہے

اکسیر الحیات

دل و جگر و دماغ و معدہ کے امراض کو دُور کر کے ایک اعلیٰ طاقت بخشتی ہے۔

اکسیر الحیات

طاقت کے لئے تیر بہدف اور گئی گذری طاقت کو دوبارہ واپس لانے میں بے نظیر ہے۔

اکسیر الحیات

ضعف مثانہ کے لئے تریاق کامل اور قوت دہ ہے

اکسیر الحیات

کی ایک شیشی استعمال کرنے سے تین سیر خون صالح پیدا ہوتا ہے اور چہرے کی بے رونقی اڑجاتی ہے۔ چہرہ چمکیلا ہو جاتا ہے۔

اکسیر الحیات

کا استعمال تھوڑے عرصہ میں کایا پلٹ کر دیتا ہے ایک کمزور دُبلے پتلے آدمی کو پہلوان بنا دیتا ہے۔

اکسیر الحیات

کی ان گنت خوبیاں ہیں جو لکھنے میں نہیں آسکتیں غرضکہ تمام امراض جسمانی کا حکمی علاج فی شیشی ۱۲؍

تازہ شہادت جناب شیخ فرزند علی صاحب ڈپٹی انجنیر اسسٹنٹ فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات مسیحا سے بڑھکر ثابت ہوئی ہے آپکے علاج کا قائل ہوں

گلگونہ ترنجی اگر آپ حسن و حسن میں دلفریبی کی شان پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ضرور گلگونہ ترنجی منگائیں۔ چہرہ کے تمام قسم کے داغ کیا چھائیاں اور محاسے دور کر کے رخسار مثل گلاب بنا دیتا ہے۔ حسن پرست احباب قدر دانی فرمائیں۔ قیمت ۱۲؍

ہیرا تیل خوشبودار زندہ دل دوستو! ہم نے آپ کی خاطر ایک اعلیٰ اور خوشبودار تیل ہیرا تیل بنایا ہے جس کی خوشبو مشک و عنبر کو مات کرتی ہے۔ بالوں کو نرم اور ملائم اور چمکدار بنانے بنانے کے علاوہ درد سر کو مفید ہے۔ دماغ کی کمزوری اور خشکی دُور کرتا ہے اور بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور بڑھاتا ہے اعلیٰ

صاف نگاتی جناب محمد نور علی کو ۸؍

ڈاکٹر محمد علی سند یافتہ ایل۔ ایم۔ ایس شفاخانہ مشیر صحت شہر فیروزپور (پنجاب)

عرق ماءاللحم انگوری دو آتشہ
جس میں انگور سیب۔ بہی اور تیتر۔ بٹیر مرغ اور ایک سو جڑی بوٹیاں و مشک و زعفران
ملاکر دو آتشہ کشید کیا جاتا ہے۔ نصف صدی سے ہر سال تیار ہوتا ہے اور لاکھوں بوتلیں ملک
بھر میں فروخت ہو چکی ہیں۔ کیا دوا ہے خالص ڈاکٹر کوئی طبیب دس پیتل میں فروخت کر سکتا ہے ہرگز نہیں
عرق ماءاللحم کا پہلا اثر پھیپھڑہ پر ہوتا ہے کہ انکی نازک ساخت کو مضبوط کرکے گلنے سڑنے سے بچاتا ہے۔ بلغم پیدا ہونی بند
ہو جاتی ہے۔ ضیق النفس (دمہ) کو تاڑ دیتا ہے۔ کھانسی ترجلد دور ہو جاتی ہے۔ اور جن بچوں میں سل دق
کی استعداد موجود ہو کوئی ان کے خاندان میں تپ دق۔ سل۔ بخار۔ کھانسی سے مرا ہو تو بطور حفظ ماتقدم اسکے پینے سے روک
سکتا ہے۔ جن طالبعلموں کی چھاتی تنگ اور اس پر چربی کم ہو۔ ذہین۔ ہوشیار ہوں انکو ضرور یہ عرق پینا چاہیئے۔ تاکہ وہ
کثرت محنت سر لاغری کی وجہ سے بے وقت موت کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔
دوسرا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ تمام نروس سسٹم کا ضعف اور کمزوری جس سے حافظہ بگڑ جاتا ہے۔ سر میں درد رہتا ہے۔ چکر آتا ہے
سر میں بوجھ رہتا ہے۔ آنکھیں کمزور۔ تکان۔ پٹھوں میں کھنچاؤ اور سے چینی دور ہو جاتی ہے۔ تریاق مفرات شراب ہے۔
تیسرا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی حرکت کو باقاعدہ کرنے سے دل کی دھڑکن۔ تپش دل غشی اور سانس پھولنا بند ہو جاتا ہے۔
چوتھا اثر جگر پر یہ ہوتا ہے کہ اخلاط ردیہ مادہ سوداویہ کی پیدائش غیر معمولی کو روک دیتا ہے اور اس کے افعال باقاعدہ بناتا ہے
پانچواں اثر معدہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ دور ہونے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ ہضم کی طاقت بڑھ جاتی ہے جو کھاؤ ہضم۔
چھٹا اثر مثانہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف مثانہ کہ باعث کثرت ادرار رقت جریان بند ہو جاتا ہے اور افعال مثانہ اصلی حالت پر آجاتے ہیں
ساتواں اثر اعضا کے سارے سسٹم پر یہ ہوتا ہے کہ قوت دوبارہ پیدا ہونے سے انسان کی خوشگوار
زندگی گذرتی ہے۔ گھر کے لوگ خوش۔ کاروبار کے قابل محنت برداشت کر سکتا ہے۔
آٹھواں اثر خون پر یہ ہوتا ہے کہ گندگی کو خون سے اور اخلاط ردیہ زہریلے اجزا کو تحلیل کرکے خون صالح بکثرت
پیدا کرتا ہے جس سے لاغر فربہ اور بلغمی مزاج سے بلغم کو تبدیل خون کرکے جسم میں تازہ جان
پھونک دیتا ہے جس سے چہرے کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔
الغرض عرق ماءاللحم اعضا کے بیکار کو کار آمد خفتہ کو بیدار۔ غافل کو ہشیار اور ہشیار کو بار تیار بنا دیتا ہے
قیمت ایک بوتل دو روپے (١ عہ) چھ بوتل گیارہ روپے (٥ للعہ) درجن بوتل (١٥ ٥ عنہ)
نوٹ۔ (١) بیرونجات میں تین بوتل سے کم روانہ نہ ہوگا۔ (٢) سے خریدار قیمت پیشگی معرفت منی آرڈر ارسال فرماویں (٣) ریل کے
ذریعہ منگانے پر محصول کم لگیگا۔ ریلوے سٹیشن لائن کا نام صاف لکھیں۔ کتاب حل المشکلات پتہ لکھنے والوں کو مفت دی جاتی ہے
حکیم ڈاکٹر حاجی غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور

مخزن الجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت ۔ (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک (۶؍)

رسوم دہلی ۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ ۔ قیمت مع محصولڈاک ۔ ۱۲؍

منازل السّائرہ ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن (۸؍)

خوابِ ہستی ۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم ۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن (۸؍)

ابومسلم خراسانی ۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن الجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت (۸؍)

مکتوباتِ آزاد ۔ اُردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ با تصویر ۔ (۶؍)

کلامِ نیرنگ ۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی ۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۶؍

انتخابِ مخزن ۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب ۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک (۱؍)

دردِ جانستاں ۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی ۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ ۔ ۸؍

دربار نمبر ۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا ۔ ۱؍

مثنویاتِ میرحسن ۔ مثنوی بینظیر و بدرمنیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کر کے شامل کی گئی ہے (۱؍)

سیرِ تبت ۔ انگریزی کتاب فور ایرس ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۔ ۱۰؍

مرقعِ خوشخطی ۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب عجب رقم لاہور نے نہایت محنت سے بتدی بچوں ۔ کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں ۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اس کے اہتمام میں مدنظر رکھا ہے دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اسوقت ملک میں موجود نہیں اخیر میں منشی صاحب کی تصویر ہے ۵؍

درخواستیں بنام مینجر مخزن ۔ لاہور آنی چاہئیں

(از جناب مظہر تھانوی)

جفا کی انتہا ہے اور میں ہوں | غم راحت فزا ہے اور میں ہوں
ستم سے بھی اب اس نے ہاتھ کھینچا | تمنائے جفا ہے اور میں ہوں
تصور ہے کسی کا مونس غم | خیال دلربا ہے اور میں ہوں
رخ رنگیں کا انکے ہے تصور | خیال خوشنما ہے اور میں ہوں
نشاں ملتا نہیں کچھ قافلہ کا | بس اک بانگ درا ہے اور میں ہوں
الٰہی کعبہ دل کو بچانا | کہ وہ کافر ادا ہے اور میں ہوں
نگاہ سحر آگیں پڑ رہی ہے | وہ چشم فتنہ زا ہے اور میں ہوں
زمانہ برسر بیداد ہے اب | خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں
شریک غم نہیں فرقت میں کوئی | فقط دست دعا ہے اور میں ہوں
معاصی میں ملے کیا خاک لذت | غم روز جزا ہے اور میں ہوں

رسائی یار تک مشکل ہے مظہر
کہ آہ نارسا ہے اور میں ہوں

(از سید رضی حیدر صاحب رضی)

زیبا ہے روئے یار پہ دامن نقاب کا | گویا ہے آفتاب پہ دامن سحاب کا
مستانہ چشم جوشش جوانی دکھا گئی | نشا چھپا نہ بادۂ حسن شباب کا
رہنے نہ دینگی شوخیاں انکی نگاہ کی | آنکھوں میں اب گذر نہیں ممکن حجاب کا
کہتی ہے منہ پہ چلبلی چتون یہ صاف صاف | آنکھوں کے پاس تک نہ گذر ہو حجاب کا

حیراں ہوں مجھ سے کیوں وہ خفا ہو گئے رضی
غصہ کی کوئی وجہ نہ باعث عتاب کا

(از پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول ساقیؔ دہلوی)

کیا شرمسارِ شوق ہیں رنگِ وفا سے ہم | تقریب کوئی ہو تو ملیں دلرُبا سے ہم
آئینہ دل کا صاف ہوا ذکرِ قلب سے | ہمرنگِ جلوہ ہو گئے ذوقِ صفا سے ہم
ایمن کیا ہے شیوۂ تسلیم نے مجھے | بےخوف ہو گئے ہیں ہجومِ بلا سے ہم
تم کو نہیں خیال کسی دردمند کا | شاداں ہیں یا حزیں ہیں تمہاری بلا سے ہم
تسکین ہے کوئی رنگِ تمنا نہیں رہا | فارغ ہوئے ہیں کشمکشِ مدعا سے ہم
بیرخ وہ ہم سے گا رخِ نازک مزاج ہے | کیونکر ملینگے شاہدِ گلگوں قبا سے ہم
بیگانہ آپ ہو گئے خلوت گزیں جو ہیں | اب کیا یگانہ ہونگے کسی آشنا سے ہم

ہے شوقِ دیدِ حضرتِ اقبال کا ہمیں
کس دن ملینگے دیکھئے جادو نوا سے ہم

(از میر مہدی علی صاحب شہید)

دینے والے آپ ہیں الزام کے | چھیڑنے والے دلِ ناکام کے
گر شنہ ہے نالۂ بیتاب میں | وہ چلے آئینگے دلکو تھام کے
کعبۂ ابرو سے پھرنے کے نہیں | ہم بہت پابند ہیں اسلام کے
سب کو ہی معلوم تم سے عشق ہے | کیوں نہ صدقے ہوں تمہارے نام کے
جس طرف لیجائیگا جائینگے ہم | ساتھ ہیں اب تو دلِ ناکام کے
ہم وفا کے واسطے پیدا ہوئے | یہ تو کہئے آپ ہیں کس کام کے
مضطرب بے خانماں وحشت زدہ | نام ہیں یہ عاشقِ ناکام کے
کون رکھے دوستوں سے اب اُمید | سب ہیں اے دل اپنے اپنے کام کے
مر کے اُٹھے اُسکے در سے اے شہید | ایک ہی ہو تم بھی اپنے نام کے

تازہ غزلیں

(از جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے — نہ بن پڑتی ہی ہنستے اور نہ روتے
شبِ فرقت اسی حسرت میں گذری — ہمیں بھی نیند آتی ہم بھی سوتے
کہیں یہ راز کیا اے ہنسنے والے — اگر جیتے تو کچھ دن اور روتے
بہت جھگڑے رہے فرقت کی شب تک — نہ دنیا تھی نہ ہم تھے صبح ہوتے
یہ کس نے خواب میں جلوہ دکھایا — یونہیں ہم رہ گئے سوتے کے سوتے

عزیز اب ضبط سے بھی کام لو کچھ
ارے مر جاؤ گے کیا روتے روتے

(از جناب خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب لکھنوی)

روح نکلے گی جو ساقی ترے ترسانے سے — سیدھی کوثر کو چلی جائیگی میخانے سے
حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزوِ بدن — ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے
آپ بھی جلتے ہیں اوروں کے جلانیوالے — ہم کو روشن یہ ہوا شمع کے جل جانے سے
محفل آباد رہے خیر سے خم کی ساقی — ایک دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے
قطع کر رشتۂ تسبیح اگر دانا ہے — کشتِ امید ہری ہوگی نہ اس دانے سے

دیکھ لو چل کے ذرا سیر یہاں بھی عشرت
دو قدم خانۂ اللہ ہے بت خانے سے

پیاری صورت کے لیے تو نہ بُرائی ہوتی کاش ایسوں کے تو حصّے میں بھلائی ہوتی

درد ہر اک کے لیے یُوں تو بُرا ہوتا ہے لیکن اچھّوں میں یہ اندوہ فزا ہوتا ہی
نہ دکھاتے کہیں اللہ مصیبت آتی اب تو تکلیف کسی کی نہیں دیکھی جاتی
اَے خدا چھین لے آلام زمانے بھر کے اور سب دیدے مجھے درد محبّت کر کے
یہ وفا جان جو جائے تو وفا کر جائے
تیرا بندا تیرے بندوں کے لئے مرجائے

سالِ نَو کی مُبارکباد

مُبارک زمانہ کو دَورِ گلستاں مُبارک ہو عالم کو عشرت کا ساماں
مُبارک ہو دستِ جنوں کو گریباں مُبارک ہو عُشّاق کو چاکِ داماں
عُروسِ چمن کو یہ جوبن مُبارک ہو گلچیں کو گلگشتِ گلشن مُبارک
مبارک دلِ خستہ کو زخمِ پنہاں مُبارک تمنائے شورِ نمکداں
صبُوحی کشو جام و مینا مبارک یہ سرمست و دلکش مہینا مُبارک
مبارک مڈل والوں کو فاقہ مستی مُبارک شریفوں کو یہ دَورِ پستی
مبارک ہو دربار والوں کو دہلی مبارک ہمیں اپنی چھوٹی حویلی
مُبارک ہو انگلینڈ کو جشنِ شاہی مبارک ہو دشمن کو دَورِ تباہی
مبارک ہو مخزن تمھیں سال نَو کی
مبارک تمھیں روز افزوں ترقی

سردار عبد الحمید خاں یوسف زئی

اپنی تمنّا

گھر سے لایا ہے اُٹھا کر ہمیں شوقِ دیدار — دیکھنے آئے ہیں گلشن میں گلِ تر کی بہار
توڑ لیجائیں یہ ہرگز ہمیں منظور نہیں — اپنا دل بھی اسے دیجائیں تو کچھ دور نہیں
بیٹھ کر پاس بہت غور سے دیکھیں گے اسے — ایسے بیٹھینگے کہ پہلو میں بٹھا لینگے اسے

یہ مجھے کون اُٹھاتا ہے یہ قصہ کیا ہے — کیا کوئی عاشقِ شیدا بھی یہاں بیٹھا ہے
کس نے مارا مجھے میں دیکھ تو لوں کیا مارا — بوٹی بوٹی کی ہے فریاد کہ نیزا مارا
پھول کے ساتھ تو موجود اک آفت بھی ہے — اس کی قربت میں تو کانٹوں کی عنایت بھی ہے

شاہدِ گل کو حفاظت کی ضرورت نکلی — دولتِ حسن کو بھی سانپ کی حاجت نکلی
اسکو زیبا ہے یہی جو گلِ خوشبو پالے — شاخِ گل خوب کیا تو نے کہ بچھو پالے
مانتا ہوں تجھے کی تو نے یہ اچھی تدبیر — چاہئے اپنی سی تدبیر پھر آگے تقدیر

پھول بھی تو مگر آرام نہیں پاتا ہے — دامن اسکا بھی تو کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے
کبھی تھپیڑے سے ہوا کے جو بچا ہے ادھر — تو ذرا بھی نہیں آتا ہے انہیں رحم اُدھر
اور بھی دُکھے ہوئے دل کو دکھا دیتے ہیں — زخم یہ پھول سی پتی میں لگا دیتے ہیں

نازکی پر ہی یہ ساتھ آہ یہ حالت کیسی — ہے لکھی پھول کی قسمت میں مصیبت کیسی
جسمِ نازک تو مصیبت کا سزاوار نہ تھا — گل کسی طرح سے بھی قابلِ آزار نہ تھا

کام کو تعلیم قدرت کا طریقہ یاد ہے
سارے استادوں سے بہتر کام اک استاد ہے

مردم اعلیٰ کے دیکھو گر اٹھا کر واقعات
تم پہ کھل جائے کہ تھے کیا محنتی وہ باصفات

چاہیے ہے کام میں ہم کو انہی کی پیروی
کی جنہوں نے صرف تحقیقات اپنی زندگی

جو گئے تجویز انہوں نے کام ہاں اپنے لئے
پائی دادِ مردمی ایسی دلیری سے کئے

آج کل تعلیم کا ڈنکا بجا ہے خلق میں
دھیان اب تہذیب کا کیا جا بجا ہے خلق میں

خلق میں پیدا کیا ہے اب یہ شہرا کام نے
کارخانہ ہے ترقی کا نظر کے سامنے

درجہ اعلیٰ کچھ نہ کچھ ہے تو ریاضت دوستو
قیمتی ہر چیز کی قیمت ہے محنت دوستو

گلشن راحت نہیں پھلتا ریاضت کے بغیر
کام کچھ بھی ہو نہیں سکتا ہے محنت کے بغیر

بوستانِ خلق میں جو مرد گذرے ہیں بڑے
کام تھے انکے زبردست اور بائیں انکی بڑے

رنج اٹھائے کام میں محنت سے بیزار ی تھی
صبر سے محنت انہوں نے رات دن جاری رکھی

ہاں طبیعت بھی نہایت تیز انہوں نے پائی تھی
انکے حصہ میں ذہانت بھی خدا داد آئی تھی

پر اٹھاتے تھے وہ تکلیف اور زحمت رات دن
جان و دل سے وہ کیا کرتے تھے محنت رات دن

بلکہ محنت میں نہیں در اصل زحمت بھی کوئی
کام کچھ امید سے کیجے تو ہے عین خوشی۔

تھا یہ قول سینٹ اوگسٹائن اہلِ یقیں
کچھ نہ کرنے کے برابر کوئی بھی محنت نہیں۔

برکتیں نازل ہوں اس پر حق تعالیٰ کی سدا
صرف جس نے عمر کو کار حلال میں کیا۔

برکتیں اس پر بلائیں فکر کی سہتا ہے جو
اور کار نیک ہر دم سوچتا رہتا ہے جو

الغرض ہر کام میں مشکل روا محنت سے ہے
کام جو دنیا میں ہے وہ کام کا محنت سے ہے

جان ہو قربانِ خوبیٔ بیانِ سنسکرت
اک مثل کیا خوب کہتی ہے زبانِ سنسکرت

شیر وہ ہوتا ہے میدانِ جہاں میں کامیاب
اپنے جو گل سے بدن کو کام میں کر دے گلاب

ضعف ہے انکا قوی ہیں وہ نہایت بزدلے
اپنی ناکامی میں کرتے ہیں جو قسمت کے گلے

(ماخوذ از انگریزی)

ہوئی مقبول اگر یہ نذر پُر تحقیر شادی کی

(ایضاً بقیۂ قافیہ تصویر)

پکارے خامشی میں بھی خوشی سے تصویر شادی کی | مزہ جب ہے کہ مُنہ سے بول اُٹھے تصویر شادی کی
شفق رنگِ خوشی تارے ہیں پھول اور کہکشاں سہرہ | فلک بھی تیری شادی سے بنا تصویر شادی کی
چمن لائے اِدھر سہرے کھنک لائی اُدھر کنگنا | زمیں خاکہ ہے شادی کا۔ فلک تصویر شادی کی
دُلہن کی آنکھ میں دولہا دُلہن دولہا کی آنکھوں میں | جدھر دیکھو نظر آتی ہے اک تصویر شادی کی
ابھی خاموش تھا نوشہ ابھی کرنے لگا باتیں | خدا کی شان مُنہ سے بول اُٹھی تصویر شادی کی
نظر آتی ہے ہر صورت سے صورت شادمانی کی | بنا ہے ہر براتی ہو بہو تصویر شادی کی
دُلہن شرمیلی۔ دُولہا مطمئن خاموش ہیں دونوں | کوئی ہے صبر کا پُتلا۔ کوئی تصویر شادی کی
تصور میں جب آئے ساتھ ہی نوشاد و نوشابہ[1] | وہیں میری نظر میں کھنچ گئی تصویر شادی کی

دیا ہے کام اُس نے تیری شادی میں مصوّر کا
کھچی ہے خامۂ بیتاب سے تصویر شادی کی

[1] دلہن کا نام

محنت

کام سے ہے آدمیت کام سے آرام ہے | آدمی کی زندگانی کا سبب بس کام ہے
آدمی وُہ ہے جسے مطلب ہو کم آرام سے | اسکو ہونا چاہیئے دن رات رغبت کام سے
آدمی آفاق میں جو کام کے لائق نہیں | یاد رکھو اپنے ہمچشموں میں وُہ فائق نہیں
آدمی گر محنتی ہے اور دیانتدار ہے | کام اُسے فکرِ معیشت کے لیئے درکار ہے
کام فخرِ نوجواں ہے کام فخرِ پیر ہے | کام سے سوسائٹی میں عزّت و توقیر ہے

شادی کی مبارکباد

یہ نظم دیر میں شائع ہوئی ہے۔ مگر شعر کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ ہمارے کرم فرما پنڈت نرائن پرشاد صاحب بیتاب نے اپنے دوست مسٹر کیتیا دہیتن بی "منشی" بی۔ اے کی شادی میں (جو ماہ اپریل میں ہوئی تھی) یہ اشعار بطور مبارکباد نظم کئے تھے۔ قافیہ و ردیف کی دقت اور بندش کی آسانی بالخصوص قابل ملاحظہ ہے۔

تری شادی سے دنیا میں بڑھی توقیر شادی کی
زہے طالع زہے قسمت زہے تقدیر شادی کی

جہاں میں بج رہے ہیں شادیانے تیری شادی کے
خوشی عالم میں ہے اور دھوم عالمگیر شادی کی

ادھر شادی کے ہونے سے ترے سر پر بندھا سہرا
ادھر سہرے کے بندھنے سے کھلی تقدیر شادی کی

شباب[۵۱] اپریل کا ہے چیت فصلی کا بڑھاپا ہے
مناتے ہیں خوشی مل کر جوان و پیر شادی کی

تو شادی کیلئے دنیا میں اور تیرے لئے شادی
تری جاگیر شادی اور تو جاگیر شادی کی

ترے گھر کے در و دیوار سے شادی برستی ہے
برنگ ابر باراں چھا گئی تاثیر شادی کی

تری شادی نے اپنا کر لیا پابند شادی کو
منڈھے یہ بیل چڑھ کر بنگئی زنجیر شادی کی

نگاہوں کو تری مد نظر تھی خانہ آبادی
نشانہ جا لگا تھے تاک میں یہ تیر شادی کی

ملی تھیں پہلے صرف آنکھیں مگر اب مل گیا دل بھی
وہ تھی تدبیر منگنی کی۔ یہ ہے تقدیر شادی کی

ترا سہرا یہ جھک جھک کر بلائیں تیری لیتا ہے؟
کہ ہوتی ہے خوشی خوش ہو کے دستگیر شادی کی؟

بہن میری دلہن ہے اور بھائی جان ہیں دولہا
برادر جسم شادی۔ جان ہیں ہمشیر شادی کی

دل بیتاب سمجھا ٹھکانے لگ گئی محنت

---

[۵۱] اپریل کی ۱۶ تاریخ اور چیت فصلی کی ۲۹ ×

مونسِ خلوت کوئی تجھ سا زمانے میں کہاں
وقتِ بد میں تو ہی دائم غمگسار و مہرباں

تیری آمد ہی مبارک دِل مصفّا ہو جہاں
تو ہی بد باطن کے حق میں اک بلائے ناگہاں

عیب کو معیوب کے تو صاف کرتا ہی بیاں
جذبۂ باطن کا ہو جب فعلِ ظاہر ترجماں

مول لیتا ہی مصیبت تجھ سے نادانِ زماں
راحتیں پاتا ہے تجھ سے مردِ عاقل بیگماں

تیری خیر اندیشیاں کرتی ہیں دل کو شادماں
تیری خیر آگاہیاں ہوتی ہیں تسکین بخشِ جاں

ہوتی ہی سچی خوشی اس شخص ہی کو بیگماں
تو لباسِ صدق میں ہوتا ہی جسکا میہماں

تیری خوبی پر ہی دلدادہ ذہینِ تفتہ جاں
کر رہا ہی تو ہی اُس کی غمگساری ہر زماں

سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ

یار کا خط

مرحبا! کاغذ کے ٹکڑے میں ترے قرباں ہوں
خود ہوں گو محسن ترا گرویدۂ احسان ہوں

پارۂ کاغذ نہیں حرزِ دلِ غمگیں ہے تو
قلبِ مضطر کے لئے سرمایۂ تسکیں ہی تو

معدنِ الطاف ہے تو مخزنِ اسرار ہی
جامعِ اوصاف ہے عکسِ دلِ دلدار ہی

کم نہیں تیرے شکن چینِ جبینِ یار سے
شان میں نقطے فزوں خالِ رُخِ دلدار سے

تو اگر دو چار دن بھی غم رُبا آتا نہیں
حق تو یُوں ہی پھر مجھے دُنیا کا کچھ بھاتا نہیں

وصل تیرا کم نہیں کچھ مجھ کو وصلِ یار سے
کیوں نہ ہو تو بھی تو آخر ہے اسی سرکار سے

ہو نہ ہو قایل کوئی اس مختصر تحریر کا
میں سمجھتا ہُوں نوشتہ ہے مری تقدیر کا

جب کبھی مجبور ہونگا داد خواہی کے لئے
پیش ہو گا چار یاروں میں گواہی کے لئے

حالِ دل تجھسے کہونگا پھر کبھی دل تھام کر
منزلوں آیا ہی چل کر اب ذرا آرام کر

امرناتھ محشرؔ

ہندوستاں میں رہتے گذری ہیں آٹھ صدیاں ہر ذرہ اس زمیں کا ہے رازداں ہمارا
ماں باپ ہیں ہمارے مدفون خاک اس میں اس خاک سے بنا ہے ہر نوجواں ہمارا
بیجا نہیں جو اسکو سمجھیں وطن ہم اپنا زیبا ہے گر کہیں ہم ہندوستاں ہمارا
بھارت ہماری ماں ہے ہم اسکے بالکا ہیں ہے اب تو برج باشی کل خانداں ہمارا
بیوپار ہے ہمارا حب وطن کا سودا اس جنس کا ہے جویا یہ کارواں ہمارا

اس دھن میں چار سو ہم پھرتے ہیں مارے مارے
گو تھک گئے ہیں لیکن ہمت نہیں ہیں ہارے

[illegible]

تصوّر

اے تصور تیری خوبی کیا کسی سے ہو بیاں تیری جدت آفرینی کا ہے قائل اک جہاں
تو کرے دم بھر میں زنگار رنگ بزم آرایاں تو اگر چاہے بنا دے ایک گل سے گلستاں
تو مٹائے آکے دل سے رنج کے داغ و نشاں تو دکھائے سیر باغ رشک گلزار جناں
تو بڑھائے حسب منشا شان اشیائے نہاں شئے ہر اک معلوم و مجہول آگئے تیرے عیاں
دور کی دیکھی ہوئی شئے دم میں تجھ سے ہو عیاں دور اندیشی میں اک تو ہی ہے یکتائے زماں
کھینچتا ہے اس طرح تصویر یار دلستاں دیکھکر صنعت تری ہوتے ہیں گم تاب و تواں
خواہشوں کے پیش کرتا ہے تو نادر ارمغاں تو بناتا ہے عجب دلچسپ قصّے داستاں
جمع کر دیتا ہے تو اک دم میں گنج شایگاں صرف کر دیتا ہے اک لمحے میں دولت بیکراں
تجھ سے بنتا ہے سکندر دم کے دم میں سرگراں تجھ سے بنتا ہے تونگر دم میں مفلوک زماں
کیسی ہے خود اختیاری ذات میں تیری نہاں کوئی مجبوری نہیں جو روک لے تیری عناں
کیوں نہ شاعر تجھکو چاہیں شاعروں کی تو ہے جاں کیوں نہ عارف تجھ کو مانیں تو ہے اسرار زداں

مسکنِ قدیم اپنا ہی سرزمینِ بطحا | پہلے ہوا جہاں سے چشمہ رواں ہمارا
جو چاہے دیکھ آئے بیت الحرام مکہ | قائم ہے اُس زمیں پر اب تک نشاں ہمارا
مرجع ہمارا اب تک ہی خاکِ پاکِ یثرب | جس خاک میں ہے سوتا وہ گلّہ بان ہمارا

ہم اہلِ بادیہ ہیں اسلام کے فدائی
اس دین کے فدائی اس نام کے فدائی

ضرب المثل ہماری مہماں نوازیاں ہیں | ہم کو عزیز جاں سے ہے میہماں ہمارا
حاتم سے نام روشن ہمت کا ہے ہمارے | جود و سخا میں عالم ہی مدح خواں ہمارا
ہم نے کبھی کسی سے آنکھیں نہیں چرائیں | مانگا ہی ہم سے اُس نے گو نقدِ جاں ہمارا
دب کر کسی کے آگے گردن نہیں جھکائی | اسواسطے لقب ہی شیرِ ژیاں ہمارا

ابنائے بادیہ ہم ڈرتے نہیں کسی سے
البتہ چھیڑ پہلے کرتے نہیں کسی سے

وہ آبنائے مغرب یعنی کہ جبلِ طارق | صدیوں اُڑا کیا ہے اُس پر نشاں ہمارا
یہ سرزمینِ مشرق کہتے ہیں ہند جسکو | قرنوں رہا ہے اسپر سکّہ رواں ہمارا
ہرقل کا تاج اب بھی ہے زیبِ سر ہمارے | ہے پائے بوس اب تک تختِ کیاں ہمارا
دشمن جو ہم سے آ کر میدان میں لڑے ہیں | بھولے نہیں وہ اب تک زخمِ سناں ہمارا
پہنچے ہیں ہم یہاں تک خیبر کو پار کرکے | کیا روکتا ہمالہ بحرِ رواں ہمارا
قومیں یہاں کی ہم سے پسپا ہوئی ہیں اک اک | ہر جنگ میں رہا ہے پلّہ گراں ہمارا
مدت تک اس زمیں پر کی ہم نے حکمرانی | صدیوں رہا ہے تابع ہندوستاں ہمارا
گھر بار ہم نے اپنا چھوڑا اسی کی خاطر | اس درجہ مہرباں تھا کچھ میزباں ہمارا

اب وہ ہوا یہاں کی ایسی ہمیں خوش آئی
ہم نے عرب سے آ کر بستی یہاں بسائی

شاعری

شاعر کا اوجِ طبعِ سدرہ سے کم نہ تھا
رکھتی تھی جن دنوں پر پرواز شاعری

خدمت گذارِ شاعرِ خوش گو تھا ہر امیر
تھی ہر وزیر و شاہ کی دمساز شاعری

گرویدہ اک جہان تھا اس کے جمال کا
کرتی تھی اپنے حسن پہ خود ناز شاعری

ہوتی تھی ہر رئیس کی مجلس میں اس کی قدر
رہتی تھی بزم و رزم میں ممتاز شاعری

بھرتے تھے موتیوں سے سب اہلِ سخن کے منہ
کرتی تھی شاعروں کو سرفراز شاعری

تسخیرِ قلب ہوتے تھے تاثیرِ شعر سے
حسنِ بیاں میں رکھتی تھی اعجاز شاعری

شاعر کی قدر فخرِ دو عالم نے کی حفیظ
رکھتی ہے یہ سند پہ اعزاز شاعری

حفیظ جونپوری

ہمارا ترانہ

اغیار سے یہ کہہ دو ہے یہ مکاں ہمارا
یہ سرزمیں ہماری یہ آسماں ہمارا

یہ باغ و راغ سارے جتنے ہیں سب ہمارے
یہ آبجو ہماری یہ گلستاں ہمارا

ہوتے ہیں کون اس میں صیاد اور گلچیں
مدت سے اس چمن میں ہے آشیاں ہمارا

اپنے لہو سے ہم نے ہر نخل کو ہے سینچا
ہم باغباں ہیں اس کے یہ گلستاں ہمارا

گلگشت ایسی بھائی کچھ ہم کو اس چمن کی
جس سے نہ یاد آئی پھر بھول کر وطن کی

اے اجنبی مگر تو واقف نہیں عرب سے
جو پوچھتا ہے ہم سے نام و نشاں ہمارا

میاں نے قسم دی - بیوی اسکو اچھا سمجھنے لگیں - گھر میں یہ سنتی ہیں کہ اماں جان بڑی بوڑھی ہیں - میاں اُنکے بیٹے ہیں اُنکے خورد ہیں - اسلئے شرافت کا تقاضا اسی امر کو سمجھتی ہیں کہ اماں جان کی بات رد نہ کریں اور اُنکے مقابلے میں میاں کو بالکل کچھ نہ گردانیں - کس قدر جہالت کا خیال ہے - میاں اور بیوی کا رشتہ ایسا رشتہ ہے کہ اس میں تیسرا آ ہی نہیں سکتا - خواہ وُہ ماں ہو یا اپنا بچہ ہی کیوں نہ ہو - میاں کو مقدم بیوی ہے اور بیوی کو مقدم میاں ہے - جب یہ ہوتا ہے تو میاں اور بیوی یکجان اور دو قالب ہوتے ہیں - اور جب تک ایسا نہ ہو تب تک میاں بیوی کے تعلقات میں ضرور رخنہ باقی رہتا ہے -

بیوی - آپ مجھے لکچر بلانے لگے - بہت خوب -

میاں - آپ یُوں سمجھیں -

بیوی - بس اب سو تے سنسار اور جاگے پاک پروردگار" آپ بھی جا سوئیں اور اِس لکچر کو پھر کے لئے اُٹھا رکھیں -

"زمزم"

اولڈ بوائے - علیگڈھ کالج کے ہواخواہ بالعموم اور پرانے طلبہ بالخصوص اس نئے ماہوار رسالہ کا جو چند ماہ سے مقام بنارس سے جاری ہوا ہے نہایت خوشی سے خیر مقدم کرینگے - اسکے اڈیٹر عشرت حسین صاحب بی - اے اور اسسٹنٹ اڈیٹر سید منظر علی صاحب ہیں - دونوں صاحبان اپنے رسالہ کو پرانے طالبعلموں کے لئے دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے - امید ہو کہ علیگڈھ کے سب پرانے طلبہ جو عموماً خوشحال اور کامیاب صحاب ہیں - اس نئے علمی پودے کی آبیاری کرینگے *

پیدا ہو جاتی ہیں اور نہ اپنے اوپر بھروسا رہتا ہے۔ نہ بے سہارے کے کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی لگام دوسرے کے ہاتھ میں دینے سے خوش رہتے ہیں۔

بیوی۔ ناصر خود جب اماں جان سے اتنا دبتے ہیں تو کیا اُنکی بیوی کو نہ دبنا چاہئے۔

میاں۔ ناصر صاحب بھی تو اسی طرزِ زندگی میں پرورش پا چکے ہیں جس کی میں نے اوپر ہجو کی۔ ولایت کے درزیوں نے اگر اُنکی پوشش بدل دی تو کیا ہے۔ اب دیکھئے عورت تو عورت ناصر مرد ہو کر اتنی جرأت نہیں رکھتا کہ جس بات کو بُرا نہیں سمجھتا۔ اُس پر کُھلم کُھلا عمل کر سکے۔ برخلاف اِس کے چوری چھپے کام کرنے کو معیوب نہیں سمجھتا۔ گویا اماں جان کے ڈر نے صاحبزادے کو اس قدر چوٹا بنا دیا ہے کہ اُن کی چوری کا لپکا ولایت کی رہایش میں بھی نہ گیا۔ "ڈیر کینیزڈ" اور "کنسر ویٹو" کہنا تو سیکھ لیا۔ مگر ہمیں یہ مُردہ ہی دیکھنا نصیب ہو جواب کے چلنے سے انکار کر دو کی قسم کے فقرے نہ بھولے۔ یعنی اُنکے دماغ میں سے وہ اوہامی کثافت ابھی تک نہیں نکلی جو گُھٹی کے ساتھ ہمیں پلائی جاتی ہے۔ جب میاں ایسے ہیں تو بیوی تو ان سے کچھ درجہ بڑھی ہُوئی ہی ہونی چاہیئے۔ وہ یہ فقرہ سنتے ہی چپ ہو کر یوں منہ بھینچے جا رہی ہیں۔ کہ گویا ادھر یہ لفظ مُنہ سے نکلے اور اُدھر اِدھر کے مُرغِ رُوح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ بیچاری مجبور ہے کیا کرے آخر میاں کا کہنا ماننے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اور یا تو کس شد و مد سے تھیٹر جانے سے انکار تھا اور یا ایک ہی قسم پر جھٹ سے تیار ہو گئیں مطلب یہ کہ نہ کوئی اصُول ہے نہ کسی کام کی بُرائی بھلائی دریافت کرنے کی قابلیت اماں جان تھیٹر میں جانے کو بُرا سمجھتی ہیں۔ دُلھن جان بھی بُرا سمجھتی ہیں

پائچوں کا پاجامہ ہے۔ گہنا ہاتھوں میں سونے کا بے ترتیبی کے ساتھ کہنیوں تک پہنچتا ہے۔ کان دُہرے ہوگئے ہیں۔ گلے میں سونے کے ساتھ پوتھوں اور شیشے کے جوے بھی پہن لئے ہیں۔قد چھوٹا۔ بدن دوہرا۔

بیوی۔ (قہقہہ لگاکر) یہ تم نے کیونکر جانا۔

میاں۔ اس قسم کے خیالات کی عورت ٹھیٹ دیسی ہوگی اور ایسا ہی لباس پہنیگی۔

بیوی۔ اس کا کیریکٹر بتاؤ۔

میاں۔ کیریکٹر کی سُنیئے۔ وُہ فرماتی ہیں "اِتنا بڑا گھر اماں جان کے نہ ہونے سے سُونا سُونا معلوم ہونے لگا"۔ بچّوں کے نہ ہونے سے تو گھر سُونا سُونا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وُہ جب ہوتے ہیں تو غُل غپاڑہ رہتا ہے۔ لیکن اماں جان کے نہ ہونے سے انکا گھر جو انکو سُونا سُونا معلوم ہونے لگا تو غالباً انکی اماں جان ہر وقت چلّاتی رہتی ہونگی اور اگر ایسی اماں جان کی وہ تعریف کرتی ہیں تو قطعی ظاہر داری برتتی ہیں۔ اور یہ ٹھیٹ دیسی لوگوں کا قاعدہ کلیہ ہے پھر ارشاد کرتی ہیں "اصل یہ ہے کہ کسی بزرگ کے گھر میں ہونے سے کچھ دل کو اطمینان سا رہتا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بی ناصر دلہن نری دلہن ہی ہیں۔ اگر وُہ گڑیا ہوتیں تو اور بھی اچھا تھا۔ یعنی خود کچھ بھی نہ کرنا پڑتا۔ ہر وقت طاق میں سجی رہتیں۔ اس فقرے سے صاف ظاہر ہے کہ ناصر دُلہن کو اپنے اوپر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ نہ انکی اپنی کوئی رائے ہے۔ نہ اپنی رائے پر اطمینان ہے۔ اس لئے اماں جان کے سہارے جیتی ہیں۔ لیکن کہیں خدانخواستہ اماں جان جنّت آشیان ہوگئیں۔ تو کیا ہوگا۔ یہ ہمارے ہندوستانیوں کی طرز زندگی کا بہت کمزور پہلو ہے۔ بڑوں کے آگے چھوٹے کوئی چیز ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دبتے دبتے غلامی کی خصلتیں

میں درستی ہوئی ہے۔ بنت الوقت کو وُہ قصّہ ضرور پڑھنا چاہئے۔
میاں۔ نہیں مگر وُہ تو بہت محبت والی بیوی ہیں۔
بیوی۔ لفظی اظہار میں تو کم سے کم ضرور۔ تیسرے اور چوتھے مسئلے کا حل اب تم کرو۔
میاں۔ شاعری اگرچہ زمانۂ جاہلیت کی نشانی ہے لیکن اس کا لُطف اُٹھانے کے لئے بڑی لیاقت اور علم درکار ہے اور ہماری اُردو اور فارسی کی شاعری کی ظاہری صُورت ایسی ہے کہ جو شخص صرف لکھ پڑھ ہی سکتا ہو اور اچھا تعلیم یافتہ نہ ہو اسکے لئے شاعری میں کسی قسم کا حصّہ لینا قطعی مخربِ اخلاق ہے۔ اور چونکہ ہماری مستورات کو اور بہت سے مفید مشاغل موجود ہیں۔ اِس لئے انکا اس سے پرہیز ہی لازم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اُردو کے ناول بھی مضر سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں تاریخی قصص مثل قصص ہند۔ مذہبی کتب مثل الکلام اور بزرگانِ اسلام کی سوانح عمری اور سفرنامے انکے لئے زیادہ فائدہ مند اور دلچسپ ہونگے۔ تاریخ میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند کے بہت سے حصّے نہایت دلچسپ ہیں۔
اب رہا بیوی کو میاں کے نام لیکر پکارنے کا مسئلہ۔ میری رائے میں نام لینا تو ہرگز مناسب نہیں۔ اِس لئے کہ ہماری سوسائٹی میں صرف اپنے سے چھوٹے کا نام لیتے ہیں۔
بیوی۔ تم نے ناصر دلہن کی نسبت کیا رائے قائم کی؟
میاں۔ اچھّی خاصی بھولی بھالی پیاری دُلہن ہے۔ اگرچہ بنت الوقت صاحبہ اسکو روشن خیال لڑکیوں میں شمار کرتی ہیں لیکن میرے ذہن میں تو اُنکی تصویر یوُں آئی ہے کہ ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہے۔ پور پور چھلّے پہنے ہیں۔ رنگ سانولا ہے۔ گول چہرہ ہے۔ جُھکی ہُوئی بھر یاں ہیں۔ ڈھیلے

خفگی پر بعض بعض جگہ اپنے خاوند کو ڈانٹا ہے تو اس سے مجھے چڑے چڑیا کی کہانی کا وُہ فقرہ یاد آتا ہے کہ "وُر موئے میری آنکھیں دُکھتی ہیں"۔ اور ملاپ پر وُہی کہ "ماری کوٹی کونے لاگی مَیں کیا تجھ سے روٹھی تھی"۔

بیگم صاحبہ کا رُوٹھنا۔ میاں کا خوشامد کرنا۔ اور انکے سوال جواب میں تھیٹر اور گلزار نسیم کا مزا آتا ہے۔ میاں بیوی سے ایک تصویر دکھاکر اسکی تعریفوں پر تعریفیں کرتے ہیں اور آخرکار بیوی صاحبہ جل بھُن کر اٹھوانٹی کھٹوانٹی لیکر جا پڑتی ہیں اور میاں مناتے ہیں تو فرماتی ہیں "مجھ سے کیا کام اپنی پسند والی سے جا کر ایسی خوشامد کی باتیں کرو"۔ یہ اندرسبھا کا سین نہیں تو اَور کیا ہے۔

میری رائے میں تو بنت الوقت کی ساس کی نصیحت بہت درست ہے۔ کہ میاں کے آرام کا خیال رکھنا چاہیئے اور اس سے خواہ مخواہ نہ الجھنا چاہیئے۔ خاصکر جب وُہ تھکا ماندہ ہو۔

میاں۔ مَیں تمکو اتنا عقلمند اور نکتہ سنج نہ سمجھتا تھا۔ اچھا یہ تو پہلے سوال کا جواب ہوا۔ دُوسرے سوال کا کیا جواب ہے۔

بیوی۔ اسی میں وُہ بھی آگیا۔ ہر وقت میاں سے چھیڑ چھاڑ بنت الہوا کو کرنی جائز ہے۔ میاں بیوی کے رشتے میں عشق کا چٹخارہ متانت لیا ہوا ہونا چاہیئے ہر وقت طنزاً گفتگو کرنا بدمزاجی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہر ایک خاوند بنت الوقت کے میاں کی طرح سہار کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ اگر جاہل ہے تو وُہ بھی اپنی بدمزاجی دکھائیگا اور ممکن ہے ماتا پاٹی کی نوبت پہنچے۔ اگر پڑھا لکھا ہے تو وُہ گھر میں آنا چھوڑدیگا۔ تم نے ایک دن مجھے شیکسپیر کا ایک قصہ سُنایا تھا جس میں ایک بدمزاج بیوی کی اوّل مرمت اور آخر

بھی ازبس ضروری تھا۔ نرس کیا ہوگی۔ کوئی ایسی ویسی ہوگی جو بچہ ایسا ضدی ہے کہ باوا کے سر پر چڑھا جاتا ہے۔

میاں۔ آجکل کے مضامین میں عورتوں نے چھری کانٹے سے میز پر کھانے نرس۔ سائے وغیرہ کا تذکرہ کرنا فیشن کر رکھا ہے۔ اِس کے بغیر اُنکی انگریزیت میں فرق آتا ہے۔

بیوی۔ انگریزیت یا میمیت ؟

میاں۔ (جواب ٹال کر) اچھا اس مضمون میں جو نکات بحث طلب ہیں اُن پر بھی تم نے غور کیا۔

بیوی۔ مثلاً ؟

میاں۔ مثلاً یہ کہ میاں بیوی کی محبت خط مستقیم کی سی رہنی چاہیے۔ ایک۔ بیوی کو ہر وقت میاں سے طنزاً گفتگو کرنی چاہیے۔ دو۔ بیویوں کو اپنا دماغ شعراء کے کلام کے مباحثے میں صرف کرنا چاہیے۔ تین۔ بیوی کو میاں کا نام لینا چاہیے۔ یہ چار مسئلے ہیں۔

بیوی۔ بی بنت الوقت صاحبہ کا یہ خیال کہ "شادی کے یہ تین سال مجھ کو پہاڑ معلوم ہوتے۔ اگر میری اُنکی ہفتے میں دو ایک دفعہ لڑائی نہ ہوتی رہتی"۔ نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا خیال ظاہر کرنے والی اپنا نام بنت عنب رکھ لے تو زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ عربدہ جوئی اُسی کا کام ہے۔ شکر رنجی کے گھاؤ بھی زیادتی سے دل بدن گہرے ہوتے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ اُسی میں کھنسی ہو جاتی ہے۔ گھڑی گھڑی لڑنے جھگڑنے سے اور پھر ملنے سے چھچھور اپن اور بچپن معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں جو ایک جگہ بنت الوقت نے اقرار فرمایا ہے کہ میری خفگی کوئی سچ مچ کی تھوڑا ہی ہے اور اس جھوٹی

کہنے گئی کہ تم ایک بھی نہیں دکھا سکتے" اور اس پر طرّہ یہ کہ خفا بھی ہو گئیں لیکن انکا خاوند بھی کوئی بیچارا بڑا ہی غریب مزاج آدمی ہوگا جو اپنا کام چھوڑ کر بیگم صاحبہ کے حکم پر دوڑا دوڑا چلا آیا - تم تو اوّل آتے ہی نہیں اور جو آتے تو میری جان کھا جاتے کہ ایسی فضول بات کے لئے مجھے کام پر سے بلایا۔

میاں۔ شاید ان میاں بیوی کی نئی شادی ہوئی ہوگی جو کام کی پروا نہ کی۔

بیوی۔ نئی شادی کہاں سے ہوتی ہوگی - بچّہ تو اتنا بڑا موجود ہے کہ باوا کی انگلی پکڑ کر اُنکے ساتھ کچہری جانے کو مستعد ہے۔

میاں۔ جی ہاں یہ حماقت مزید برآں - جس طرح جُہلا بچّوں کو عید کی نماز میں بیوی کے کہنے سے لیجاتے ہیں اور نمازی نماز پڑھتے ہیں اور بچّے روتے رہتے ہیں۔

بیوی۔ لے کیسے نہ جاتے - بیگم صاحب کا حکم بھی تھا - دیکھو تابعدار میاں ایسے ہوتے ہیں - تم جیسے تھوڑا ہی - کہ بچّے کو میرے ساتھ بھی نہیں سونے دیتے۔

میاں۔ تم تو دوسری بحث چھیڑتی ہو - مگر یہ دیکھا کہ بیوی صاحبہ نے بچّے کو ضد کرنے کا سبق کس صفائی سے دیا ہے اور میاں سے کس طعن سے بات کی ہے کہ اگر قیصر کی جان تم کو ایسی دوبھر ہے" - گویا بے کچہری گئے قیصر مرہی جاتا۔

بیوی۔ شاید دوبھر کا محاورہ کھپانا ہو اس لئے یہ فقرہ لکھدیا ہو۔

میاں۔ ممکن ہے - اور دیکھو میاں جب کچہری سے واپس آتے ہیں تو باوجود اماں جان کی نصیحت کے میاں سے بحث کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑا - اور اُدھر قیصر صاحبزادے کو دوسرے دن کے لئے پھر میاں کے کندھے پر سوار کرا دیا کہ قیصر ہمارے کل پھر چلے جانا خفا نہ ہو" - کچہری کیا ہوئی - نانی جی کا گھر ہو گیا۔

بیوی۔ تم نے ایک بات کا خیال نہیں کیا مزاج میں شیخی بھی ہے - چنانچہ نرس کا ذکر

تعلقاتِ زن و شو

مکالمہ

میاں۔ تم نے مخزن میں بنت الوقت کا مضمون دیکھا۔ یہ بتاؤ کہ وہ تمکو کچھ پسند ہے؟

بیوی۔ کس لحاظ سے؟

میاں۔ آیا اُس میں جو کیرکٹر دکھائے گئے ہیں اُنکو تم پسند کرتی ہو۔

بیوی۔ مجھے تو وہ اصلی کیرکٹر نہیں معلوم ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی گڑیاں۔ کہ چار کالے ڈورے سے ٹانکے مار دیئے آنکھیں ہو گئیں۔ دو اور لگا دیئے بریاں بن گئیں۔ ایک کپڑے کو گول مروڑ کے متوازی سی دیا ہاتھ ہو گئے۔

میاں۔ بہت زور کی کہی۔ واقعی اگر بنت الوقت کوئی اصلی جیتی جاگتی بیوی ہوں تو بڑی کڑکنی بیوی ہیں۔ یہ بھی مانتی جاتی ہیں کہ "میری تو دونو جہان کی فلاح اسی شخص (خاوند) کی ذات پر منحصر ہے" اور اگر وہ کہیں تو اپنا کلیجہ تک نکال کے رکھدوں"۔ اور خاوند سے ذرا ذرا سی باتوں پر لڑتی بھی جاتی ہیں۔ سارے قصے میں شروع سے اخیر تک ایک جگہ یہ نہیں دکھایا کہ اُنہوں نے خاوند کی کونسی بات مانی یا خاوند کے لئے کیا تکلیف گوارا فرمائی۔ اُلٹا اُسکو خواہ مخواہ ستایا ہے۔

بیوی۔ جی ہاں۔ وہ تو بیچارا کام میں مصروف ہے اور آپ ایک شعر کے معنی پر بحث کرنے کے لئے اور امیر اور داغ کا مقابلہ کرنے کو جس طرح صاحب بہرے کو پکارتا ہے اِس طرح اپنے خاوند کو آواز دیتی ہیں اور اپنی بات کی پیچ کی یہ حالت ہے کہ خود ہی فخریہ لہجہ میں فرماتی ہیں"۔ مگر میں بھی

خیال میں نہایت سمجھدار لوگوں کو گھنٹوں پتوں کا ایک سٹھا تقسیم کرتے ہوئے اور
پھانٹتے ہوئے دیکھنا اور کوئی گفتگو سوائے بازی کے اصطلاحات کے نہ کرتے
ہوئے اور کوئی دوسرا خیال سوائے سُرخ یا سیاہ دھبوں کے جو مختلف رنگوں میں
باہم ترتیب دیئے گئے ہوں آتے ہوئے نہ دیکھنا۔ نہایت تعجب خیز ہے۔ کیا کوئی
آدمی اس قسم کے لوگوں کو یہ شکایت کرتے ہوئے کہ زندگی کا زمانہ بہت کم ہے۔
سُنکر نہ ہنسیگا۔ اسٹیج کو اگر باقاعدہ ہو تو نہایت اعلیٰ اور مفید دلچسپیوں کا مخزن
سمجھنا چاہیئے۔ لیکن دل کبھی کسی چیز پر اسقدر رغبت سے متوجہ نہیں ہوتا جس قدر
کہ ایک نہایت خاص دوست کی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ درحقیقت زندگی
میں دور اندیش اور نیک دوست کی صحبت سے حظ اُٹھانے سے بہتر کوئی برکت
نہیں۔ وُہ دل کو تسلّی دیتا اور ہلکا کرتا ہے۔ سمجھ کو ترقی دیتا اور صاف کرتا ہے۔ تخیل
اور علم کو بڑھاتا ہے۔ نیکی اور اچھی تجاویز کو پیدا کرتا ہے۔ خواہشات کو قابو میں رکھتا
اور ٹھنڈا کرتا ہے اور زندگی کے اکثر خالی اوقات میں باعث دلچسپی ہے۔ ایسے
خاص دوست کے علاوہ ایک شخص کو ایک ایسے شخص سے عام گفتگو کرنیکی کوشش
ہونی چاہیئے جو ان لوگوں کو جن سے کہ وُہ گفتگو کرتا ہے محظوظ کر سکے اور اپنا اچھا اثر
ڈال سکے اور ان دونوں صفات کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اور بہت سے مشاغل زندگی ہیں جنکے شامل کرنیکی ہر ایک فردِ بشر کوشش کرے۔ تاکہ تمام موقعوں پر
کچھ نہ کچھ مشغلہ ہو بہ نسبت اسکے کہ سُست پڑا رہکر دماغ پریشان کیا جائے یا کسی ایسے جذبہ سے جو
اتفاق سے سُستی کی دلدل میں پھنسانا چاہے سُستی میں پڑ جائے۔

ایک آدمی کا جو علم موسیقی نقاشی یا نقشہ کشی کا مذاق رکھتا ہے۔ ایک ایسے شخص سے مقابلہ کیا جائے جو
ان ہنروں سے مذاق نہیں رکھتا تو مقابلۃً مذکورہ بالا شخص ایک دوسری سمجھ کا آدمی کہا جاسکتا ہے لیکن زندگی
کے تمام مشاغل میں سے اپنے خالی اوقات کے پُر کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی امر نہیں کہ مفید اور دلچسپ

اُمیدوں سے پُر ہو جاتا ہوا اور اُس کی حضوری کے خیال سے جو ہر جگہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ مسرور ہوتا ہے۔ یا برخلاف اس کے اپنے خوف۔ غم اور تصوّرات کو اُس پروردگار حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہے۔

مَیں نے اس موقعہ پر انسان کے صرف نیک ہونے کی ضرورت کو اس لئے مدّنظر رکھا ہے۔ تاکہ وُہ کچھ کر سکے اور بیگانہ نہ رہے۔ لیکن اگر ہم آگے غور کریں کہ نیکی کرنا اُسوقت تک کے لئے جس وقت تک کہ وُہ ختم ہو۔ صرف ایک مشغلہ ہی نہیں بلکہ اُس کا اثر ہماری بقا کے اُن حصّوں پر پڑتا ہے جو ہماری قبر کے بعد ہیں اور یہ کہ ہماری تمام آئندہ بقا کی جزا یا سزا اُنہی گھنٹوں پر منحصر ہے جنکو ہم اس دُنیا میں نیکی یا بدی میں صرف کرتے ہیں۔ پس اس طریقہ سے اپنے وقت کو گذارنے کے لئے ہمارے پاس دو دلیلیں ہیں۔

جبکہ ایک آدمی صرف تھوڑا سا ذخیرہ اپنی حالت درست کرنے کے لئے رکھتا ہے۔ اور اُسکو اچھی طرح عمل میں لانے کے مواقع بھی رکھتا ہے۔ اُس کی بابت ہم کیا خیال کرینگے۔ اگر وُہ اُنیس حصّہ برباد کردے اور شاید نیز بیسواں حصّہ اپنی بربادی اور ضرر میں صرف کرے لیکن بریں وجہ کہ دماغ میں ہمیشہ جذبات نہیں ہو سکتے اور نہ نیکی کرنے کے درجہ تک کا اُس میں جوش ہوتا ہے۔ یہ امر ضروری ہے کہ ایسے فرصت کے اوقات کے لئے مناسب مشاغل بتائے جائیں۔

مجھے یہ امر ظاہر کرنا ضروری ہے کہ میرے خیال میں ایسے مشاغل سے جو صرف بے ضرر ہوں اور جنکے اختیار کرنے کی سوائے اُنکی بے ضرری کے اَور کوئی وجہ نہ ہو ہمہ تن مانوس ہوجانا عقل رکھنے والی مخلوقات کے درجہ سے گھٹا ہوا ہے اس امر کا فیصلہ مَیں نہیں کرونگا کہ آیا کسی قسم کے کھیل کے متعلق اس سے کچھ اَور زیادہ بھی ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر ہے کہ میرے

اوّلاً نیکی کرنا اُس کے نہایت عام معنوں میں۔ وُہ خاص تجویز جس میں کہ معاشرتی نیکیاں شامل ہیں ایک نہایت محنت پسند دل کو کام میں لگا سکتی ہے اور ایک آدمی کو اُس شخص سے جس کی زندگی حد درجہ کی مشغولیت میں گذرتی ہو زیادہ مشغول رکھتی ہے۔ جاہل کو صلاح دینا حاجت مند کی ضرورت رفع کرنا اور ستم رسیدہ کو تسلّی دینا وُہ فرائض ہیں جو قریب قریب ہماری روزانہ زندگی میں پائے جاتے ہیں ایک آدمی کو اکثر ایک جماعت کی برافروختگی کے دُور کرنے کے ایک مستحق آدمی کی بابت انصاف کرنے کے۔ حاسدوں کے حسد کی آگ بجھانے کے۔ غصہ وروں کے غصہ کو فرو کرنے کے اور متعصب لوگونکو راہ راست پر لانے کے اتفاقات ہوتے ہیں اور ان میں سے سب مشاغل ایک سمجھدار انسان کے لئے مناسب و موزون ہیں۔ اور اُس شخص کے لئے جو اپنی خوشی سے اُن میں اپنے آپکو مشغول کر سکے اطمینان بخش ہیں۔

ایک قسم کی اَور نیکی ہے جو اُن تنہا گھنٹوں کے لئے جن میں ہم کلیتاً جلسوں اور باہم گفتگو کرنے سے علیحدہ خود اپنی ذات پر چھوڑ دئے جاتے ہیں مشغلہ ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب اُس تعلّق خاص سے ہے جو ہر ایک عقلمند مخلوق کو اپنے بزرگ و برتر پیدا کرنے والے کے ساتھ رکھنا چاہئے۔ وُہ آدمی جسکی عادت خدا کی حضوری میں رہنے کی ہے ہمیشہ خوش دل رہتا ہے اور اپنے آپ کو اپنے سب سے زیادہ عزیز اور اچھے دوست کی صحبت میں خیال کر کے ہر لمحہ اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔ وقت اُس پر کبھی گراں نہیں گذرتا اور یہ ناممکن ہے کہ وُہ اکیلا رہے (کیونکہ اس کا خدا ہے اس کے ساتھ) اُسکے خیالات و جذبات اُن گھنٹوں میں جنہیں کہ اَور لوگوں کے نہایت بیکار رہتے ہیں۔ مائل بہ مشغولیت رہتے ہیں۔ وُہ جب ہی کہ معاملات دُنیا سے دُوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا دل رُوحانی آگ سے مشتعل ہو جاتا ہے اور

اگر تمام وقت جو موجودہ لمحہ اور اگلے چوتھائی سال کے آخری دن کے درمیان اس کے سُود ادا ہونے کا دن واقع ہے۔ نیست و نابود ہو جائے۔ ایک مدبّر اس امر پر کہ اُس کی زندگی کے تین سال ضائع کر دیئے جائیں قانع ہو جائیگا اگر وُہ معاملات کو زمانہ کے ایسے انقلاب کے بعد اُسی طرح جس طرح کہ اس کے دماغ میں ہے ترتیب دیکھیگا۔ ایک عاشق بخوشی اپنی زندگی کے اُن تمام لمحوں پر خط بطلان کھینچنے کے لیئے تیار ہے جو اُس کے معشوق کی خوش آیند مُلاقات کے اور اس وقت کے درمیان گذرنیوالے ہیں۔ پس اس تیزی سے جس تیزی سے کہ ہمارا وقت گذرتا ہے۔ ہم اپنی زندگی کے اکثر حصّوں میں بہت خوش ہوں اگر وُہ اس سے زیادہ تیزی سے گذرے۔ دن کے بہت سے گھنٹے جو ہم پر گراں گذرتے ہیں۔ صرف وُہی نہیں بلکہ ہم سال کے سال اُڑا دینا چاہتے ہیں اور وقت کو بالکل اس طرح گذارتے ہیں جس طرح کہ کوئی ایک ایسے مُلک میں ہو کر گذرے جو بہت سے جنگلوں اور چٹیل میدانوں سے پُر ہو۔ جس سے کہ وُہ اُن چند چھوٹی بستیوں یا خیالی آرام کے مقاموں تک جو اس کے بعد واقع ہیں پہنچنے کے واسطے خوشی خوشی جلد گذرنا چاہتا ہو۔

اگر ہم اکثر آدمیوں کی زندگی کو بیس حصّوں میں تقسیم کریں تو ہم کو یہ امر معلوم ہوگا کہ اُن بیس حصّوں میں سے کم سے کم انیس خالی ہیں جو نہ تو خوشی ہی میں صرف ہوئے ہیں اور نہ کسی کام کے کرنے میں مگر اس حساب میں میں اُن لوگوں کی زندگی کو شامل نہیں کرتا جو ہمیشہ کاروبار کی وجہ سے عجلت میں رہتے ہیں۔ بلکہ صرف اُن لوگوں کی زندگی کو شامل کرتا ہوں جو ہمیشہ کاروباری دُنیا میں مشغول نہیں رہتے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ میری یہ خدمت اُن لوگوں کو ناپسند نہ ہوگی اگر میں اُنکی زندگی کے خالی اوقات کے باکار بنانے کے لیئے چند طریقے تجویز کروں۔ طریقے جو میں اُنکے سامنے پیش کرونگا مفصلہ ذیل ہیں:۔

وقت

سینیکا (Seneca.) کا قول ہے کہ ہم سب کمیِ وقت کی شکایت کرتے ہیں اور باوجود اس امر کے ہم کو اس سے جس قدر کہ ہم کو معلوم ہے بہت کچھ زیادہ انجام دینا ہو وُہ بیان کرتا ہے کہ ہماری زندگیاں یا تو بالکل کچھ کام نہ کرنے۔ یا کسی کام کی بات نہ کرنے یا ایسے کام کے کرنے میں جو ہم کو نہیں کرنا چاہیئے صَرف ہوتی ہیں۔ ہم ہمیشہ اس امر کے شاکی رہتے ہیں کہ ہماری مُدتِ عمر بہت کم ہے۔ مگر ہم عمل اس طرح پر کرتے ہیں گویا کہ اس کا کوئی اختتام نہیں۔

اس معزز فلسفی نے بلحاظ اس امر کے۔ ہمارے اُس اختلاف کو جو خود ہم کو اپنی ذات سے ہے۔ اپنی مختلف طرزِ تحریر اور خیالات میں جن سے کہ اُس کی تحریرات مخصوص ہیں بیان کیا ہے۔ مَیں نے اس امر پر اکثر غور کیا ہے کہ بنی نوع انسان ایک امر میں جو پہلے امر کے مثل ہے کلیتاً خود اپنی ذات سے اختلاف کرتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہم اپنی کمیِ مدتِ عمر پر متاسف معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ہم اس کے ہر ایک زمانہ کے ختم ہو جانے کے متمنی ہیں۔

خورد سال لڑکا اس امر کا متمنی ہے کہ وُہ جوان ہو جائے اور پھر کاروباری آدمی بنجائے۔ بعد ازاں جائداد حاصل کرے اور پھر خطابات حاصل کرے اور پھر کنارہ کش ہو جائے۔ اس طرح اگرچہ ہر شخص زندگی کے زمانہ کا تھوڑا ہونا چاہتا ہے مگر اُس کے چند حصے دراز اور دشوار گذار معلوم ہوتے ہیں۔ ہم عام طور پر اپنے وقت کے دراز ہونے کے خواہشمند ہیں لیکن اگر ہم سے ممکن ہو تو اُسکے حصوں کو جن سے کہ وُہ بنا ہوا ہے خوشی سے چھوٹا کر دیں۔ ایک مداخوار بہت اچھی طرح اس امر پر مطمئن ہو جائیگا۔

غریب آدمی کے یہاں دو چار مہمان بنے رہتے تھے ذرا ذرا سی بات پر نالش نا لشی نہ ہوتی سرکار دربار میں جاتے ہوئے لوگ ہچکچاتے تھے۔ بڑے بڑے معاملے آپس میں فیصلہ ہو جاتے تھے۔ اس قدر خودغرضی کا بازار گرم نہ تھا۔ اگلے وضعداروں میں پنڈت ولارام کشمیری شاہی میں بانگر مو کے ٹھیکہ دار تھے۔ مزاج میں خیر تھی ایک بارہ دری اپنے نام سے بنوائی۔ وسعت اور خوبصورتی میں اسکے ساتھ کی ایک تھی۔ اسکو تمام شہر کی حاجت روائی کیواسطے وقف کر دیا تھا۔ بیاہ شادی یا اور کسی تقریب یا غمی کی مجلس کیلئے جسکو ضرورت ہوئی اطلاع کر دی اور صاحب خانہ نے دری چاندنی نگیری قنات جھاڑ کنول۔ مردنگیں دیوارگیریاں دنگل قالین سے آراستہ کر دیا۔ زیادہ ضرورت ہوئی دیگیں اور خوان پوش وغیرہ بھی موجود۔ یہ سب سامان بارہ دری کے کوٹھے پر مستعد رہتا تھا۔

اسی طرح تمام عمال سرکاری کی فیاضی اور سخاوت کا حال تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک خوش نیت مخیر اور نیکی کیطرف راغب تھا۔

مشہدے سال بھر بھیک مانگ کر جو روپیہ جمع کرتے وہ یوم عاشورہ سید الشہدا کی مجلس میں لٹا دیتے۔

مہاراجہ ٹکیت رائے نے جس قدر دولت کمائی معہ تنخواہ کے سب تالاب کنوئیں اور مسجدیں اور مندروں کی تعمیر میں صرف کر دی۔ آپ ہمیشہ سادہ لباس اور سادہ وضع سے بسر کی۔ شاہی زمانے کو جو لوگ ابتک یاد کر رہے ہیں وہ محض اگلے لوگوں کے اخلاق تواضع بردباری نیک چلنی وضعداری اور ملک کی مجموعی حالت اور شریفانہ برتاؤ کا ماتم کرتے ہیں اور یہ تو اُسوقت تک رونا رہیگا جب تک ہم اپنی حالت کو نہ بدلینگے درحقیقت یہ ہماری بداخلاقیوں کا رونا ہے ✦

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

عام طریق پر شریف نیک چلن ایماندار اور خوش اخلاق تھے غلہ ارزاں تھا شہر میں ہُن برستا تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے لوگوں کو بیفکری تھی لباس پوشاک اور کھانے پینے میں بہت تکلفات نہ تھے۔ چور اُچکے بدمعاش بھی اپنی کمائی نیک کام میں صرف کرتے تھے۔ بنی جان طوائف نے پچاس ہزار روپیہ خرچ کر کے چوک میں امام باڑہ بنوا دیا جو آجتک موجود ہے۔ عباسی جان۔ گوہر جان کے امام باڑے دیکھ کر لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اُنکی ساری کمائیاں شہر کی آبادی برقرار رکھنے کے لئے صرف ہوتی تھیں۔

دہلی کے ایک بزرگ عمدۃ الملک اسلام خان مشہدی وزیر شاہجہان کے پڑوتے سید حیدر حسین صاحب سہیل اسوقت لکھنؤ میں موجود ہیں۔ تخمیناً اسی برس کا سن شریف ہے۔ آپ بُرہان علی خاں جلاوت جنگ کے نواسے ہیں۔ قدیم مکان نیل کے کٹڑے میں تھا۔ واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ کے آغازِ حکومت میں بیس روپیہ کی کرائے کی بہل کر کے پندرہ روز میں لکھنؤ آئے۔ فرماتے ہیں کہ اسوقت کے لکھنؤ کا کیا پوچھنا۔ شہر رشکِ جنت بنا ہوا تھا۔ لکھنؤ بھر میں کہیں سڑک کا نام نہیں۔ دوطرفہ سر بفلک عمارتیں۔ عالی شان مکانات۔ پتلی پتلی گلیوں میں دوطرفہ دوکانیں مینا بازار سے چینی بازار تک دوکانوں میں ہر طرح کے تاجر پیشہ جا بجا ناچ رنگ کے جلسے ہو رہے تھے۔ قیصر باغ کی بُرجیوں پر سنہری کلس چڑھائے جاتے لوگ عموماً متواضع با اخلاق تھے اسی طرح اور لکھنؤ کے شاہی زمانہ دیکھنے والے بُڈھے قدیم طرزِ معاشرت کا ذکر کر کے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاہی زمانہ ایک خواب تھا جسکا سماں آنکھوں میں اب تک بندھا ہوا ہے۔ آہ کیا کیا لوگ تھے۔ شاہی عملے میں شُرفا اہلکار تھے۔ کسی نیچ قوم کو سرکاری ملازمت کا ٹھکانہ نہیں ملتا تھا۔ ایک کماتا تھا دس کھاتے تھے۔ اناج سستا تھا۔ غریب سے

یہ حال تو چوری اور سینہ زوری کا تھا۔ چوک میں روز دو ایک سے بات بات پر تلوار چل جاتی تھی۔ ہر ایک بانکے کے پاس دو تلواریں ہوتی تھیں۔ ایک ہاتھ میں ایک پرتلے میں ذرا سی چشمک پر خچاخچ اور شپاشپ چلنے لگی۔

اِن سب باتوں پر بھی لوگ شاہی زمانے کے معترف نظر آتے ہیں تو آخر وُہ کون سی بات تھی جس سے اس زمانے کی اسقدر عزّت ہے۔ بات یہ ہے کہ شاذ و نادر واقع تو ہر زمانے میں ہُوا کرتے ہیں لیکن عام طور پر شاہی زمانے کی سوسائٹی پر نظر دوڑائی جاے اور اگلے لوگوں کے طرز معاشرت پر غور کیا جائے تو کہ سکتے ہیں کہ اُس زمانے اور اس زمانے کے لوگوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت کے لوگ اپنی تن پروری اور عُمدہ اچھی پوشاک اور دولتمندی کو انتہائی امارت سمجھتے ہیں اور اُس زمانے کے لوگ اپنی دولت کو کنبہ پروری اور نیکنامی کی غرض سے صرف کرنے کو ریاست سمجھتے تھے۔ وضعداری کو اپنا جوہر سمجھتے تھے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ سلطنت کیسی ہی عادل اور منصف مزاج نیکدل رحیم کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر رعیّت کا طرز معاشرت خراب ہے تو سلطنت کو قانون کی کل اسی رُخ پر پھیرنا پڑتی ہے۔ اور اگر سلطنت کے افعال ناشائستہ قانون ناقابل عمل ہیں مگر رعیت کی طرز معاشرت عُمدہ اور شریفانہ ہے تو سلطنت کو وُہی رنگ اختیار کرنا ہوگا۔

یہ قانون قدرت ہی کہ جیسا طرز معاشرت مجموعۃً لوگوں کا ہوتا ہے اُسی کے مناسب حال گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑتا ہے تمام دُنیا کی مخلوقات پر ایک قانون نافذ نہیں ہوسکتا۔

شاہی قانون کا سبک اور برائے نام نفاذ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ

تو گھما کر وُہی رُومال مارا کر وُہ بھی غش کھا کر گر پڑا۔ یکے بعد دیگرے ہمارے سب آدمی کام آ گئے تو گھبرا کر ہم خود کُود سے۔ مکان کو گنج شہیداں دیکھ کر ہماری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور بیگم پر بہت خشمناک حالت میں ہم نے حملہ کرنا چاہا اُس نے کہا میر صاحب! تم ایک نامی اُستاد ہو۔ مَیں تم سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتی اور نہ اس میں میرا رتی بھر قصور تھا۔ مَیں نے تمہارے لئے دو ہزار روپیہ الگ رکھا تھا لیکن تمہارے شاگرد کی حماقت سے یہ نوبت پہنچی۔ ہم نے کہا اب تو جو کچھ ہونا تھا وُہ ہو چکا۔ میرے قوتِ بازو تُو بہادر سپاہی تو نے مار ڈالے اب اس کے بعد زندگی کا کچھ مزا نہیں اور بہادر کے ہاتھ سے مرنا میں اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔ مَیں عورت پر کیا ہاتھ اُٹھاؤں تو ہی پہل کر۔ بیگم نے کہا میر صاحب! تم خاطر جمع رکھو یہ سب زندہ ہیں مرے نہیں ہیں۔ انکو ابھی اچھا کئے دیتی ہوں۔ لیکن اس شرط سے کہ یہ سب ننگے سر اور ننگے پاؤں میرے گھر سے جائیں اور صبح کو اپنا جُوتا اور ٹوپی لینے آئیں۔ مَیں نے طوعاً و کرہاً اس شرط کو منظور کر لیا۔ اُس نے ہر ایک کی گردن آہستہ سے ہلائی وُہ ہوشیار ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ جب اس طریقِ عمل سے سب اچھے ہو گئے تو مَیں نے کہا جس طرح تم نے ان سب کو بیہوش کیا۔ ایسا ہی ایک ہاتھ مجھ پر بھی مارو اس نے میرے لحاظ کی وجہ سے بہت پس و پیش کیا۔ جب میرا اصرار بڑھ گیا تو وُہ رومال مجھ کو بھی رسید کیا۔ مَیں بھی بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اُسی وقت میری گردن بیگم نے ہلائی۔ مَیں اچھا ہو گیا۔ جب ہم سب جانے لگے تو اس نے دو ہزار روپیہ ہماری نذر کیا۔ ہم نے کہا اب ہم روپیہ نہیں لے سکتے اور نہ تمہارے یہاں آج سے کوئی آئیگا۔ تم چین سے پاؤں پھیلا کر سویا کرو۔ جہاں پر اُس نے پیسہ مارا تھا اُس دن سے آجتک وہاں درد ہوتا ہے۔ ہم نے تو اس عورت کے مقابلے میں کسی مرد کو بھی نہیں پایا۔

شاگردنے کہا آپ لوگوں کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔
میں جا کر جو کچھ پونجی ہے سب سمیٹ لاتا ہوں۔ رات کے دو بجے ہونگے
کہ یہ مکان کی دیوار پر چڑھ کر زنانہ کود پڑا۔
اتفاق سے بیگم صاحب اس وقت پیشاب کی ضرورت سے اٹھی تھیں۔ ذرا
لونڈی ایک ہاتھ میں شمع اور دوسرے ہاتھ میں لوٹا لئے ہوئے ساتھ تھی۔ دھماکے
کی آواز سنکر جو لونڈی نے آدمی کو دیکھا تو دُہ دُہائی کہکر بیہوش ہوگئی۔ بیگم صاحب
نے لوٹا پکڑ لیا۔ بیگم صاحب کے گھر بھر میں مرد کا نام نہ تھا۔ مامائیں اصیلیں اپنے اپنے
کونے میں دبک رہیں لیکن بیگم صاحب نے نہایت استقلال سے کہا کون؟ ہمارے
شاگرد نے جواب دیا ہم ہیں۔ کہا کیوں قضا نے گھیرا ہے جا سیدھا لیٹ جا۔
اس نے کہا سیدھی طرح سے اپنا زیور اتار کر رکھدو اور روپیہ کا صندوقچہ حوالے کرو
نہیں تو تمہاری قضا پھڑپھڑا رہی ہے۔
بیگم صاحب نے کہا اچھا تو اپنا وار کر۔ ہمارے دم میں جب تک دم ہے
ایک پیسہ نہ دینگے۔ شاگرد نے پہلے تو دھمکایا۔ تلوار میان سے کھینچکر اٹھائی مگر
یہ بھی پھکیت نکلی اور پینترا بدل کر ڈٹ گئی اور کہا ہاں دیکھوں تو سہی تو کیسا تلوریا
ہے۔ اس نے ایک ہاتھ بھرپور مارا بیگم نے لوٹے پر روک لیا۔ اسی طرح اس نے
کئی ہاتھ مارے بیگم سب خالی دیگئی۔ اتنی دیر میں پھرتی سے بیگم نے اپنا ریشمی رومال
جو گلے میں بندھا تھا کھولا۔ ایک موٹا پیسا ازاربند سے کھول کر اس کے کونے میں
باندھ خوب بل دیئے اور ھنکنی بچا کر وہی رومال گردن پر کھینچ مارا جس کی چوٹ
سے یہ غش کھا کر گر پڑا۔ جب اسکو بہت دیر ہوگئی تو ہم میں سے دوسرا آدمی کود
گیا اور اس نے جو اپنے ساتھی کو مرا ہوا پایا تو نہایت غصے میں بیگم پر تلوار کے
ہاتھ لگائے مگر وہ بھی ایسی ماہر فن تھی کہ سب ہاتھ لوٹے پر روکے اور جب اپنی باری آئی

چمپت ہوئے ۔ مزے ہونے لگے ۔ کچھ یار دوستوں میں بانٹی کچھ محلّے کے غریب غربا کو دی کنیا کی شادی کرادی ۔ اگرچہ حرام کی کمائی تھی لیکن اس کا مصرف نیک کاموں میں ہوا ۔

گلباز کو لوگ میر صاحب میر صاحب کہتے تھے محلّے بھر کے لوگ اُن سے خوش جس محلّے میں یہ رہے کبھی کسی پسنہاری کے یہاں بھی ایک جھاڑو کی چوری نہ ہوئی تھی ۔

اپنے کمال میں ایسے فرد تھے کہ چومنزلے پر چشم زدن میں چڑھ جانا انکے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ میر صاحب سے اُنکے دوست نے پوچھا کہ آجتک تمہارا کسی بہادر سے بھی سامنا ہوا ہے ۔ کہنے لگے جان ایسی بُری ہے کہ تلوار کی آنچ کے سامنے لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں ۔ بڑے بڑے سورما وقت پر دبک جاتے ہیں لیکن اس بارے میں ہم ایک عورت ذات کی بہادری کا ذکر نہ کرنا حق پوشی سمجھتے ہیں جس نے ہم جیسے دس بہادروں کو زیر کرلیا تھا ۔

محمد علی شاہ کا زمانہ تھا ہمارا آغاز شباب اور ہمارے ساتھ دس شاگرد پیشہ جُبیدا سورما سپہگری کے فن میں ہوشیار ہر وقت ہماری نگہ میں آدمی کی وقعت ایک مچھر سے زیادہ نہ تھی

ایک روز خبر ملی کہ درگاہ کے قریب حکیم سیّد علی کے مکان میں دہلی کی ایک بیگم بہت مالدار آئی ہوئی ہیں ۔ ہم نے اپنے دستور کے موافق اپنے ایک شاگرد سے کہلا بھیجا اگر لکھنؤ میں رہنا ہے تو ہمارا حق پہلے دیدو ۔ بیگم صاحب نے کہا کہ میر صاحب کی شہرت میں سُن چکی ہوں اور دو ہزار روپیہ اُنکی نذر کرنے کو رکھا ہے مگر تم کو نہ دونگی تم انہیں کو بھیجدو ۔

بیگم صاحب نے تو درحقیقت یہ بات سچے دل سے کہی تھی مگر چور کا دل کتنا ہوتا ہے ۔ ہمارے شاگرد کو اس دال میں کچھ کالا معلوم ہوا ۔

آٹھ روز ٹال کر ہم دسوں آدمی مسلح ہوکر بیگم صاحب کے مکان پر پہنچے ایک

لکھنؤ کا شاہی زمانہ

شاہی زمانہ کچھ اسی لحاظ سے قابلِ قدر نہ تھا کہ اس کے دور میں غلے کی ارزانی بارش کی فراوانی پیداوار کی کثرت اور شاہی فیاضیوں سے لوگ خوشحال اور فارغبال تھے کیونکہ ایک لحاظ سے اگر خیال کیجئے تو روزمرہ کی فوجداریاں اور بانکوں کی تیغ زنی شہزوروں کی ڈاکہ زنی ، ار پیٹ دھینگا مُشتی نوچ کھسوٹ ذرا ذرا سی بات پر خون کی ندیاں بہا نا چوریاں ڈاکہ زنی چھاپے مارنا گرہ کاٹ لینا گھر لُوٹ لینا دن دہاڑے لٹّا ڈگی یہ سب خرابیاں ایسی تھیں جنکا ذکر سنکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر محکمۂ عدالت کی بدعنوانیاں مقدمے کی سماعت نہ ہونا سفارشوں کا لحاظ کرنا پولیس کی بے وقعتی اور سونے میں سُہاگہ تھی۔

گلبازخاں شاہی چور جو ہمیشہ اپنی بدکرداریوں سے جیل خانے میں رہا کرتا تھا۔ اور آخر کو اس کی شناخت کے لئے شاہی حکم سے اس کے دونوں گال پیلالل کرکے داغ دیئے گئے تھے مگر اللہ رے چوری اور سینہ زوری ایسی دھاک بندھی ہُوئی تھی کہ جب مہاجن سے کہلا بھیجا کہ ہم کو دس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ اُس نے ہاتھ باندھکر روپیہ حاضر کردیا اور جو کچھ چین چپڑ کی پہلو بدلے ناک بھوں چڑھائی دون کی لی روپیہ تو اسوقت تیار نہیں ہے کل مُنیب جی آلیں تو لے لینا آج جنم اشٹمی ہے۔ دوچار ہُنڈیاں سکارنا ہیں ابھی اننت چودس تک تو ہم روپیہ نہیں دے سکتے۔ بڑے لالہ تیرتھ گئے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ شاہ جی کی شامت آگئی۔ بیٹھے بٹھائے عذاب مول لیا۔ رات کو دندناتے ہُوئے آدھمکے۔ نہ کہیں پولیس ہے نہ روندہے۔ شاہ جی کے ہاتھ پاؤں کھٹیا سے باندھ دیئے اور ترولی چھاتی پر رکھدیا اور گڑای ہُوئی دھن دولت پُوچھ پُوچھ کر کھود کھاد کر باندھ لی اور

ٹرکی کی خانہ بدوش اقوام کی مسلمان عورتیں جیسے کرد میں زیادہ آزاد زندگی گذارتی ہیں۔ وہ بڑی شہسوار ہوتی ہیں اور بڑی بڑی مہموں میں اپنے شوہروں کے ہمراہ رہتی ہیں۔ وہ نہایت محنتی، مستعد اور چالاک ہوتی ہیں۔ اپنے خاندان اور اپنے قبیلہ کے معاشرتی اور سیاسی امور میں بہت کچھ حصہ لیتی ہیں۔ وہ کسی طرح کا نقاب وغیرہ نہیں استعمال کرتیں لیکن سفر کے وقت اپنے چہرہ کے کچھ ضروری حصہ پر کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ وہ دوسری مسلمان عورتوں کی نسبت بہت زیادہ آزادی سے متمتع ہوتی ہیں اور بیرونی دُنیا کو بہت کچھ دیکھتی بھالتی ہیں۔ لیکن اس سے کوئی بُرا اثر ان میں نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ بخلاف اس کے اُن کی کھلی ہوئی کاروباری زندگی نے ان میں خودداری کا بہت بڑا مادّہ پیدا کر دیا ہے اور ان میں اخلاق کا ایک بہت اعلیٰ معیار قائم ہو گیا ہے۔ انہیں جو کچھ آزادی حاصل ہے اسے وہ نہایت عقلمندی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں اور اُنکے اطوار، خصائل اور اُنکی چال چلن میں بہ نسبت دُوسروں کے بہت کچھ درستگی، دانشمندی اور شائستگی ہے۔ بزرگترین اسلامی ملک کی مسلمان عورتوں کے متذکرہ بالا کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی حالت میں ابھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت باقی ہے۔ تاہم وہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں سے بدرجہا اچھی حالت میں ہیں۔ اس بارے میں بہت ہوشیاری اور خبرداری کے ساتھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر "بہشت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے" تو پھر کس قدر ضروری اور اہم بات ہے کہ ماں جسمانی لحاظ سے مضبوط، قوی۔ دماغی لحاظ سے ذی ہوش، سنجیدہ اور فہیم۔ اپنے گھر اور خاندان کے انتظام میں ہوشیار اور کافی دستگاہ رکھنے والی ہو۔ اس کے دماغی حدود بہت وسیع کئے جانے چاہئیں +

سید خورشید علی (حیدرآباد۔ دکن)

وہاں کاروبار چلتے ہیں۔ فرمانروا سُلطان کی والدہ جو والدۂ سُلطانہ کہلاتی ہیں حرم کی سردار ہوتی ہے۔ حرم کے اندر رہنے والوں پر یہ پُوری حکومت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ولیعہد کی بیوی کا درجہ ہے۔ ہر خاص خاتون کے لئے اس کے علیحدہ ملازم اور اس کا علیحدہ حصّہ مکان ہوتا ہے۔ والدۂ سُلطانہ کو نئے حکمران کے تخت نشین ہونے پر اس کی والدہ کو اپنی خدمت سپرد کر دینی پڑتی ہے۔ اِسی طرح پچھلے فرمانروا کی تمام خواتین نئے حکمران کی خاتونوں کو اپنی جگہ دیتی ہیں۔

والدۂ سُلطانہ کو اس کی بھاری خدمتوں میں بارہ خواتین سے مدد ملتی ہے۔ ان کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وُہ حرم سرا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے دُوسروں کی تربیت کریں۔ یہ اکثر کنیزیں ہوتی ہیں جو بالکل کمسنی میں خرید لی جاتی ہیں۔ خود مددگار عورتیں بھی عموماً وُہ کنیزیں ہوتی ہیں جو سُلطان کی توجّہ اپنی طرف معطوف نہ کرا سکی ہوں۔ اور جنہیں اب باہر شادی کرنے کی قطعی امید نہیں۔ مناسب پاسبانوں کی محافظت میں یہ عورتیں سیر و تفریح کے لئے باہر نکلتی ہیں۔ درگاہوں وغیرہ کی زیارت کرتی ہیں۔ بہر کیف ان کی زندگی بہت یکساں طریقہ سے بسر ہوتی ہے۔ اور اس میں ان کی دماغی ترقی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ جو وقت باہر جانے یا خانگی کاروبار میں صرف نہیں ہوتا۔ وُہ بالکل اپنے لباس و زیورات کی دیکھ بھال اور اسی طرح کی دُوسری ادنیٰ اور فضول باتوں میں گذرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر درجہ کی عورتوں میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ پچھلے دِنوں اگرچہ لڑکیوں کے مدارس کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا لیکن اس سے چنداں فائدہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ لڑکیوں کو جلد مدرسے سے اُٹھا لینے کے باعث اُنکی تعلیم بہت ناقص رہجاتی ہے۔

کا عورتوں کا کلب ہی جہاں نئی نئی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ دُنیا کی خبریں معلوم ہوتی ہیں اور ادھر اُدھر کی غپ شپ میں بہت خوش گوار طریقہ سے وقت گذارا جاتا ہے۔ بعض خانگی مراسم سے وابستہ چند مذہبی غسل ہیں جو عموماً حمام میں کئے جاتے ہیں وہاں کی خواتین کا عام قاعدہ ہے کہ دوستوں کے زمرہ میں بڑی ہی مسرّت و شادمانی کے ساتھ اکثر دن دن بھر حمام میں گذارتی ہیں۔ شوہر کی اجازت سے عورتیں ہَوا خوری یا خرید فروخت کے لئے باہر جا سکتی ہیں۔ نواحِ قسطنطنیہ میں باسفورس کے کنارے۔ بعض مقامات ایسے دلکش۔ خوشنما۔ پُرلطف اور دلاویز ہیں۔ اور شہر کے قریب بعض ایسے خاموش، پُرفضا سبزہ زار اور زندگی بخش تفرّج گاہ ہیں۔ جنکو عورتیں بیحد پسند کرتی ہیں۔ ان جگہوں پر ایک روز بسر کرنا بڑے ہی لُطف و شادمانی کا باعث ہوتا ہے۔ سودا سُلف لینا بھی ایک طرح کی تفریح ہی۔ امیروں میں یہ عام قاعدہ ہی۔ کہ حبشی خواجہ سرا ہمیشہ بحیثیت ملازم خاص اور محافظ کے بیگمات کے ہمراہ رہتے ہیں۔ سُلطانی حرم کی بیگمات کے ہمراہ رکاب اسی طرح کے خواجہ سرا بہت زرق برق وردیوں میں ہمیشہ ہوتے ہیں۔ جو خواتین اس طرح باہر نکلتی ہیں وہ ایک ریشمی اوڑھنی اور ایک باریک گاج کا نقاب استعمال کرتی ہیں[۱]۔ یا جیسا کہ آجکل بہت زیادہ رواج ہے۔ ایک "چارشف" ہوتا ہے۔ اس کے دو ریشمی دامن ہوتے ہیں۔ ان میں سے چھوٹے کو سر پر ڈال کر ٹھوڑی کے نیچے باندھ لیا جاتا ہے۔ ریشم یا ململ کا ایک مربع ٹکڑا چہرہ پر آویزاں رہتا ہے۔ جس سے صورت چھپ جاتی ہے۔ بعض اوقات اسے پیچھے کی طرف بھی ڈال لیا جاتا ہے۔

حرمِ سُلطانی میں کئی سو عورتیں ہیں۔ خاص قوانین و قواعد کے مطابق

---

[۱] دستوری حکومت کے بعد سے یہ رسم بھی اُٹھا دی گئی۔ ترکی مسلمان خواتین اب بلا کسی نقاب کے باہر نکلتی ہیں۔ (مترجم)

ہیں۔ اکثر دفعہ انکی قسمت زوردار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح کی خانگی غلامی کا معاشرت پر بہت بُرا اثر ہوتا ہے اور عورت ذات کو اس کے حقیقی درجہ اور اصلی منزلت سے گھٹا دیتا ہے۔

حرم کی چپ چاپ زندگی میں سب سے بڑی ہلچل اس وقت واقع ہوتی ہے جب کسی لڑکے کی شادی کا وقت قریب آتا ہے اور اُس کے لئے ایک پسندیدہ لڑکی کی فکر ہوتی ہے۔ اگر ماں کی نظر میں رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کے زُمرہ میں کوئی موزون دُلہن نہ نکلے تو آخر کار دُوسری جگہ اس کی تلاش کی ضرورت ہوتی ہے مختلف طریقوں سے اس کے پاس ایسی ناکتخدا لڑکیوں کے نام پیش ہوتے ہیں جو اس کے لڑکے کی بیوی بننے کے لائق ہوں۔ پھر وُہ کسی پیشہ ور مشاطہ کو ہمراہ لیکر ان لڑکیوں کے مکانات پر جاتی ہے۔ ہر جگہ صاحب خانہ بڑے ہی آؤ بھگت کے ساتھ حرم کے خاص ملاقاتی کمرہ میں اس سے ملتی ہے۔ اس کے بعد لڑکی بہت عُمدہ پوشاک زیب بدن کرکے اور خوب بناؤ سنگار کرکے وہاں آتی ہے۔ اِن نئے مہمانوں سے باادب ملتی ہے اور قہوہ سے اِن سب کی تواضع کرتی ہے۔ اپنے آپ کو ایک پسندیدہ، خوش اسلوب اور دلکش انداز میں جتلانے کے بعد وُہ چلی جاتی ہے۔ نئے ملاقاتی ماں سے اس کی لڑکی کی بڑے ہی مبالغہ کے ساتھ تعریف کرکے رخصت ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام لڑکیوں کے مکانات کو جانے اور ان سبھوں کو دیکھ چکنے کے بعد ان کے حُسن و قبح۔ ان کے صفات اور انکی دلفریبیوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اس پر بحث ہوتی ہے اور آخر کار باتفاق رائے ایک لڑکی کی نسبت رائے قائم کی جاتی ہے۔ ضروری بات چیت اور قول و قرار کے بعد کسی مناسب وقت پر شادی ہو جاتی ہے۔

روزانہ زندگی کی یکسانیت میں دُوسرا تغیر حمام کو جانا ہے۔ حمام فی الاصل ایک طرح

ڈھلی ہوئی پابندیاں بڑی ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ان مصائب کو وُہ بیچاری صرف اس دلخوش کن خیال میں برداشت کرجاتی ہے کہ آخر ایک روز اُسے بھی اپنی بہو پر یہی فرمانروایانہ اقتدار حاصل ہونگے۔ آئے دن کے دُکھ اور تکلیفوں میں محض آئندہ کی خوشگوار اُمّیدیں اسکے لئے بہت کچھ تسلّی و دلاسا کا باعث ہوتی ہیں۔

تُرکوں کی خانگی زندگی میں لونڈیوں کی کثرت ایک بہت بڑا نقص ہے۔ شرعی لحاظ سے غلامی کے لئے اسیرانِ جنگ کا ہونا شرط ہے۔ قسطنطنیہ میں بردہ فروشی کی دُکانیں بند کرادی گئی ہیں۔ اور عام طور پر اس کی قطعی ممانعت ہوگئی ہے لیکن خفیہ طور پر ابھی اس کا رواج باقی ہے۔ چھ سے دس سال تک کی عُمر کے بچّے خریدے جاتے ہیں جن میں کچھ بھی استعداد و قابلیّت کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ انکی بڑی ہی پرداخت ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی تربیت سے ان کو بہت باکمال اور شائستہ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔ ان کے طرز و انداز میں دلکشی اور دلفریبی پیدا کرائی جاتی ہے۔ غرض انہیں ہر طرح اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اس قسم کی لڑکیاں بڑی بڑی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بہت غیر معمولی خوبصورت اور نہایت حسین لڑکی ہو تو سلطان کے حضور میں پیش کی جاتی ہے۔ سُلطان بھی اگر اپنے افسرانِ اعلیٰ میں سے کسی کو اس عزّت افزائی سے مفتخر فرمانا چاہیں تو حرم سرا میں سے کوئی کنیز مرحمت فرماتے ہیں۔ اگر کوئی باپ اپنے لڑکے کی شادی کسی ایسی لڑکی سے جو اس کی ہمپایہ ہو کرنے کے کثیر اخراجات نہ برداشت کرسکتا ہو تو وُہ اپنے فرزند کے لئے ایک کنیزک جو کسی متموّل خاندان کے زیرِ تربیت رہی ہو خریدتا ہے۔ اس کی اولاد جائز تصوّر کیجاتی ہے اور اولاد ہوجانے کے بعد وُہ بیچی نہیں جاسکتی۔ اکثر اوقات وُہ آزاد کردی جاتی ہے اور اس سے شادی کرلی جاتی ہے۔ وُہ اُس وقت آزاد ترکی عورتوں کی ہم رُتبہ بنجاتی ہے اور اس کے تمام شخصی حقوق قائم ہوجاتے

ہے کہ سمجھدار اور باخبر تُرک بہت جلد اس کی اصلاح پر کمر باندھیں اور ترقی کے دلدادہ مسلمان دُوسرے مقامات پر بھی اس ضروری تغیر و تبدّل سے غافل نہ رہیں۔

تُرکوں میں مانوگیمی یعنی وحدت الازدواج کا عام قاعدہ ہے۔ اُمرا میں صرف چند ہی ایسے ہیں جنہوں نے اپنی پہلی بیوی پر دوسری اور تیسری یا چوتھی بیوی کا اضافہ کیا ہو۔ طلاق اگرچہ چنداں ناممکن الحصول نہیں تاہم بہت ہی کم رائج ہے۔

متموّل لوگوں کے مکانات دو حصّوں میں منقسم ہیں۔ یعنی (۱) سلاملق مردانہ اور (۲) حرم یا زنانہ۔ حرم عموماً عمارت کا نہایت پاکیزہ اور بہت آرام دہ حصّہ ہوتا ہے۔ وہاں صرف وہ مرد جا سکتے ہیں جو عورتوں سے کوئی رشتہ رکھتے ہوں جیسے باپ بیٹے۔ بھائی۔ خُسر وغیرہ۔ اس قاعدہ کی کوئی بہت سختی کے ساتھ پابندی نہیں کیجاتی اور خصوصاً نوجوان تُرک جماعت (ینگ ٹرکش پارٹی) کے اراکین میں جو ٹرکی کے اعلیٰ تعلیم و ترقی یافتہ مسلمان ہیں۔ بہت دُور کے عزیزوں اور بلکہ شوہر کے ذاتی دوستوں کو بھی گھر کی خواتین کی سوسائٹی میں شریک ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ٹرکی کی عورتیں بڑی مہربان مائیں ہوتی ہیں۔ محبّت و اُلفتِ مادری ان میں بہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اکثر اپنے بچّوں کے ساتھ بیجا نازبرداریوں اور لاڈ اور پیار کی بھی عادی ہوتی ہیں۔ اسی طرح لڑکے اپنی ماں کے ساتھ بیحد محبّت کرتے ہیں اور اپنی ماؤں کے بڑے ہی دلدادہ ہوتے ہیں۔ انکے اس طرزِ عمل کی اصلی محرک پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث ہے اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھَاتِکُمْ یعنی بہشت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

جب کوئی ماں اپنے شادی شدہ فرزند کے ساتھ رہتی ہے تو گھر اسی کی حکومت ہوتی ہے۔ بہو کا درجہ بالکل ماتحتانہ ہوتا ہے اور اس کے رسم و رواج کے سانچے میں

ٹرکی کی مسلمان عورتیں

ریورنڈ مکنین سیل صاحب ڈی۔ ڈی کا یہ مضمون ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ "انڈین ریویو" میں پہلی دفعہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اکثر انگریزی پرچوں مثلاً "دی انڈین سوشل رفارمر" وغیرہ نے اسکو نقل کیا۔ مَیں نے اسی زمانہ میں ان حضرات کی دلچسپی کے لئے جو انگریزی سے ناواقف ہیں اس کا ترجمہ کیا تھا مگر اس وقت تک اس کے شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اب ناظرینِ مخزن کی خدمت میں حاضر ہے۔

جن لوگوں نے ٹرکی اور ہندوستان دونوں ممالک کی سیاحت کی ہے۔ وُہ ہندوستان کے مقابلہ میں ترکی مسلمان عورتوں کی آزادی دیکھکر سخت متحیر ہوتے ہیں۔ وہاں کی عورتیں ہندوستان کی طرح مدت العمر زنانہ کی چار دیواری میں محدود نہیں ہوتیں اور نہ دُنیاوی زندگی اور مناظرِ قدرت کے دیکھنے سے محروم۔ ٹرکی میں مُسلمان عورتیں سب مُسلمان عورتوں کی طرح بڑے بڑے شخصی اور قانونی حقوق رکھتی ہیں۔ بحیثیت بیوی کے مُسلمان عورت اپنی جائداد پر بلا شرکتِ غیرے قابض رہتی ہے اور اپنی املاک پر آزادانہ اختیارات رکھتی ہے۔ بلا شوہر کی شراکت و امداد کے وُہ مُدعی یا مدعی علیہ بن سکتی ہے۔ وُہ جائداد کی وارث ہو سکتی ہے اور اپنی پرورش اور نان و نفقہ کے مناسب انتظام کے مطالبہ کا اپنے شوہر پر پورا حق رکھتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتوں میں لحاظ قانونی حقوق کے وُہ دُوسری اقوام کی عورتوں پہ فوقیت رکھتی ہیں۔ لیکن باوجود ان آسانیوں کے اِن عورتوں کی مجموعی حالت نظامِ تمدّن پر ایک بدنما داغ ہے۔ اس کے اسباب کوئی ناقابلِ علاج نہیں ہیں۔ حرم کی پابندیاں اور زنانہ کی سختیاں کسی شرعی تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم و رواج اور تعصب و بدگمانیوں کی بدولت ہیں۔ لہٰذا ضرورت

اور مثال لکھی ہے۔

مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود۔ اما فقرہ اولے با فقرہ ثانی مساوی الوزن باشد۔ مثال چشم کوکب مشتاق فیض از جمال پاک آں اختر لشکر است ؛ دست دولت محتاج خیر از عطائے عام آں دارا حشمت است۔"

یہی وزن سے مراد وزن عروضی لیتے ہیں۔ اور مثال نثر ہی لکھی ہے۔ امثلہ نثر مرجز کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وزن سے مراد۔ وزن حرفی مگر سجع موازنہ کی مثال میں جو شعر کہ خاقانی کا لایا گیا ہے۔ اس میں جگر کے مقابل وہموزن قفا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزن عروضی معتبر ہے۔ خواہ وُہ وزن عروضی ہوتا ہو۔ یا وزن حرفی۔ نثر مرجز میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے۔

(باقی دارد)

شرح تعزیرات ہند۔ مرزا محبوب بیگ صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی وکیل لاہور نے ایک بڑے کام کا تہیہ کیا ہے۔ جس میں امید ہے کہ وہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرینگے۔ تعزیرات ہند کی ایک ضخیم شرح اُردو میں وُہ لکھ رہے ہیں۔ جو بارہ حصوں میں شایع ہوگی اور جس کا ہر حصہ ایک سو بیس صفحے سے کم نہ ہوگا۔ پہلا حصہ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں چھپا ہے اور اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ باقی حصص یکے بعد دیگرے جلد جلد شایع ہوتے رہینگے۔ یہ کتاب باعتبار لکھائی چھپائی کے بہت اچھی چھپی ہے۔ اس کی قیمت فی حصہ ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ اور یہ وہی تدبیر ہے جس سے انگریزی میں لکھی ہوئی قانونی کتابیں عموماً بیچی جاتی ہیں۔ تاکہ یکمشت قیمت کا بوجھ خریداروں پر نہ پڑے۔ جہانتک حصہ اول سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ شرح باعتبار مطالب کے مفید ہے اور اس میں تمام ضروری فیصلے عدالتہائے عالیہ کے دیتے گئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ قانون پیشہ لوگوں کے لئے بہت کار آمد ہے اور دیگر شایقین بھی اس سے معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ قانون پیشہ اصحاب مرزا صاحب کی اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان کی حوصلہ افزائی کرینگے ✦

ایک شعر کے دونوں مصرعے ہموزن ہی ہوا کرتے ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید و فرقانِ حمید میں ارشاد فرماتا ہے وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اور نظم میں یہ شعر حسان العجم خاقانی کا ؎

رشکِ نظمِ من خورد حسان ثابت را جگر   دستِ نثرِ من زند سحبان وائل را قفا

رشک کے مقابل میں دست اور نظم و نثر۔ خورد و زند۔ حسان و سحبان۔ ثابت و وائل۔ جگر و قفا باہمدگر وزنِ عروضی رکھتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہیں اور آیت میں بھی یہی صورت ہے" پس نثر مرجز اور سجع موازنہ میں نسبت عموم خصوص من وجہ ہے۔ کیونکہ سجع موازنہ نثر اور نظم دونوں میں پائی جاتی ہے اور مرجز صرف نثر ہیں۔ میرے نزدیک مرجز کو نثر کہنا اور پھر اسے نظم سمجھنا بڑی غلط فہمی ہے۔ نثر کا نظم نہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔ کیونکہ میں نے اوپر ثابت کردیا ہے کہ نثر مرجز بایں حیثیت کہ قسم نثر ہے اس میں وزن بحور نہیں ہوسکتا اور یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ قافیہ کے بغیر بھی وجود شعر پایا جاتا ہے۔ اور قافیہ شعر کے لئے ایک امر عارضی ہے۔ نظم و نثر میں شے مابہ الامتیاز سوائے وزن بحور کوئی دوسری چیز نہیں"

میرا خیال یہ ہے کہ یہ ادلہ و براہین میں نے اس امر کو ثابت کردیا کہ کلام موزون غیر مقفّٰی داخل نظم ہے اور نثر مرجز سے خارج ہے۔

بیشک ورس اور نظم غیر مقفّٰی ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر بلینک ورس کا مترادف نہ سجع موازنہ ہے اور نہ نثر مرجز۔ سجع موازنہ میں کلمات متقابلہ کا ہموزن بروزن عروضی ہونا شرط ہے اور وزنِ بحور بھی پایا جاتا ہے اور بلینک ورس میں صرف وزن بحور ہوتا ہے اور نثر مرجز میں تقابل اور وزن شرط ہے اور وزن بحور ندارد۔ پس نثر مرجز اور بلینک ورس میں بڑا فرق ہے۔ اس سے تو سجع موازنہ ہی قریب ہے۔

جب میں یہاں تک لکھ چکا تو چہار شربت مرزا قتیل کی ملگئی اُنہوں نے یہ تعریف

متقابلہ غیر ضروری ٹھہرا تو قافیہ ہونے یا نہ ہونے کا لحاظ کس چیز سے کیا جائیگا - اور تعریف نثر مرجز میں قید قافیہ نہ ہونے کی بیکار ہو جائیگی -

تعریفِ شعر

ابرہا یہ امر کہ قید قافیہ حدِ شعر میں جیسا کہ بعض اساتذۂ عروض نے تعریف شعر لکھی ہے - آیا تحقق نفس شعر میں قافیہ شرط ہے یا نہیں - اسبارہ میں محققین فنِ عروض کی یہی رائے ہے کہ تحقق نفس شعر قافیہ پر مبنی نہیں - بلکہ وُہ ایک امر عارضی ہے - ورنہ تعریفِ شعر ناقص ہوگی - کیونکہ فرد دیر جو منجملہ اقسام شعر ہے صادق نہ آئیگی اور تعریف کو جامع و مانع ہونا چاہیئے

محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے معیار الاشعار میں شعر کی تعریف کلام موزون مخیل فرمائی ہے اور قافیہ کو داخلِ حدِ شعر نہیں مانا ہے - اور سکاکی نے بھی اسی قول کو مفتاح العروض میں ترجیح دی ہے" - ان محققین کے قول سے ہر وُہ کلام کہ جس میں وزنِ بحور پایا جاتا ہو اور قافیہ چاہے ہو یا نہ ہو نظم ہی ہے - اس تعریف سے بلینک ورس یا نظمِ غیر مقفّی داخل نظم ہے - مگر نثر مرجز کہ جس میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے داخلِ نظم نہیں ہو سکتی پس یہ ارشاد جناب حالی کا کہ بلینک ورس یا نظمِ غیر مقفّی داخلِ نظم ہے بہت درست ہے مگر تعبیر بلینک ورس کی نثر مرجز کے ساتھ صحیح نہیں -

"سجع موازنہ"

اگر الفاظ متقابلہ ہموزن بروزن عروضی میں وزن بحور بھی پایا جائے تو اُسے سجع موازنہ کہتے ہیں - چنانچہ سکاکی تلخیص المفتاح میں اور میر شمس الدین فقیر دہلوی حدائق البلاغت میں یُوں ارشاد فرماتے ہیں - کہ کل الفاظ دو فقرہ نثر یا دو مصرع نظم کے بر سبیلِ تقابلِ وزن میں متحد اور روی میں مختلف لانے کو سجع موازنہ کہتے ہیں اور یہ بمنزلہ ترصیع ہے - سجع متوازی میں (یہاں بھی اتحادِ وزن سے مراد وزنِ عروضی ہے - ورنہ ایک شعر کے دو مصرعوں میں متحد الوزن کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ

کر دیا کہ نثر مرجز نثر ہے اور اس میں وزنِ بحور نہیں ہوتا ہے۔ نثر و نظم دونوں کا وجود ایک ہی عبارت میں معاً ممکن نہیں۔ کیونکہ وزن ہی شعر کو نثر سے جدا کرتا ہے۔

شعر کی تعریف میں قید مقفّٰی اور نثر مرجز کی تعریف میں قید وزن نے بہتوں کو دھوکے میں ڈالدیا ہے۔ جسکی وجہ سے بجویز وزن بحور بھی کرتے ہیں اور نثر بھی سمجھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انشا پردازانِ اُردو نے نظم بلا قافیہ کہی یہانتک کوئی مضائقہ نہیں لیکن اسکو نثر مرجز سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اُس پر طرّہ یہ کیا کہ تقابل میں الفاظ فقرتین کے ہموزن بوزن عروضی لانے کو بھی ترک کر دیا جس کے بغیر نثر مرجز ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

کوئی اُن سے پوچھے کہ تعریفِ نثر مرجز میں کلمات فقرتین کے بتقابل ہموزن ہونے کے معنے کیا ہیں۔ اوّل تو لفظِ کلمات لانیکی کیا ضرورت تھی دُوسرے اگر وزن سے مراد وزنِ بحور ہے تو تقابل میں ہموزن کیوں کہا۔ اِس لئے کہ شعر کا دُوسرا مصرع متقابل پہلے مصرع کے ہموزن ہی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ پہلے مصرع سے دُوسرے مصرع کا وزن مختلف ہو۔

تینوں صاحبوں کی تعریفِ مسلّمہ نثر مرجز سے علاوہ مطالع کے (کیونکہ مطالع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے) ہر شعر غزل۔ قصیدہ اور قطعہ کا نثر مرجز ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور غزل و قصیدہ و قطعہ منجملہ اقسام نظم ہیں پس ایک ہی وقت میں نظم بھی ہُوئے اور نثر بھی۔ اور یہ محال ہے۔

جناب مولوی نجم الغنی صاحب تو نثر مرجز میں وزنِ بحور مانتے ہیں اور فقرتین میں متقابلین کا ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی تعریف سے جب تقابل بھی نرہا تو پھر ہم صنف نظم کو بلحاظ ہر مصرعِ نثر مرجز کہنے کے مستحق ہیں اور انہوں نے خود بھی آیات کے ایک ایک مصرعے لکھے ہیں اور انکو نثر مرجز فرمایا ہے۔

جب تعریف نثر مرجز میں آپ نے فرمایا کہ ہر فقرہ وزن رکھتا ہو اور قافیہ نہو اور

مابہ الامتیاز پھر کونسی شے ہے۔ کیونکہ قافیہ تو نثر میں بھی ہوتا ہے۔

میرے نزدیک جو لوگ کہ تعریف نثر مرجز میں وزن سے مراد وزن بحور لیتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں وزن عروضی مراد ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق یمینی مقدمات ظہوری میں تعریف نثر مرجز یوں تحریر فرماتے ہیں:-

"در اصطلاحِ اہلِ انشا مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد و سجع ندارد۔ ہمچوں۔ عزیزا! صرفِ اوقات بے فکر واہبِ کارساز۔ و خرچ انفاس جز ذکرِ قادرِ کردگار مضرتِ تمام و خسرِ کمال دارد"۔

اور فرہنگِ آنندراج میں لکھا ہے:-

"مرجز بزائے معجمہ کمعظّم نوعے از شعر۔ و باصطلاح اہل انشا قسمے از سہ اقسامِ نثر کہ مرجز و مسجّع و عاری است۔ پس مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقرتین اکثر جاہا ہمہ ہموزن باشند در تقابل یکدیگر بدون رعایت سجع۔ مثال "خیالِ ناظم بے تعلق قامت دلربائے ناموزونست و قیاسِ ناثر بے تمسکِ کاکل مومیائی نامربوط"۔

اور یہی مسلک مصنفین غیاث، انشا فیض رسان و احسن القواعد کا ہے۔ دیکھئے صرف و خرچ اوقات و انفاس۔ بے و جز۔ فکر و ذکر۔ واہب و قادر۔ و کارساز و کردگار اور اسی طرح دوسری مثال میں الفاظ متقابلہ فقرتین میں وزنِ عروضی ہے اور قافیہ نہیں ہے اور فقراتِ امثلہ موزوں بھی نہیں ہیں۔

تعریف فرہنگ آنندراج میں نوعے از شعر سے مراد یہ نہیں ہے کہ نثر مرجز میں وزنِ بحور ہوتا ہے بلکہ لفظ مرجز بلا قید لفظ نثر کی نسبت کہتے ہیں کہ جو شعر بحر رجز میں ہو اسکو مرجز کہتے ہیں اور یہ [illegible] لغوی دو معنی ہوتے ہیں - [illegible] نثر مرجز کو منجملہ سہ اقسام بتا کر اور لفظ فقرتین لا کر اور مثال کلام منثور سے دیکر واضح

ہو جاتی ہے ورنہ نہیں۔

دیکھئے پیشتر عبارت مقفّٰی و پُرشوکت الفاظ کو لوگ بہت پسند کیا کرتے تھے۔ مگر اُسی زمانہ میں جناب غالب مرحوم نے خطوط روزمرّہ اُردو میں لکھنا شروع کئے وُہ بھی نہ بوجہ رغبتِ طبع بلکہ بمجبوری۔ چنانچہ خود اس رنگ کی عبارت کو بوجہ ضُعفِ قوائے جسمانی لکھنا ارشاد فرماتے ہیں۔ مگر اب وُہی رنگ عام پسند ہوگیا اور اس طرح کی عبارت کو حسن سمجھا جاتا ہے۔

بلینک ورس و نثر مرجز

بلینک ورس کا مترادف نثر مرجز کو جناب شمس العلما مولانا حالی و جناب احسن و مولوی نجم الغنی صاحب تینوں اصحاب سمجھتے ہیں۔ اور وزنِ بحور کا ہونا بھی نثر مرجز میں تینوں بزرگوار تجویز فرماتے ہیں۔ مگر مولانا حالی صاحب اس کو از قسمِ نظم شمار کرتے ہیں اور باقی دونوں صاحب منجملہ اقسامِ نثر۔

اِن تینوں بزرگوں نے جو تعریف کہ نثر مرجز کی تسلیم کی ہے مجھے اُس سے اِختلاف ہے۔ اِس وجہ سے بلینک ورس اور نثر مرجز میرے نزدیک ہم معنیٰ الفاظ نہیں۔ کیونکہ بلینک ورس کا انگریزی میں از قسمِ نظم ہونا میں ثابت کرچکا ہوں اور نثر مرجز از قسمِ نثر ہے۔ پس اُس میں وزنِ بحور نہ ہونا چاہئیے۔ کیونکہ کلام کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک نظم اور دُوسرے نثر۔ جو کلام نظم ہے وہ نثر نہیں ہوسکتا اور جو کلام کہ نثر ہے وُہ نظم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں دو متقابل چیزیں ہیں۔ نظم میں وزنِ بحور معتبر ہے اور نثر میں نہیں۔ لہٰذا جس کلام میں بحور ہوگا عام اس سے کہ اُس میں قافیہ ہو یا نہ ہو وُہ نثر نہیں کہا جا سکتا۔ مرجز کو نثر کہنا اور اُسکو از قسم نثر گننا خود دلیل اس امر کی ہو کہ اس میں وزنِ بحور نہ ہونا چاہئیے ورنہ نثر کہنے کے کیا معنے ہونگے۔ اگر نظم و نثر میں فرق وزنِ بحور نہیں ہے تو ان دونوں میں

سب سے زیادہ فائدہ نظمِ غیر مقفیٰ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نظم میں وسعت اور سہولت ہوگی۔ جب قیدِ قافیہ ہم کو دقت میں نہیں ڈالتی ہے تو وسعت و سہولت ہی کیا ہوئی بڑی بڑی ضخیم نظمیں ہونا دلیل عدمِ دشواری ہے۔ فارسی میں شاہنامہ۔ حملہ حیدری مرزا رفیع باذل۔ اور اُردو میں جلدہائے مراثی انیس و دبیر موجود ہیں۔ اگر سہولت بلینک ورس میں ہم تسلیم کرلیں تو سب سے زیادہ سہولت نثر میں ہے۔ اور یہ بلینک ورس سے بھی آسان ہے۔ کیونکہ نظمِ غیر مقفیٰ میں دقتِ وزن پھر بھی رہتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ محض سہولت کوئی چیز نہیں بلکہ مرغوبِ طبع ہونا بھی ضروری ہے۔

باوجود قیود و پابندی جناب میر انیس نے وسیع میدانِ مرثیہ میں نیچرل شاعری کو ٹھیک موافق بول چال کے نظم کرکے دکھا دیا۔ چنانچہ مولوی حالی فرماتے ہیں۔ اگر فردوسی لکھنؤ میں ہوتا تو اُن کی تقلید کرتا۔ اور جناب اشہری فرماتے ہیں کہ مرثیہ اُن کی طرح کسی نے عربی و فارسی میں بھی نہیں کہا۔ پھر بتلائیے قیدِ قافیہ کیا خرابی لاتی ہے۔

بہرطور پہلے بلینک ورس کی ضرورت اُردو میں ثابت کیجائے اور اُس کی ناگواری کو ہماری طبیعتوں سے دُور کرکے ہمیں اُس سے مانوس بنایا جائے۔ تو پھر ہم کو نظمِ غیر مقفیٰ کہنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ نظم بلا قافیہ ہماری چیز نہیں ہے اگر اِسوقت سے نام برآوردہ اشخاص نظم بلا قافیہ کہتے رہیں۔ بلا اس کے کہ اسی وقت سب کو متفق کرنے کی فکر کریں۔ تو آئندہ جب ہماری طبیعتیں اُس سے مانوس ہوگئیں اور ہمارا توحش دُور ہوگیا اور اُس کی خوبی ہماری سمجھ میں آگئی اور مقبولیتِ عام کا خلعت اُسکو ملگیا۔ اپنے آپ نظمِ غیر مقفیٰ کا رواج ہوجائیگا۔ اس وقت متفق بنانے کی کیوں فکر ہے۔ وقتِ ایجاد سب اُس سے موافق نہیں ہوا کرتے ہیں۔ آئندہ نسلوں کے مرغوبِ طبع اگر وہ ایجاد ہوتی ہے تو شائع

یں نظمیں کہی جایا کریں۔ جب خود فطرت نے ہر ملک کے امزجہ و طبائع و آب و ہوا و اشیا و اشکال وغیرہ مختلف پیدا کئے ہیں۔ پھر ایک کی مرغوب چیزیں دوسروں کے پسند کیونکر ہو سکتی ہیں۔ ایسے امور کا ہم کو پابند کرنا گویا اصول نیچر کے خلاف ہم کو چلانا ہے۔

دوسرے یہ کہ زبان انگریزی کا قافیہ تنگ ہے۔ چنانچہ انگریزی میں سن (آفتاب) بفتح اول کا قافیہ۔ گوان (گیا) بروزن خوان۔ اور فیر (اچھا) کا قافیہ۔ کر (ہین) اور پٹ بضم (رکھنا) کا قافیہ نٹ بفتح (اخروٹ) اور لارڈ کا قافیہ ورڈ (لفظ) لاتے ہیں۔ ورڈس ورتھ اور لارڈ ٹینسن اور ایمرسن اور لانگ فیلو کی نظمیں ملاحظہ ہوں۔ بوجہ ضرورت قافیہ۔ ان میں سے بعض الفاظ کے تلفظ میں تغیر کیا جاتا ہے مگر نثر اور بول چال میں یہی تلفظ بتایا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔ میں بہت سی مثالیں لکھتا مگر بخیال انقباض طبائع اردو دانان زیادہ مثالوں سے احتراز کیا۔ جو لوگ انگریزی پڑھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کے قوافی انگریزی میں کثیر الوقوع ہیں۔ پھر ایک اسٹینزے میں نہ تعداد مصاریع کا انتظام نہ قوافی کا کوئی بندوبست۔ انہیں وقوعے انگریزوں کو نظم غیر مقفیٰ کہنے پر مجبور کیا۔ برخلاف ہماری زبان کے کہ ایک لفظ کے بکثرت قافیے موجود ہیں۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ہم نظم غیر مقفیٰ کہیں کسی بڑے سے بڑے۔ مضمون واقعہ۔ اور تاریخ کو ہم بہت آسانی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں اور ایسے طولانی مضامین کے لئے مثنوی اور مسدس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم ایشیائی لوگوں کی طبیعتوں کو بوجہ انس و عادت قدیم جو حظ کہ نظم مقفیٰ سے ہوتا ہے وہ نظم غیر مقفیٰ سے نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو بلینک ورس کی طرف میلان نہیں ہے۔ کچھ نظمیں غیر مقفیٰ جو اردو میں اب تک کہی گئیں۔ مرغوب طبع نہ ہونے سے انکو مقبولیت نہ حاصل ہوئی اور ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے۔

کیا کیا نیچرل سینریاں کھینچی ہیں۔ اور غزل گوئی میں میر۔ غالب (صرف ایک رنگ کے اشعار میں) اور داغ نے کیا کیا جذباتِ عاشقی کو نظم فرمایا ہے۔ اس کی کس منہ سے تعریف کیجائے۔ یہ کہنا انصاف کا خون کرنا ہے کہ ایشیائی شاعری پیشتر ان امور سے خالی تھی۔ ہاں البتہ مغربی خیالات جواب اردو کے سانچے میں ڈھالے جاتے ہیں۔ یہ پیشتر نہ تھے۔ کیونکہ اسوقت تک ہمارے اور اہلِ مغرب کے درمیان تبادلۂ خیالات کا اچھی طرح ذریعہ ہی حاصل نہ تھا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ تقلیدِ فارسی ہزاروں قیود کے پابند رہکر اس وادیٔ دشوار گذار کو بھی طے کیا ہے۔

"بلینک ورس کی خواہش اردو میں بیجا ہے"

اوّل تو ایک بات جو ایک ملک کے لوگ پسند کرتے ہوں۔ اس کے پسند کرنے پر دوسرے لوگ کیوں مجبور کیے جائیں۔ ہمارے طبائع اُن سے ازروئے فطرت مختلف ہیں۔ جن چیزوں کو وہ حسن سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک قبیح ہیں اور اسی طرح بالعکس ان کے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حسن و قبح اشیا عقلی نہیں سوائے حسن صدق و قبح کذب کے بلکہ انتظامِ عالم اختلافِ طبائع ہی سے مربوط ہے۔ اگر اختلافِ طبائع نہ ہوتا تو تمام عالم کے انسان کچھ چیزیں اور پیشے پسند کرتے اور دوسری چیزیں بوجہ ناپسند ہونے کے ترک کر دیتے۔ جس سے وہ صنایع معطل رہتے اور ضروریاتِ عالم میں خلل واقع ہوتا۔ اس اختلاف میں عجیب مصلحتِ باری ہے۔ اور ارتفاعِ اختلاف ممکن نہیں۔

جن اصول اور خصوصیاتِ ملکی کے ساتھ یورپ والوں کی نظمیں ہوتی ہیں۔ انہیں سے اکثر اصول بوجہ اختلافِ طبائع ہماری طبیعتوں پر سخت گراں ہیں۔ چنانچہ اوزانِ انگریزی پر کیا منحصر ہے۔ بعض بحورِ عربیہ بھی ہماری طبیعتوں کو موزون نہیں معلوم ہوتے۔ ایسے خواہشات بیجا سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ہم سے کہا جائیگا کہ وزنِ انگریزی پر اردو

سب سے اکثر انگریزی دان حضرات ایشیائی اصناف سخن کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ مگر
اس مضمون کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شمس العلما مولانا حالی بھی یہی خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ
نثر مرجز جسکو انگریزی میں بلینک ورس کہتے ہیں اِک قسم نظم کی۔
عام اس سے کہ بلینک ورس کا ترجمہ یا مقابل نثر مرجز ہو یا نہ ہو مگر انگریزی میں
ضرور ایک قسم نظم کی ہے جس میں قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ زبانِ انگریزی میں بلینک کے
معنے سادہ (یعنی معرّیٰ از قافیہ) اور ورس کے معنے نظم کے ہیں۔ چونکہ نظم انگریزی
میں ایک چوتھی قسم گریمر کی ہے۔ اس لئے نحاۃ انگریزی تحت بیان پراسوڈی علم العروض
گریمر میں قواعد نظم لکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ جے۔ سی۔ نسفیلڈ صاحب بہادر نے بھی
جو سررشتہ تعلیم ممالک متحدہ کے ڈائرکٹر تھے۔ اپنی گریمر نمبر ۲ میں بلینک ورس کو
تحت اقسام نظم لکھا ہے۔ اور ملٹن صاحب کی پیراڈائز لاسٹ سے اس کی مثال
لکھی ہے۔ انگریزی میں بلینک ورس کے منجملہ اقسام نظم ہونے میں کلام نہیں۔ لہٰذا
بلینک ورس کو انکا نظم سمجھنا بہت درست ہے۔ نوٹ کے بقیہ امور کی تحقیق کی نسبت
آگے لکھونگا۔ طول و تکرار سے بچنے کے لئے یہاں ترک کرتا ہوں۔
مولوی نجم الغنی صاحب کا یہ فرمانا بہت درست ہے کہ نئی روشنی والے بموجب
اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِم اندھا دھند تقلید انگریزی پر مٹے ہوئے ہیں۔
اور خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدَر پر عمل بالکل نہیں۔
اسمیں بھی شک نہیں کہ فی زمانا جذبات اور نیچرل شاعری کی طرف طبیعتیں زیادہ
مائل ہیں۔ مگر ہمارے اسلاف نے اس کام کو بھی باحسن وجوہ کر دکھایا ہے۔ چنانچہ جناب
میر انیس صاحب نے اپنے مراثی میں صبح۔ شب۔ گرمی۔ بہار۔ صحرا اور بھائی بہن
ماں بیٹے۔ دولہا دلہن کی گفتگوؤں میں۔ اور منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیر نے اپنی مثنوی
معراج المضامین میں تعریف صبح بنارس میں اور جناب میر نے اپنے گھر کی مذمت میں

بلینک ورس

ذیل کا مضمون جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسۂ عالیہ رامپور شارح "درۂ نادرہ" نے ارسال فرمایا ہے۔ پروفیسر صاحب کی تحقیق اور وسعت نظر قابلِ داد ہے:-

"فصیح الملک" میں ایک مضمون مولوی نجم الغنی صاحب کا میں نے دیکھا۔ جس کا عنوان "انشا پردازانِ اردو سے ایک اہم سوال" ہے۔ اس مضمون پر جناب احسن مارہروی نے ایک ایڈیٹوریل نوٹ بھی تحریر فرمایا ہے۔ پہلے ہم اس نوٹ کو کسیقدر مختصر کر کے درج کرتے ہیں۔ اور اس پر اپنی رائے ناقص کا اظہار کرینگے۔ بعدہٗ اصل مضمون کی نسبت جو کہنا ہوگا عرض کرینگے۔

(عبارت مختصر نوٹ)

جناب احسن تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک ہمارے دوست نے "ہماری شاعری کے لئے نیا میدان" کے عنوان سے اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کے فصیح الملک میں۔ بلینک ورس کو نظم سمجھکر پیش کیا تھا۔ اور اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ اگر توسیع خیالات کے لئے اردو میں اس قسم کی نظمیں کہی جانے لگیں تو بہت فائدہ پہنچے"۔

جناب احسن نے اس مضمون پر جو رائے ظاہر کی تھی اُس میں ثابت کیا تھا کہ بلینک ورس انگریزی زبان کا نام ضرور ہے۔ مگر اس کا رواج انگریزی سے پہلے فارسی میں موجود ہے جسکو نثر مرجز کہتے ہیں۔

یہ بھی فرماتے ہیں:- "پہلے ہمارا خیال تھا کہ ایشیائی عالم کی ناواقفیت کے

حصولِ اخلاق و زبان کے لئے آیا ہوں۔ سونے یا چاندی کا محتاج نہیں ہوں۔ جب میں عالمِ پیری میں اپنے وطن کو جاؤنگا تو مجھے نہایت لطف و سرور حاصل ہوگا۔ چلتے ہوئے میں تم سے بھی ملتا جاؤنگا۔ کیونکہ مجھے بھی تم جیسے شخص کی دوستی کی بڑی تمنا ہے۔

واپسی کے وقت حکیم انخرسیس کا گذر شہر قیبریک پر ہوا۔ اُس وقت اتفاقاً ایک بُت کی ماں کا عُرس تھا۔ حکیم نے بھی یہ دیکھکر اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر میں اپنے وطن بخیریت واپس پہنچ جاؤں تو ایسا ہی عُرس کیا کرونگا۔ وطن پہنچکر اُس نے ارادہ کیا کہ وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار کی اصلاح کرے اور یُونان کے قانون کو رواج دے۔ مگر کسی نے ایک نہ مانی۔ ایک روز خفیہ طور پر اُس نے اپنی نذر پُوری کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وُہ عُرس کی رسوم ادا کر رہا تھا۔ کہ کسی شخص نے بادشاہ کو اطلاع دیدی۔ بادشاہ خود دوڑا آیا اور اس کو اس حال میں دیکھکر دُور سے تیر مار دیا جو کاری پڑا۔ جب رُوح نکلنے کے قریب ہُوئی تو اُس نے بآوازِ بلند کہا کہ مُلکِ یُونان نے جہاں میں لغت و اخلاق کی تعلیم حاصل کرنے گیا تھا میری قدر کی۔ مگر میرے وطن نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔

انخرسیس کے مرنے کے بعد اس کی قدر ہُوئی اور لوگوں نے اسکی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس کا بُت بنایا۔

(ترجمہ از عربی) محمد خلیل الرحمن

سے بعض اس صحبت میں بیٹھ کر خائن ہو گئے ہیں۔

ایک روز یہ حکیم کسی راستے سے گذر رہا تھا کہ ایک مدہوش نے اس سے ازراہ مذاق کہا کہ یہ شخص اپنے آپ کو بڑا حکیم سمجھتا ہے۔ حکیم انخرسیس نے اس کو دھکا دیکر کہا کہ کمبخت تو آج عالم جوانی میں دو چلو شراب کا متحمل نہیں ہوتا تو کل کو بڑھاپے میں پانی کا بوجھ کیونکر اٹھا سکیگا۔

حکیم انخرسیس اکثر قانون کو مکڑی کے جالے سے مثال دیا کرتا تھا۔ اور حکیم سولون پر ہنسا کرتا تھا کہ اس کے نزدیک وضع قانون سے انسان کی خواہشیں رک جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ برتن بنانے کے لئے کمہار کا چاک اسی حکیم کا نکالا ہوا ہے۔

اس حکیم نے ایک روز بتخانہ آفتاب کے کاہنہ سے جاکر پوچھا کہ آیا دنیا میں مجھ سے بھی کوئی بڑا حکیم ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں میزون شافیسی تم سے بھی بڑا حکیم ہے۔ اسکو سخت تعجب ہوا کہ میں نے اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا۔ اور فوراً اس کی تلاش میں اس گانوں میں پہنچا کہ جہاں یہ شخص بھاگ کر جارہا تھا۔ دیکھا کہ میزون اپنی کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ہے۔ حکیم انخرسیس نے اس سے کہا کہ اب کھیتی کرنے کا وقت نہیں رہا۔ میزون نے کہا کہ بلکہ برعکس اس کے اب ہی تو کھیتی کرنے کا وقت ہے۔ اسی میزون کو افلاطون نے منجملہ حکما رشمار کیا ہے۔ یہ ہمیشہ آدمیوں کی صحبت سے علیحدہ رہتا تھا۔ کیونکہ اس کو انسانوں سے بالطبع نفرت تھی۔ ایک دفعہ میزون ایک ویرانہ میں کھڑا ہوا دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ ایک شخص اتفاق سے وہاں سے گذرا اور پوچھنے لگا کہ تمہارے ہنسنے کا کیا باعث ہے۔ نہ یہاں کوئی آدمی ہے نہ آدم زاد۔ کہا کہ یہی تو میری ہنسی کا سبب ہے۔

شاہ اکریسوس نے حکیم انخرسیس کا شہرہ سنکر بہت سا زرومال اس کے پاس بھیجکر بلا بھیجا۔ انخرسیس نے یہ سب واپس بھیجدیا اور کہلا بھیجا کہ میں اس ملک میں

کسی نے اس سے پوچھا کہ آدمی کو شراب پینے سے کس طرح روکا جائے۔ حکیم انخرسیس نے جواب دیا کہ مجھے تو اس ترکیب سے بہتر کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ اسکے پاس کوئی بدمست آدمی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اس کی حرکات کو دیکھکر اس فعل سے نفور ہوجائے۔

کسی نے پوچھا کہ آپ کے ملک میں آلاتِ موسیقی ہوتے ہیں یا نہیں؟ حکیم انخرسیس نے بطور سرزنش جواب دیا کہ ان آلاتِ موسیقی تو ہوتے ہیں مگر شرابیں نہیں ہوتیں۔

جب کوئی شخص کھیل میں شریک ہونے کے لئے اپنے بدن پر تیل ملتا تھا تو حکیم انخرسیس کہا کرتا تھا کہ یہ شخص ایک بڑے جنون کی تیاری کر رہا ہے۔

ایک روز کشتی کے تختوں کی موٹائی ناپ کر کہنے لگا کہ ان میں سفر کرنیوالوں اور موت کے درمیان صرف چار انگل کا فاصلہ ہے۔

حکیم انخرسیس ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنی زبان اور پیٹ پر قابو رکھے۔ یہ حکیم ہمیشہ سوتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھکر سوتا تھا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ انسان کو چاہیے کہ حفظِ زبان کا اہتمام کلی رکھے۔

ایک شخص تاتار کا رہنے والا اتینہ سے اس کے پاس آیا تو حکیم انخرسیس نے اس سے کہا کہ میرے ملک نے مجھے بدنام کیا۔ اور تو نے اپنے ملک کو۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا آدمیوں میں اچھے اور برے ہوتے ہیں؟" حکیم نے جواب دیا کہ کیوں نہیں؟ کیا ان کے زبان نہیں ہوتی؟

اس حکیم کا قول تھا کہ صرف ایک دوست جو حقِ دوستی و صحبت ادا کرے ان بہت سے دوستوں سے بہتر ہے کہ جو حالتِ ثروت میں لوگوں کے پاس جمع ہوکر دوستی کا دم بھرا کرتے ہیں۔

کہا کرتا تھا کہ لوگوں نے اس واسطے بازار میں بیٹھنا شروع کر دیا ہے کہ ان میں

صرف اس صورت میں مہمان کو اپنے یہاں رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنے شہر میں ہو اور جہاں وہ مقیم ہو اُس میں اُسکو تصرف حاصل ہو"۔

انخرسیس یہ سنتے ہی بے تکلف اندر چلا گیا اور حکیم سولون سے کہنے لگا کہ "آپ اس وقت اپنے شہر میں ہیں اور اپنے ہی مکان میں مقیم ہیں۔ لہٰذا آپ مجھکو بطور مہمان کے قبول کیجئے اور میری مصاحبت کا سامان مہیا کرائیے" حکیم سولون اس حاضر جوابی سے بہت ہی خوش ہوا۔ اور حکیم انخرسیس کو اپنے یہاں رکھکر بہت ہی خوش ہوا۔ دونوں کی آپس میں ایسی محبت ہو گئی کہ آخر عمر تک برابر قائم رہی۔

حکیم انخرسیس کو نظم کا بڑا شوق تھا۔ اسی لئے اس نے بلاد تاتار کے قوانین کو نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نظم میں قوانینِ حرب بھی لکھے تھے۔

حکیم انخرسیس اکثر کہا کرتا تھا کہ درختِ انگور سے تین چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ نشہ۔ لطف۔ ندامت۔ شہر ایتھنز کی مجلس سے اس کو اکثر تعجب ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ حکما احکام مفید جاری کرتے ہیں اور حمقا اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ اس پر بھی تعجب کیا کرتا تھا کہ یہاں کوئی شخص اگر کسی کو بُرا کہے خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو تو وہ سزا پاتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں گالیاں تک معاف ہیں۔ چنانچہ کھیل کود میں۔ خواہ مخاطب کوئی بڑا ہی آدمی کیوں نہ ہو۔ اُسے اس پر بھی تعجب ہوا کرتا تھا کہ اہل یونان اپنے دسترخوانوں پر پہلے متوسط درجہ کے پیمانوں میں شراب پیتے ہیں۔ اور پھر بڑے پیمانوں میں۔ حالانکہ اُنکو علم ہوتا ہے کہ نشہ ہو چلا ہے۔

یہ حکیم مذاق کا کبھی متحمل نہ ہوتا تھا۔ اور خصوصاً اُنکا جو خوشی کی تقریبوں میں کیے جاتے ہیں۔

(سلسلہ تاریخ الحکما)

یہ حکیم شہر اثینہ میں سینتالیسویں اولمپاد میں آیا۔ اور اپنے شہر میں پہنچنے سے چند روز بعد مارڈالا گیا۔ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں یہ ظاہر ہوا ہے۔ اُس زمانہ میں بہت سے بڑے بڑے حکیم موجود تھے۔ یہ حکیم تاتاری الاصل تھا۔ اور تمام حکما میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا بھائی فدوید اس ملک تاتار کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام اغنوروس تھا۔ اور اس کی ماں یونان کی رہنے والی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں زبانیں جانتا تھا۔ نہایت فصیح اور خوش بیان شخص تھا۔ اکثر بیش قیمت لمبے چوڑے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ دودھ اور دہی کے سوا کچھ نہ کھاتا تھا۔ وعظ و نصیحت کے وقت بہت جلدی اور بہت مختصر بولتا تھا۔ اور الفاظ و عبارات دقیق کا استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی تقریر کے مضامین ہی ایسے باریک ہوتے تھے۔ بلاغت و شروت کلام میں یہ کیفیت تھی کہ اُس کے جملے ضرب المثل بن گئے تھے۔ جو شخص کلام میں اُس کا تتبع کرتا تھا تو لوگ اس کی نسبت کہا کرتے تھے۔ کہ یہ شخص تاتاری عبارت بولتا ہے۔

حکیم انخرسیس نے بلادِ تاتار کا رہنا چھوڑ کر شہر اثینہ میں رہنا پسند کیا تھا۔ اس شہر میں آتے ہی سیدھا حکیم سولون کے مکان پر پہنچا۔ اور اس کے دروازے کو جا کھٹکھٹایا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا اُس سے کہا کہ حکیم سولون سے کہدو کہ ایک شخص دروازے پر کھڑا ہے جو آپ سے ملنے اور آپ کے یہاں بہت مدت کے لئے رہنے کے قصد سے آیا ہے۔ سولون نے جواب میں کہلا بھیجا کہ انسان

واقفیت ہے وُہ اِتنا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو نہیں ایک دُوسرے سے اکتساب ہوا ہے۔ جس کتاب کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے اُس کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوا کہ مصری جوتش کی کتابوں میں مُبتدی اصُول بیان ہوئے ہیں۔ جو نکات اور تفصیل ہندی کتابوں میں درج ہے وُہ بے انتہا ہے اور سینکڑوں جوتشیوں کے ذاتی تجربے ہیں۔ لیکن دعویٰ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تتبع و تقلید کس نے کی۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ابتدائی اصُول ایک قوم نے وضع کئے اور ترقی دُوسری قوم نے کی۔ البتہ اس قدر ظاہر ہے کہ ہندی جوتش میں شرح و بسط مقابلۃً بدرجہا زیادہ ہے۔ اِس قدر بھی انصافاً ہم کو لکھنا واجب ہے۔ کہ ہندی جوتش کی بعض کتابوں میں عربی الفاظ استعمال ہُوئے ہیں اور عربوں کا ایک خاص طریقہ ستارہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس فن میں مہارت رکھتے تھے اور ہندی اور عرب ماہرین علم آپس میں تبادلۂ معلومات کرتے رہے ہیں +

شمیم

تاریخ ابُوالبشر یہ کتاب حال میں شائع ہُوئی ہے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے نے پروفیسر ...... کے حصّہ اول کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس میں جدید تحقیقات کے مطابق آغازِ نوعِ انسان سے بحث کی گئی ہے۔ مفتی صاحب مستحق داد ہیں کہ اُنھوں نے ایسی دلچسپ علمی کتاب ترجمہ کے لئے انتخاب کی اور اس کا نہایت عمدگی سے ترجمہ کر کے اردو علم ادب میں ایک مفید اضافہ کیا۔ اس کتاب کی قیمت فی جلد مجلّد ۶ اور غیر مجلّد ۸ ہے اور صاحب مترجم سے تاج محل بھوپال کے پتہ پر مل سکتی ہے +

سمجھے جاتے ہیں۔

اب رہا یہ امر کہ یہ گرد اگر خانۂ ولادت میں واقعہ نہ ہوں تو پھر برجوں پر جہاں جہاں وُہ ستارے واقعہ ہوں۔ اپنے اپنے اثروں کے عکس ڈالتے ہیں۔ اِن میں سے بعض گرہ بعض خانوں کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ وُہ جہاں واقعہ ہوں اپنے اپنے خانہ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی گرہ ایسے خانہ میں واقع ہے جو اُسکا گھر نہیں تو مالکِ خانہ اس کے ساتھ ملکر اثر پیدا کرتا ہے یعنی بعض ستیارے بعض دیگر ستیاروں کے دوست اور بعض دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ اگر دوست واقعہ ہے تو فبہا ورنہ دشمن گرہ سے اسکا مقابلہ ہوتا ہے۔ جس گرہ کا زور زیادہ ہوتا ہے وُہ اپنا اثر زیادہ دکھاتا ہے اور اکثر اوقات اوسط نکل آتی ہے۔ اس قاعدہ پر جس کے قواعد بشرح وبسط بیان کئے گئے ہیں۔ ہر ایک گرہ کے ایک برُج میں واقعہ ہونے یا اس برُج کے خالی رہنے سے جو اثر ہوتے ہیں جُداگانہ بیان کئے گئے ہیں۔ جنکا ذکر مفصل باعثِ طوالت ہے۔ ہم نے صرف اُسی قدر تذکرہ کیا ہے جس سے مشابہت دکھلانی مقصود ہے۔ جو لوگ ہندی جوتش سے واقف ہیں وہ مندرجہ بالا تحریر سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ کہانتک ہندی جوتش مصری جوتش سے مشابہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ:۔

یا تو یونانی ہندیوں سے جوتش لے گئے اور انہوں نے مصر میں رائج کیا یا کلدانیوں اور چینیوں نے ہندیوں سے حاصل کیا۔

یا ہندی ان ملکوں میں جاتے رہے اور وہاں سے سیکھکر ہندوستان میں لے آئے۔ یا مصریوں نے ہند سے سیدھا حاصل کیا۔

خواہ ان میں سے کوئی صوُرت صحیح ہو۔ جہانتک راقم سطوُر کو ہندی جوتش سے

مولود بہادر۔ شائقِ جنگ۔ تیز طبیعت۔ رنگ سُرخ۔ دراز سینہ۔ متوسط قد۔ جسم کی ہڈیاں بڑی ہونگی۔ بال گھنگر دار۔ آنکھیں باز کی آنکھوں کے مشابہ۔ اگر یہ سیارہ نیچے واقعہ ہوا ہے تو مولود۔ شریر۔ فتنہ پرداز۔ نہ خوفِ خدا نہ خوفِ انسان۔ عادات میں بے تمیز اور بے اصُول ہوگا۔

(۴)۔ شمس (سُورج) اگر اُونچا واقعہ ہے تو مولُود حکمرانی کا شائق۔ نمود کا شائق لیکن مزاج محبت آمیز ہوگا۔ عادات احسن اور گفتگو میں متین ہوگا۔ اگر نچلے درجہ پر واقع ہے تو مولود مُدّمّغ۔ شیخی باز۔ فضول خرچ۔ زبان دراز۔ دُوسروں کی فیاضی پر زندگی بسر کرنے والا ہوگا۔

(۵)۔ زُہرہ (شُکر) اگر اُونچا واقعہ ہے تو مولُود عاشق مزاج۔ محنت سے جی چرانیوالا۔ خوبصُورت۔ ہر قسم کے تعیش کا شائق۔ موسیقی اور فنونِ لطیفہ ونفیسہ کا مشتاق ہوگا۔ رنگین مزاج ہوگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوا تو جسم فربہ۔ موٹے لب۔ چہرہ پر فربہی۔ عادات میں شورہ پُشت۔ بداخلاق۔ بدوضع۔ بدمعاش ہوگا۔

(۶)۔ عطارد (بُدھ) اگر اُونچا واقعہ ہے تو مولود کا دماغ باریک بین۔ ذہن تیز اور طبیعت فصیح و بلیغ۔ صاحبِ حافظہ۔ رُوحانی معاملات میں مشتاق۔ پیشگو ہوگا۔ اگر تجارت کی جانب توجہ کرے گا تو اس سے بڑھکر ہونا مشکل ہے۔ نئے نئے رستے دولت پیدا کرنے کے اختراع کریگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوگا تو مولود دروغ گو۔ لاف زن۔ زبان دراز۔ متلوّن مزاج۔ ابن الوقت ہوگا۔

(۷)۔ قمر (چندرماں) اگر اُونچا واقعہ ہوا تو مولود۔ نرم مزاج۔ بُزدل۔ خیالی پُلاؤ پکانے والا۔ شاعر۔ سفر کا شائق۔ متلوّن مزاج ہوگا۔ میانہ قد۔ گول چہرہ ہوگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوگا تو مولود سُست۔ کاہل الوجود۔ شرابی۔ آوارہ گرد۔ دروغگو ہوگا۔

اس نقشہ میں راہو اور کیت دونوں کا ذکر نہیں ہے جو ہندی جوتش میں گمراہ

پھل دریافت کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات دو دو تین تین ستیارے ایک ہی برج میں جمع ہوتے ہیں اور دیگر گھر خالی رہتے ہیں۔ خالی گھر کے اثر مقابلہ کے گھر کے گرہ سے دریافت ہو جاتے ہیں۔ طریق دریافت کی ماہیت نہ معلوم کس بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ علم کس طرح سے حاصل ہوا۔ غالباً تجربات کا مجموعہ ایسا تیار ہو گیا ہوگا کہ اُس سے کوئی کلیہ قاعدے موضوع کئے گئے ہیں۔ چنانچہ

(۱)۔ زحل (یعنی سینچر) ہے۔ اگر وہ خانہ پیدائش میں بوقتِ ولادت موجود ہے تو مولود ثقہ۔ متین۔ صابر۔ مطالعہ پسند ہوگا۔ مستورات سے تعشق نہ رکھیگا لیکن جس کے ساتھ اُس کا عشق ہوگا ثابت قدم ہوگا۔ رُوحانی معاملات کا شغل رکھیگا۔ قد دراز دست و پا لمبے ہونگے۔ بال سیاہ ابرو آپس میں ملے ہُوئے ہونگے۔ لیکن اگر یہ ستیارہ نچلی منزلت کا واقعہ ہوا ہے (جو ایک اصطلاحی لفظ ہے) تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مولود حاسد۔ حریص۔ کینہ ور۔ دروغ گو۔ اور بے صبر شخص ہوگا۔ جملہ سیاروں کا اثر موجودات حیوانات اور نباتات پر بھی ہوتا ہے جو جوتش میں نامزد کئے گئے ہیں جنکا ذکر طوالت کی وجہ سے متروک کیا جاتا ہے۔

(۲)۔ مشتری (برہسپت) اگر خانہ ولادت میں واقعہ ہے تو وہ اُونچا واقعہ ہوا ہے تو قد دراز۔ بیضوی شکل۔ موٹی آنکھیں۔ بال گنجان۔ دانت اچھے ہونگے۔ مولود فیاض۔ مہمان نواز۔ لذاتِ دُنیوی کا شائق ہوگا۔ بیوی سے محبت رکھیگا۔ کمینہ باتوں سے اجتناب کرے گا۔ آواز بلند اور صاف ہوگی۔ اگر یہ ستیارہ نیچ واقعہ ہوگا تو مولود بوالہوس۔ مغرور۔ عیاش۔ فضول خرچ اور ظالم و جابر ہوگا [illegible] سے عکس ہوگا۔

(۳)۔ [illegible] کئے جاتے ہیں۔ اگر اونچا واقعہ ہوا ہے تو

تعلقات بھی اسی گھر سے ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۴۔ مؤنث رنگ سرخ ۔معدہ ۔سینہ کشش سے متعلق ہے۔ اس گھر سے
میراثِ پدر۔ زندگی کے آخری حصّہ کی بابت احوال ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۵۔ رنگ سیاہ وسفید۔ مذکر۔ دل پشت جگر سے تعلق ہے۔ اولاد۔
ثروتِ دُنیوی لذاتِ دنیوی۔ کامیابی کاروبار سے متعلق ہے۔

خانہ ۶۔ سیاہ رنگ مؤنث۔ مولود کے ملازم۔ مویشی۔ جدیان کے متعلق۔ معدہ
امعا پر اثر ہوتا ہے۔

خانہ ۷۔ سیاہ۔ مذکر۔ ازدواج و عشق کے متعلق ہے۔

خانہ ۸۔ سبز و سیاہ۔ مؤنث جسم کے نچلے حصّہ سے تعلق ہے۔ موت کس طرح
سے ہوگی۔ کیا کیا مال بذریعہ وصیت ملیگا۔

خانہ ۹۔ سبز و سفید۔ ران اور سرین سے تعلق رکھتا ہے۔ دریائی سفر اور
سفر دُور و دراز سے متعلق ہے۔ بیوی اور اس کے عزیزوں سے تعلقات
اس گھر سے ظاہر ہوتا ہے۔

خانہ ۱۰۔ مؤنث سُرخ سفید۔ زانو کے متعلق۔ کاروبار منصبی پیشہ۔ مادر کے تعلقات
ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۱۱۔ مذکر۔ لات کے متعلق۔ دوست اور آشناؤں کے حالات ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۱۲۔ مؤنث سبز رنگ۔ رنج والم کا گھر ہے۔ دشمن۔ خرابی دُنیوی سے تعلق ہے۔
پاؤں اور انگوٹھے سے تعلق ہے۔

نقشہ بالا سے ظاہر ہے کہ ۱۲ برج بارہ گھر میں کیونکر واقع ہوسکتے ہیں۔ بوقت
ولادت یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سیارہ کس برج میں ہے۔ سیاروں کی گردش کے
حساب سے اگر برجِ اوّل میں جو پیدائش کا خانہ ہے کوئی سیارہ موجود ہے تو [illegible]

باطل یا صحیح ہو۔ یورپ کے منجم مصری جوتش پر عمل کرتے ہیں۔ جو اتفاق سے ترجمہ ہو کر باقی رہگیا ہے۔

اوکلٹ ریویو میں ہمارے شہنشاہ معظم کا زائچہ درج ہوا ہے۔ ہارمزورتھ انسائیکلوپیڈیا میں جرمن کے مشہور شاعر گیٹے کا زائچہ درج ہے جو صحیح ثابت ہوا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک کتاب جسکا نام انفلوئنس آف دی سٹارز ہے روزا آواگن نے شائع کی۔ اس میں مذکور ہے کہ ابتدا یہ علم سینہ بسینہ مصر میں جاری رہا اور حضرت مسیح کے ایک ہزار سال قبل سے ستاروں کا مشاہدہ مصری کرتے رہے۔ سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں کلاویس بطلیموس نے ۴ جلدوں میں اس علم کے قواعد قلمبند کئے۔ اس کے ترجمے انگریزی زبان اور ہسپانیہ کی زبان میں ہو گئے۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں جان ویلی نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مفصل ذکر تو اس فن کا اس محدود تحریر کے احاطۂ مجوزہ سے باہر ہے تاہم شائقین جوتش کی دلچسپی کے لئے زائچہ کے بارہ خانوں کا ذکر کافی ہوگا۔ جو ہر ایک زائچہ میں ہوتے ہیں۔

خانہ اوّل - یہ گھر مذکر ہے۔ اس کا تعلق سر۔ زبان۔ اور حافظہ سے ہے۔ یہ جسم کا گھر ہے اور سب سے ضروری خانہ ہے۔ اگر اس میں منگل واقعہ ہو تو مولود کے چہرہ پر تل یا داغ ہونا ضروری ہے۔ مختلف ستاروں کے اس گھر میں واقعہ ہونے سے مختلف اثر بیان کئے جاتے ہیں۔ اس گھر کا رنگ سفید ہے۔

خانہ ۲ - مؤنث ہے۔ دولت دنیوی سے اور مولود کی گردن سے متعلق ہے۔ رنگ سفید ہے۔

خانہ ۳ - رنگ سرخ زردی لئے ہوئے۔ مذکر ہے۔ ہاتھ بازو شانہ مولود سے تعلق رکھتا ہے۔ سفر۔ ہمسائگان۔ تصنیفات۔ برادر ہمشیرہ کے

کہ علمِ ہندسہ دُنیا کے مختلف حصّوں میں ابتدًا ہند سے گیا ہے۔ چنانچہ یہ نام بھی اس امر پر دال ہے۔ لیکن اس امر میں شُبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آیا مصریوں اور یونانیوں نے ہند سے جوتش کا علم حاصل کیا۔ بہت سے علمائے اسلام جوتش کو لغو اور فرضی سمجھتے رہے لیکن ان میں سے بعض بعض اس کی تحصیل اور مشق میں مصروف رہے نصاریٰ کے ممالک میں بھی اس کی مخالفت ہوتی رہی۔ تاہم بعض اُن میں سے بھی اس کے مشتاق رہے۔

یہ امر مانا جاتا ہے کہ چینی۔ ہندو۔ مصری۔ کالدانی زمانۂ قدیم میں جوتش کے قائل تھے۔ رفتہ رفتہ خواہ کچھ ہی وجوہات ہوں لوگوں کے عقیدے میں فرق آگیا باوجود اس زوال کے خلیفہ منصورؔ کے عہد میں منجّم دربار میں رہتے تھے اور آئندہ کا حال بیان کیا کرتے تھے۔ علیٰ ہذا کیتھلک عیسائیوں میں اسکا شغل رہا چنانچہ ایک شخص کارڈینل ڈالی نے حضرت مسیح کا زائچہ بنایا تھا۔ فرانس کے بادشاہ لوئی یازدھم نے ایک نجومی گیلی اوٹی ملازم رکھا ہوا تھا۔ انگلستان میں بعضے پروٹسٹنٹ عیسائی اسکے قائل رہے۔ ولیم للی ایک بڑا مشہور نجومی انگلینڈ میں ہوچکا ہے اس کی پیشینگوئی دربارۂ وَبا کے صحیح نکلی۔ وبا کے بعد کی آتشزدگی کے بارہ میں بھی اس کی پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی علیٰ ہذا چارلس اوّل کے متعلق بھی اس کی پیشینگوئی صحیح تھی۔ حتیٰ کہ اسے پارلیمنٹ سے بہ عرصہ ہی خدمات کے صلہ میں پنشن بھی عطا ہوتی رہی۔ شاعروں میں سے ڈرائیڈن نے اپنے بچوں کے زائچے بنوائے۔ علم ہیئت کی تحقیقات نے اس فن کو بہت ضُعف پہنچایا اور رفتہ رفتہ یہ فن ابلہ فریبوں کے ہاتھ منتقل ہوگیا۔

اب ہم کو یہ دکھلانا ہے کہ ہندی جوتش کی مشابہت مصری جوتش سے حیرت انگیز ہے [illegible] یورپ میں اس طرف توجہ ہوئی ہے [illegible]

[illegible]

شمار کی کوشش ہوئی لیکن مکمل فہرست ہنوز تیار نہیں ہوئی - بقول راجہ بیربل کے جتنے بکری کے کھال پر بال ہیں - اتنے ہی ستارے اور سیارے ہیں - ہندؤوں کے راہو اور کیتو کا پتہ نہیں چلا - یا تو یہ ستیارے فرضی تھے یا ہنوز دوربین کافی طاقت کی ایجاد نہیں ہوئی ہو - یا ممکن ہے کہ نئے دریافت ہوئے ہوئے سیارے یورینس (Uranus.) اور نپچون (Neptune.) راہو اور کیتو ہوں -

یونانین اور عربی علم ہیئت میں صرف سات ستارے مانے جاتے ہیں - یعنی :-

زحل	سنیچر	سیٹرن
عطارد	بدھ	مرکیوری
زہرہ	شکر	وینس
مشتری	برہسپت	جوپیٹر
مریخ	منگل	مارس
شمس	سورج	سن
قمر	چندرمان	مون

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جو صفتیں ان سیاروں کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ وہی ہیں جو ہندیوں میں مشہور ہیں - ہم سوال کرتے ہیں :-

اوّل - کیا یہ ممکن ہے کہ چند اشخاص مختلف ملکوں میں ستاروں اور سیاروں کے مجموعوں کو دیکھنے اور شناخت کے لئے بجنسہٖ وہی اشکال اپنے ذہنوں میں تجویز کریں جو اُنکے خیال میں مشابہ بعض متخیّلہ اشکال فرضی کے ہوں -

دوم - کیا یہ غالب ہو کہ اگر جوتش محض تجربہ پر بنیاد رکھتا ہے تو ہر ایک ستارے کے متعلق وہی تاثیریں مختلف ملکوں کے مشاہدہ کرنے والے بیان کریں -

ہمارے خیال میں اس درجہ کا توارد ہونا تقریبًا ناممکن ہے - یہ تسلیم کیا جاتا ہے

جوتش

اوّل ہم ذیل میں بُرجوں کے نام درج کرتے ہیں جو عربی یورپین اور ہندی علم ہیئت میں معروف ہیں اُس سے نتیجہ بعدہٗ اخذ کرینگے :-

عربی	ہندی	لاطینی
حمل	میکھ	آیریز
ثور	برکھ	ٹورس
جوزا	متھن	جیمینائی
سرطان	کرک	کینسر
اسد	سنگھ	لیو
سنبلہ	کنیا	ورگو
میزان	تلا	لیبرا
عقرب	برچیک	سکورپیو
قوس	دھن	ساگی ٹیریئس
جدی	مکر	کیپریکارن
دلو	کنبھ	اکیوریس
حوت	مین	پیسیز

نقشہ مندرجہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ جس لفظ سے ہر ایک بُرج نامزد کیا گیا ہے اُس کے تینوں زبانوں میں ایک ہی معنی ہیں۔

ستاروں کا مجموعہ فلک پر بیشمار ہے۔ زمانہ حال میں اور نیز زمانہ قدیم میں اُنکے

ہی مسرور ہوا کہ ایک سے زیادہ کارخانوں نے فرنیچر میں یورپ کے اعلیٰ کارخانوں کا معقول کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ ایک دوکان بریلی کی اور ایک دوکان پنجاب سے آئی ہوئی گجرات کی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

قدیم۔ یہ امر تو اس وقت تو زیر بحث نہیں کہ ہندوستان میں کوئی صنعت ترقی نہیں کر سکتی یا کر نہیں رہی۔ میں نے بھی اُن کارخانوں کا کام دیکھا ہے جن کا آپ ذکر کرتے ہیں۔ بیشک اُن کی کوشش قابلِ داد ہے مگر اُن کے وجود سے آپ کے لئے کوئی چنداں مفید دلیل پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کام اُن کاموں میں ہے۔ جو مدت سے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ فنِ نجاری میں بڑے بڑے اعلیٰ صناع ہندوستان میں ہو گذرے ہیں۔ جو اپنے کام رنگ میں کسی یورپین کاریگر سے کم نہیں۔ علاوہ بریں دستکاری میں ہندوستان اچھا نام پیدا کر چکا ہے اور اب تک دستکاری میں اسے شکست دینا آسان نہیں۔ اِن نئے کارخانوں نے پُرانی کاریگری سے طرز جدید پر کام لیا ہے۔ مگر جن چیزوں کا مَیں ذکر کر رہا تھا وُہ دستکاری سے متعلق نہ تھیں۔ بلکہ کلوں اور انجنوں کے متعلق اور علمی ایجادات کا نتیجہ تھیں اور میری بحث یہ تھی کہ تاحال علمی ایجادات کے تعجب سے ہمارے دماغ مغلوب ہیں اور کلوں کے کام ہماری دستکاری پر غالب ہیں۔ پس اس کاریگری کو دیکھ دیکھ کر ہم کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

(باقی وارد)

عبدُالقادر

یورپ کے۔ اُن کی ترتیب لیاقت کسی یورپین صناع کی۔ کونسی بات ہو جس پر ہم فخر کرسکیں۔ کہ یہ ہماری کرامات ہے۔ ہاں ایک چیز ہم بھی اس مجموعہ میں پیشکش کرتے ہیں اور وُہ چشم حیراں ہے۔ اُستاد کا شعر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔ کس بیساختہ پن سے کہا ہے ؎

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہو
چشم نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

جدید۔ مَیں آپ کی اس منطق کا قائل نہیں کہ ہم ان چیزوں کو دیکھکر ہمیشہ محوِ حیرت ہی رہینگے۔ اس میں شک نہیں کہ فوری اثر حیرانی کا ہوتا ہے اور اپنی ناقابلیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس ہی قابلیت کا آغاز ہے اور اس سے ہر ترقی کی ابتدا ہی۔ اور اس کا نام مَیں نے "آنکھ کھُلنا" رکھا ہے۔ آپ مجھ پر اعتراض کرتے ہُوئے درحقیقت میری تائید کررہے ہیں۔ اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ بہت سے سوچنے والے دِل اور دماغ اِن ایجادات اور ترقیوں کو دیکھکر حیران ہوتے ہیں اور اپنی کمی کو محسُوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کاموں کے سیکھنے کی تدبیر اُس احساس سے فقط ایک قدم آگے ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو۔ اسی نمائش کے اندر اس کے ثبوت موجُود ہیں۔ بہت سی چیزیں جو پہلے ہمارے ہاں نہیں بنتی تھیں۔ اور باہر سے بن کر آتی تھیں۔ اب ہمارے ہاں بننے لگی ہیں اور ہمارے ہی ہم وطن کاریگروں نے بنائی ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں جو ابھی ہماری صنعت سے بالاتر نظر آتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد بننے لگیں گی۔ مَیں کل ہی اتفاق سے فرنیچر کے کمرے میں گیا۔ تو یہ دیکھکر نہایت

اہل یورپ کو ایک مافوق الفطرت قوت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن سب تو ایک سے نہیں بہت ایسے بھی تو ہیں کہ یورپ کی ترقی سے مستفید ہو کر اپنے ملک کی ترقی کی فکر میں ہیں۔ اُن کے لئے تو یہ تجربے جو یہاں دکھائے جا رہے ہیں۔ فائدہ سے خالی نہیں۔ آپ نے دیکھا ہے بجلی کو علوم جدیدہ نے کس طرح دست بستہ باندی بنایا ہے۔ اور اس نمائش میں کیا کیا کام اس سے لیا جا رہا ہے۔ شام ہوتے ہی نمائش کے وسط کے قریب جو گھنٹہ گھر بنا ہے کس طرح خود بخود منور ہو جاتا ہے سینکڑوں برقی لمپ جو اس پر لگے ہیں۔ یکبارگی روشن ہو کر اسے بقعۂ نور بنا دیتے ہیں۔ فوارے اسی بجلی کی بدولت طرح طرح کے رنگ بدلتے ہیں۔ اور رات روشنی میں رشکِ نیمروز بن جاتی ہے۔

قدیم۔ جی ہاں میں نے یہ سب دیکھا ہے۔ اور بارہا اس کی خوبصورتی سے میرا دل خوش ہوا ہے۔ لیکن مُلکی پہلو سے میرے دل پر تو ہمیشہ مایوسی چھائی ہے۔ اور میں نے آہ سرد بھر کر کہا ہے۔ کہ یہ چراغان ہمارے لئے باعث مسرت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم بڑی محنت سے مٹی کے چراغوں میں سرسوں کا تیل اور رُوئی کے فتیلے ڈال ڈال کر چراغاں کیا کرتے تھے اور جتنی دیر روشنی درکار ہوتی اتنی دیر دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ کہ کوئی جھونکا تیز ہوا کا آکر ہمارے دیئے نہ بجھا دیے اور اب برقی چراغوں کی قطاریں ہیں۔ جو شیشے کے چھوٹے چھوٹے فانوسوں کے نیچے نہایت محفوظ حالت میں روشن ہیں۔ نہ نہیں ہوا کا ڈر نہ آندھی کا خطرہ مگر فرق کیا تھا۔ وُہ روشنی ہماری اپنی ہوتی تھی اور یہ روشنی دوسروں سے مانگی ہُوئی۔ نمائش کے میدان میں یہ منوّر مینار کھڑا ہے۔ مگر اس روشنی میں ہمارا کیا ہے۔ برقی روشنی ایجاد اہل یورپ کی۔ لمپ ساخت

قدیم - ممکن تو بہت سی چیزیں ہیں جو بسا اوقات واقعی طور پر ظہور میں نہیں آتیں اہلِ علم کے نزدیک محض امکانات کی بحث بالکل غیر معتبر اور ناکافی ہے۔ واقعات پر بحث ہونی چاہیئے - کیا آپ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو لوگ اس اُڑان کی سیر دیکھتے ہیں - اُن کے یہ خیال ہوتے ہیں جن کے امکان آپ بتا رہے ہیں؟ میرا تو مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں تو روز دیکھتا ہوں کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد تو اس حیرت سے اس نظارہ کو دیکھتی ہے۔ جیسے وُہ کسی اَور مٹی کے بنے ہُوئے ہیں اور اس ایجاد کے موجد اور اس ہنر کے جاننے والے کسی اَور مٹی کے - اُن کی آنکھیں صرف کُھلی ہی نہیں - بلکہ حیرانی سے کُھلی رہ جاتی ہیں - اسکا اثر بجائے ترقی کا حوصلہ دلانے کے اور سائنس سیکھنے کا شوق بڑھانے کے جہانتک میرا اندازہ ہے ہم ہندوستانیوں کے حوصلوں کو پست کرنے والا ہے - ہم ابھی سائنس میں مُبتدی بھی نہیں اور اہلِ یورپ منتہی کے درجہ کو پہنچتے جاتے ہیں اور انکی رفتار ترقی اس قدر تیز ہے - کہ ہم اگر پر لگا کر بھی اُڑیں تو انکے برابر نہیں چل سکتے - اور تو اور اس فرق کو تو ملاحظہ کیجئے - مَیں نے ان کانوں سے ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ پچھلے چند دنوں میں ہی اچھے اچھے ثقہ اور معقول لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے "بھئی انہی لوگوں کا حوصلہ ہے - مجھے تو اگر کوئی ہزار روپیہ ساتھ دے اور کہے کہ جاؤ اس کے ساتھ سوار ہو جاؤ - تو مَیں تو کبھی نہ جاؤں کہ موت کے مُنہ میں کُود نا ہے - ہم تو ابھی اتنے سستے ہُوئے نہیں - کہ یُوں مُفت میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں"۔

جدید - مَیں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے مُلک میں ابھی کَمی تعلیم کے باعث بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی ایجادات سے مرعوب ہوتے ہیں اُ

نہیں ہونے چاہئیں۔ کہ ایک شعر پڑھ دینا گویا ایک برہانِ قاطع پیش کر دینا ہی۔ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ نمایش بھر میں کوئی ایک چیز بھی ایسی بتائیے جسکو ہم اپنے ملک کی بیداری یا آنکھ کھُلنے کا ذریعہ قرار دے سکیں۔

جدید۔ ایک چیز ہو تو کہوں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یہاں ایک ایک چیز عجیب اور مفید ہونے میں لاجواب ہی۔ مثال کے طور پر آپ سب سے پہلے اس ہوائی جہاز کو ہی لیجئے۔ جسکی حیرت انگیز اُڑان ہم آپ ابھی دیکھکر آئے ہیں۔ اِنسان ہزاروں برس سے اس فکر میں تھا کہ ہوا میں اُڑنے کی کوئی ترکیب پیدا ہو۔ صدیوں کی محنت کا آج ثمر ملا ہی۔ کہ اُڑان ممکن ہوگئی ہی۔ آپنے دیکھا۔ اس جہاز ہوائی کا وُہ فرانسیسی جہازران کس طرح بیدھڑک زمین سے اُبھرتا ہی۔ کس وُثوق کے ساتھ آسمان کی طرف بڑھتا ہی اور کتنی بلندی پر پہنچکر چکر پر چکر لگاتا ہی۔ سائنس کے عجائبات میں اس سے بڑھکر اچنبھا اسوقت نہیں ہی۔ اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس نمائش کی بدولت ہزارہا ہندوستانیوں نے اس ایجاد کو بچشم خود دیکھ لیا۔

قدیم۔ ہوائی جہاز کے عجیب ہونے میں کلام نہیں۔ بیشک اچنبھا ہی۔ اور میں پھر اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اور تماشوں سے بہتر تماشا ہی۔ کیونکہ بجائے فریب نظر کے سائنس کا کرشمہ اور ترقی علم کا نتیجہ ہی۔ مگر میرا اعتراض ابتک قائم ہی کہ ہمیں کوئی فائدہ اس کے دیکھنے سے نہیں ہوسکتا۔

جدید۔ کیا جانیں آپ فائدہ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان چیزوں کا یہی فائدہ ہوتا ہی کہ انسان کے خیالات وسیع ہوں۔ اسے معلوم ہو کہ انسان محنت اور ہمت سے کیا کچھ کر سکتا ہی۔ سائنس کے پڑھنے اور سیکھنے کا شوق پیدا ہو اور اہلِ ہند اہلِ یورپ کی ترقی دیکھکر خود بھی ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اور یہ سب اس ہوائی جہاز کے مشاہدہ سے اور دیگر مشاہدات سے ممکن ہے۔

بند ہیں - یعنی یا تو وہ ایسے خوابِ غفلت میں ہیں کہ "جاگنا حشر تک قسم ہے"۔
اور یا اگر کسی قدر بیدار بھی ہو چکے ہیں تو بہت سی چیزوں سے جو اُن کے لئے مفید ہیں بے خبر ہیں اور اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اُنکی آنکھ ابتک نہیں کھلی۔

قدیم - ہمارے ملک کی غفلت کی نیند کی اگر پوچھئے تو اس کے کئی سبب ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نمائش یا ایسی اور بہت سی نمائشیں ہماری اس غفلت کا کیونکر علاج ہو سکتی ہیں - رہا دوسرے معنی میں آنکھ کھلنا سو اسکے فوائد کا میں چنداں معترف نہیں - میں تو دس پندرہ دن سے ہر روز شام کو یہاں کا ہجوم دیکھ جاتا ہوں - میری آنکھ اگر اب تک بند تھی تو اب بھی بند ہے - مجھے تو کوئی ترقی محسوس نہیں ہوئی۔

جدید - مجھے یہ سُنکر بہت تعجب ہوا - کہ آپ نے اتنے دنوں میں اس مجموعہ عجائبات میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی - جو آپ کے لئے نئی ہو - یا جسے دیکھکر آپ کے خیالات میں پہلے سے زیادہ وسعت یا معلومات میں ترقی ہوئی ہو - اگر یہ سچ ہے تو معاف کیجئیگا - آپ چشمِ بینا سے محروم ہیں - یہاں تو قدم قدم پُر کرشمہ دامنِ دل میکشد" کا مضمون ہے - ہندوستان کے مشہور اور بے بدل شاعر مرزا غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

نخشِش ہے جلوہ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

قدیم - میں یہ دیکھکر تو خوش ہوا کہ آپ کو ہماری شاعری سے کچھ تعلق باقی ہے - مگر میں اشعار کی سند نہیں مانتا - شعر و سخن کے شوق میں تو میں کسی سے کم نہیں لیکن اس قسم کے مباحثے اس سے نہیں طے ہوتے - یا کم از کم اس طرح طے

بحث کرنے والے دونوں صاحبوں کے نام چونکہ معلوم نہیں ہو سکے - اس لئے انہیں باعتبار
اس تمدن کے جس کے وہ اپنی اپنی جگہ قائم مقام تھے - اس مضمون میں جدید و قدیم
کے نام سے تعبیر کیا جائیگا:-

مسٹر جدید (میاں قدیم سے) فرمایئے۔ آپ اس نمائش کو کیسا پاتے ہیں؟ مفید چیز ہے نا؟

میاں قدیم (کسی قدر تامل کے ساتھ) آپ کس اعتبار سے پوچھتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ تماشا تو بہت اچھا ہے - ایک اُجلا مہذب میلا ہے - اور یہ میلا تفریح کے بہت سے اُور سامانوں سے جو ہمارے ہاں مروج ہیں بہتر ہے - لیکن جو محنت اور صرف اس پر ہوا ہے - اس کو دیکھتے ہوئے مجھے تو ایسی زیادہ کارآمد چیز معلوم نہیں ہوتی -

جدید - مجھے یہ سُنکر حیرت ہُوئی ہے کہ آپ جس نمائش کو کارآمد نہیں سمجھتے - یورپ میں ایسی نمائشیں صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کا ایک مجرب نسخہ ہیں اور ہماری گورنمنٹ نے اس نمائش میں نہ صرف ظاہری حیثیت میں یورپ کی نمائشوں کا ایک نمونہ ہمیں دکھا دیا ہے - بلکہ ہماری ترقی کے لئے وُہی مجرب نسخہ جو یورپ میں مفید ثابت ہو چکا ہے - مہیا کیا ہے -

قدیم - وہاں کی باتیں تو آپ جانیں جو وہاں ہو آئے ہیں - شاید وہاں نمائشیں مفید ثابت ہوتی ہوں یا مناسب حال ہوں - مگر یہاں کیا باعتبار ملک کے عام افلاس کے اور کیا باعتبار ہماری موجودہ کاروباری حالت کے کچھ غیر موزون سی نظر آتی ہیں - آخر بتایئے تو سہی - انکا مقصد کیا ہے اور فائدہ کیا؟

جدید - نمائش کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھولدے ہندوستان کے آدھے امراض کا باعث یہی ہے کہ اہلِ مُلک کی آنکھیں

آنکھ کھلنا

سنہ ۱۹۱۰ء کا آخری دن تھا اور سنہ ۱۹۱۱ء کی آمد آمد تھی۔ میں شام کے قریب الہ آباد کی نمائش کے اُس حصّہ میں جہاں نمائش کا وسیع میدان دریائے جمن کے کنارے سے آملا ہے ٹہل رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں دریا کے پانی کو چمکیلے سُرخ رنگ میں رنگ رہی تھیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہوائی جہاز یا زمانہ جدید کے اُڑن کھٹولے کا حیرت انگیز منظر دیکھنے کے بعد منتشر ہو رہا تھا۔ اور بہت سے تماشائی زن و مرد شفق کے نظّارہ کے شوق میں دریا کی طرف کھنچے آتے تھے۔ اور دو دو چار چار مل کر کنارِ دریا پر کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ میں بھی ایک گروپ میں جا ملا۔ وہاں دو صاحبوں میں ایک عجیب بحث چھڑ گئی۔ اُن میں سے ایک اپنی وضع سے انگریزی پڑھے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور دُوسرے کوئی پُرانی وضع کے بزرگوار تھے۔ یہ گفتگو ایسی دلچسپ تھی کہ میں دیر تک اسے سنتا رہا۔ اور اس میں مجھے بہت سے مضامین غور طلب نظر آئے۔ اس گفتگو کا خلاصہ حافظہ کی مدد سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ ابنائے وطن اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کریں۔

ممالک متحدہ کی عالیشان نمائش جو دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں شروع ہوئی اور فروری سنہ ۱۹۱۱ء تک جاری رہیگی دیکھنے کے قابل ہے۔ اسکا حال بہت سے اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوا ہے اور نمائش کی کمیٹی کی طرف سے ایک کتاب تیار کی گئی ہے جس کی قیمت صرف ایک آنہ ہے۔ اس میں سب ضروری حالاتِ نمائش درج ہیں۔

شہنشاہ ہند کے محکمہ طبی کے دو اعلیٰ افسر صاحبان "مخزن حکمت" کی نسبت کیا فرماتے ہیں :-
شہنشاہ ہند کے محکمہ طبی کے ایک اعلیٰ افسر یعنے
جناب میجر سید حسن بلگرامی ایم۔ ڈی۔ ڈی۔ پی۔ ایچ (کیمبرج)
آئی۔ ایم۔ ایس (ریٹائرڈ) مقیم لندن فرماتے ہیں کہ :-
"مخزن حکمت"
کو دیکھ کر میں نہایت خوش ہوا ہوں۔ یہ نہایت قابلیت سے لکھی ہوئی
طب خانگی پر ایک عام فہم اور مکمل کتاب ہے۔ جو اردو خواں ملک
کے لئے ایک قیمت غیر متر قبہ ثابت ہوگی۔ جہاں تک مجھے معلوم
ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ جسکی تصنیف
کے لئے میں قابل مصنف کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔
میں خیال کرتا ہوں کہ اس کتاب میں جو متعدی اور چھوت کی
بیماریوں کا باب ہے وہ عوام الناس کیلئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا لیکن
اسکے دیگر ابواب بھی وقت ضرورت نہایت کار آمد ثابت ہونگے۔
شہنشاہ ہند کے محکمہ طبی کے ایک اعلیٰ افسر یعنے
جناب کرنل ذوالنور احمد ایم۔ ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔
(ریٹائرڈ) مقیم دہلی فرماتے ہیں کہ :-
"مخزن حکمت"
(یا)
گھر کا ڈاکٹر و حکیم
(مصنفہ شمس الاطباء)
نہایت قابلیت سے لکھی ہوئی ایک جامع کتاب ہے اور طب خانگی پر اردو زبان میں انگریزی
و یونانی کی صرف واحد تصنیف اور اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ میرے
خیال میں ہر ایک اردو خواں شخص کو نیز ہر ایک ڈاکٹر
و حکیم کو اس کتاب کی ایک ایک جلد ضرور اپنے پاس
رکھنی چاہیئے۔
یہ نامور ڈاکٹر بھی مخزن حکمت کی قدردانی کی بڑے
زور سے سفارش کرتے ہیں :-
(۱) جناب ڈاکٹر سید محمد وارث ایم۔ ڈی (اڈنبرگ) ...
(۲) جناب ڈاکٹر بی۔ ایل۔ ڈھینگرا ایم۔ ڈی ریاست جیند
(۳) جناب ڈاکٹر محمد ماشاء اللہ خان صاحب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس (لندن)
(۴) جناب ڈاکٹر ہیچ بجیو بہار دواج ایف۔ آر۔ سی۔ ایس (اڈنبرگ)
(۵) جناب ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ رائے ایم۔ آر۔ سی۔ پی۔ (لندن)
(۶) جناب ڈاکٹر کرنل اللہ جوایا صاحب افسر اعلیٰ محکمہ طبی (افغانستان)
(۷) جناب رائے بہادر ڈاکٹر بیلی رام صاحب سابق معلم تشریح میڈیکل کالج (لاہور)
(۸) جناب خان بہادر ڈاکٹر امیر شاہ صاحب آنریری مجسٹریٹ (لاہور)
(۹) جناب ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب معلم علم تشریح میڈیکل کالج (لاہور)
(۱۰) جناب ڈاکٹر دیوان علی صاحب سول سرجن (انبالہ)
حجم کتاب ایک ہزار تین سو چوبیس صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت کتاب بلا جلد چار روپے مجلد چار روپے ملنے کا پتہ کتب خانہ جناب شمس الاطباء (گمٹی بازار) لاہور

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو عام ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

نول کشور پریس لاہور میں چھپا اور منشی فضل الٰہی پبلشر نے شائع کیا

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ... فی پرچہ ساڑھے تین آنے

تمہیں سوچو کوئی تدبیر اے سید کہ اب کیا ہو

(از سید کاظم حسین صاحب ہدف لکھنوی)

ہیں منفعل وہ حشر کے دن دادخواہ سے ملتی نہیں نگاہ ہماری نگاہ سے
آئینہ کی بھی آنکھ ہے مدت سے منتظر اپنی بہار دیکھ لو اپنی نگاہ سے
دل کو شکست غمزہ و ناز و ادا سے ہو تنہا کوئی بھی لڑ نہیں سکتا سپاہ سے
کچھ اس میں شک نہیں ہو کہ گردش نصیب ہوں چکر میں ہوں ہیں الفت چشم سیاہ سے
دردِ دل و جگر کا کرو کچھ ہدف علاج
کیا فائدہ ملیگا تمہیں۔ آہ آہ سے

(از جناب ابوالاعجاز صاحب عرشی)

شبِ فراق کے صدمے اُٹھائیگا پھر کیا کسی پہ اے دلِ نالاں تو آئیگا پھر کیا
کیا زباں سے پھر انکار بوسہ لبِ لعل لہو کے اشک ستمگر رلائے گا پھر کیا
یہی جو روز کا اے دل ترا اُلجھنا ہے کسی کی زلف میں مجھ کو پھنسائیگا پھر کیا
بٹھا کے پاس رقیبوں کو اب وہ شعلہ حسن برنگ شمع مرا دل جلائیگا پھر کیا
دلا یہ ہستی موہوم بھی غنیمت ہے گیا جو یاں سے عدم کو وہ آئیگا پھر کیا
حصول کیا تجھے گردوں مرے مٹانے سے بگاڑ کر مجھے ظالم بنائے گا پھر کیا
ابھی سے اے دلِ ناداں جو ہے یہ بیتابی شبِ وصال کی لذت اُٹھائیگا پھر کیا
دکھائی نزع میں جس نے نہ شکل اے عرشی
وہ بے وفا مری تربت پہ آئے گا پھر کیا

ٹوٹ جائے غش ہو طالبِ دید عشق اتنا تو ہو دکھانے کو
روئی انجامِ گل پہ شبنم تر آئی جس دم صبا ہنسانے کو

(از پنڈت پربھو دیال صاحب متخلص بہ عاشق لکھنوی)

ڈنکا کبھی جہاں میں بجتا رہا تمہارا تعظیم کو تمہاری قومیں ہیں صف آرا
علم و ہنر تمہیں سے۔ سارے جہاں میں پھیلے حصہ میں تھا تمہارے کسب کمال سارا
علامۂ زمانہ سارے جہاں نے مانا نفیس صنعتیں تمہاری عالم میں آشکارا
چمکا کئے زمیں پر۔ تم آفتاب بنکر ہر دم بلندیوں پر چمکا کیا ستارا
تہذیب کس بلا کی پہلے بھری ہوئی تھی اب ہیں مہذبوں میں وحشی لقب تمہارا
غفلت شعاری چھوڑو برباد ہو چکے ہو عشرت پسندیوں نے کھویا ہی کھوج سارا
گذشت موسمِ گل شد نالہائے بلبل
تا کے شرابِ مستی یا ایہا السکارا

(از جناب سید تمیذ حضرت ظہیر دہلوی)

وفا ہی عہد میں کیوں ہو تامل سوچتے کیا ہو کوئی دشوار ہے یہ کام تم دل سے اگر چاہو
نکالو آرزو کے بدلے دل کو میرے سینہ سے رہے دل ہی نہ پہلو میں نہ پھر دل میں تمنا ہو
وفا کی ہم رکھیں امید کس برتے پہ اب اس سے بھروسا جب نہیں دل کا تو کیا اُنکا بھروسا ہو
نہ اپنوں میں محبت ہو نہ یاروں میں مروت ہے یہ کہئے کوئی کس برتے پہ دنیا میں کسی کا ہو
ملے جو خود سے ملجائیے کھنچے تو اس سے کھنچ جائیے جو ٹیڑھا ہو تو ٹیڑھا ہو جو سیدھا ہو تو سیدھا ہو
بھلائی چاہتا ہوں میں تو ہوتا ہے برا میرا براچاہوں اگر اپنا عجب کیا ہے کہ اچھا ہو
کسی صورت وہ قابو میں نہیں آتے نہیں آتے

(از جناب حفیظ جونپوری)

دُنیا مری نگاہ میں صحرائے یاس ہے — جس دن سے جی اُداس ہے عالم اُداس ہے

نالوں کو بھی کسیکی نزاکت کا پاس ہے — اے صبر المدد فقط اب تیری آس ہے

گھرے ہے مجھ کو نزع میں اک دُوسرا خیال — وہ جانتے ہیں موت سے اسکو ہراس ہے

شکوؤں کا یہ جواب ہے اچھا یونہی سہی — ہم کو قسم کا پاس نہ وعدے کا پاس ہے

چھایا ہے بزم میں مری افسردگی کا رنگ — کہتے ہیں لوگ آج کی صحبت اُداس ہے

دُنیا میں جس کے درد کی کوئی دوا نہ ہو — ایسے مریض کے لئے مرنا ہی راس ہے

کیونکر ہو ختم لذتِ بیداد کا بیاں — آخر مرے دہن میں زبانِ سپاس ہے

فرقت ہی اک سزا ہے محبت کے جُرم کی — انصاف چاہتا ہوں کہ تو حق شناس ہے

بڑھتا ہے اور آکے یہاں اختلاجِ قلب — کیونکر کہیں ہوا ترے کوچے کی راس ہے

اُس بزم میں ہزار اداؤں کا سامنا — لے دیکے ایک دل ہی یہاں اپنے پاس ہے

اک مشغلہ ہے ہجر میں آہوں کا کھینچنا — قسمت کو رو رہا ہوں اثر سے تو یاس ہے

آیا جو میں تو بیٹھو نہ مُنہ پھیر کر اُدھر — دیکھو اِدھر تمہیں سے مری التماس ہے

بس مختصر یہ ہے مری حسرت کی داستاں — جب تک یہ سانس ہے ترے ملنے کی آس ہے

اِس نظم کو حفیظ تغزل سے بحث کیا
تیرے کلام میں تو فقط درد و یاس ہے

(از میر ولایت علی صاحب فردوس)

چھوڑ کر تیرے آستانے کو — اب کہاں جاؤں سر جھکانے کو

زندگی تھی جو ہجر میں آتی — یوں تو آئے گی موت آنے کو

بیوفاؤں سے رُوٹھ کر پچھتائے — کوئی آتا نہیں منانے کو

شادیِ عہدِ جنوں از خویشتن گم می کند
خندۂ صبحِ عدم چاکِ گریباں است و بس

مائۂ دلبستگی آورد رنگِ بیدلی
غنچۂ دل چوں لباسِ گل پریشاں است و بس

دل کہ میدارد ازاں صد مایۂ ناز آرزو
باہجومِ آرزو آشفتہ داماں است و بس

بے خلشہا نیست سیرِ گلشنِ ایجادِ ما
چشم را نظارۂ ہر غنچہ پیکاں است و بس

نیست بعدِ مرگ ہم توفیقِ پروائے کسے
شعلۂ شمعِ مزارِ ما گل افشاں است و بس

بیخبر

(از جناب آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی)

نظر کے سامنے نیلا سا آسماں کیوں ہو
جو دل جلے نہ کسی کا تو یہ دھواں کیوں ہو؟

مجال ہی نہیں جھوٹی تری زباں کیوں ہو
نہیں جو منہ سے نکلنی ہوئی تو ہاں کیوں ہو؟

چلے بھی آؤ اکیلے ہی بدگماں کیوں ہو
جہاں خدا ہے وہاں غیر درمیاں کیوں ہو؟

یہ ہاتھ چاند سے رخسار پر ۔ یہ نیچی نظر
سنو تو ۔ ہائے میں قرباں سرگراں کیوں ہو؟

کوئی ٹھکانہ بناؤ تو دل ٹھکے اپنا
تم ایک جا نہیں رہتے جہاں تہاں کیوں ہو؟

ابھی کلی تھی ابھی پھول کھل کے مرجھایا!
ہمیشگی ہو تو یہ رنگِ بوستاں کیوں ہو؟

مزہ تو جب ہے مسیں بھیگتے ہی موت آجائے
جو نامراد رہیں ۔ کوئی پھر جواں کیوں ہو؟

شباب شیب کو بھی ساتھ لیکے چلتا ہے
نہیں تو اسکو غرض گردِ کارواں کیوں ہو؟

نہیں یہ ضد کہ پلک پر سے اشک گر جائیں
مجھے یہ دھیان کہ محنت یہ رائگاں کیوں ہو؟

ہماری خاک اُڑا کر صبا بھی ہے بے چین
جو بے خطا ہو تو ایسی رواں دواں کیوں ہو؟

وہ مہ جمال جنہیں فرشِ گل پسند آئے
لحد میں ان سے یہ پوچھے کہ تم یہاں کیوں ہو

یہ اُس کی شانِ کریمی کے سب شگوفے ہیں
نہیں تو باغ میں گل کیوں ہو گلستاں کیوں ہو؟

یہ سچ ہے ناظمِ ملکِ سخن ہوں میں شاعر
نہیں تو کچھ زبانوں پہ داستاں کیوں ہو؟

کرتے ہیں راہِ حق میں صدقے وہ جان اپنی — جن مومنوں کا دیں ہو ایمانِ عیدِ قرباں
عالم کے واسطے ہے یہ خیر کا زمانہ — ہے آشنائے عالم الیقانِ عیدِ قرباں
تڑکے سے جامِ دل میں ہے بادۂ بشارت — ہے انتہائے فرحت عنوانِ عیدِ قرباں
قربان راہِ حق میں مثلِ خلیل ہو کر — لازم ہے عارفوں کو عرفانِ عیدِ قرباں
اسلام کے چمن میں رنگِ بہار آیا — ہے گلشنِ شگفتہ بستانِ عیدِ قرباں
کعبے میں قبلہ رو ہیں حجاج صرفِ طاعت — ہے سر پہ زائروں کے احسانِ عیدِ قرباں
باہم مصافحوں میں گذری گی دوستوں کی — باہم گلے ملیں گے یارانِ عیدِ قرباں
ہے جیب میں جہاں کی نقدِ سرورِ شادی — پُر ہے دُرِ خوشی سے دامانِ عیدِ قرباں
مذبوح مثلِ حیواں ہر بدسگالِ بزدل — ہر نیک ہو شہیدِ پیکانِ عیدِ قرباں
قربانیاں نفاق و افلاس جہل کی ہوں — خونِ وفا سے تر ہو میدانِ عیدِ قرباں
ہو اتفاق علم و دولت سے استفادہ — ہوں قلب جاں نثارانِ شایانِ عیدِ قرباں

ہے آرزوئے طالب ہو بختِ ہند غالب
ہو جشن جم سے افزوں سامانِ عیدِ قرباں

طالب بنارسی (از بمبئی)

تازہ غزلیں

(از جناب توفیق)

اینقدر جوشِ ہوسہا جلوہ سامان است و بس — دل بہ بزمِ خواہش چوں آئینہ حیران است و بس
عالمِ بیخوابی شوقم میرس از من کہ چیست — اینقدر دانم کہ یک خواب پریشان است و بس
جز بحسرت سوختن در بزمِ دل چیزے نماند — داغِ ناکامی زیارتگاہِ ارمان است و بس

جب دہر میں تنگ آ گئے افکارِ جہاں سے
اور آئی رہائی کی نظر کوئی نہ صورت

ہر سمت سے ادبار نے اس طرح جو گھیرا
ناچار ہر اک شخص ہوا شاکیِ قسمت

پائی جو دلِ زار نے اس طرح سے تسکیں
اور فکر و تردد سے ہوئی ان کو فراغت

ہر بات میں ہر کام میں پھر سمجھا انہوں نے
ناکامیِ ہمت کو بھی ناکامیِ قسمت

افسوس رہے یہ تو مقدر ہی کو روتے
اور صاحبِ ہمت ہوئے سب صاحبِ قسمت

مانا کہ ہے تقدیر بھی عالم میں کوئی چیز
پر فتح مقدر کے لئے چاہئے ہمت

ہے قاف سے قسمت کے عیاں قوتِ بازو
اور سین سے ظاہر ہے سمجھ لینے کی طاقت

اور میم کا ایما ہے کہ محنت کئے جاؤ
تیار ہو ہر کام کو ہے تے کی اشارت

مفہوم کو قسمت کے مسلماں جو سمجھتے
ممکن نہ تھا ہوتے یہ گرفتارِ ہلاکت

وہ شاہدِ قسمت کے ہیں دیدار سے محروم
جو کارِ جہاں میں کبھی کرتے نہیں ہمت

عبدالعزیز شوق
(از دینانگر)

عیدِ قرباں

ماہِ مبیں نے کر کے اعلانِ عیدِ قرباں
فردِ فلک پہ لکھا فرمانِ عیدِ قرباں

شامِ شبِ جلالت احیانِ عیدِ قرباں
جامِ مے مسرت فیضانِ عیدِ قرباں

نکلا ہے چاند جب سے روشن ہیں سب کے چہرے
ہے دورۂ تجلی دورانِ عیدِ قرباں

ڈوبا ستارہ غم کا - مہرِ سحر چمکا
برجِ قمر بنا ہے ایوانِ عیدِ قرباں

ہر لمحہ عبادت ہے ساعتِ سعادت
ہر ساعتِ تجلی - ہر آن عیدِ قرباں

انداز عیش لائی - آنِ طرب سے آئی
قرباں اس ادا کے اے شانِ عیدِ قرباں

کبھی قسم کی عورتیں ہیں جہاں میں   نہ کیجے قیاس ایک کو دُوسری پر
بُرائی میں حیوانِ مطلق سے ادنیٰ   بھلائی میں اعلیٰ ملائک سے بہتر

یہی واقعی رائے حامد کی بھی ہے
نہیں اُنگلیاں ہوتیں پانچوں برابر

حامد حسن قادری

قسمت

اِک روز کسی دوست نے یہ شوق سے پُوچھا   کچھ آپ کو معلوم ہے تقدیر کی نسبت
قسمت کا جو سنتے ہیں مُسلمانوں میں جھگڑا   کیا آپ نے سمجھی ہے بھلا اسکی حقیقت
ہر قوم میں گو قائل تقدیر ہیں لیکن   کیا وجہ اہلِ مُسلماں ہیں بہت شاکی قسمت
ہر وقت ہی کیوں قوم میں تقدیر کا رونا   ہر فردِ بشر کیوں ہے گرفتارِ مصیبت
کیوں آتی ہیں ادبار کی کانوں میں صدائیں   کیوں قوم بنی جاتی ہے تصویرِ مذلت
سُنکر یہ کہا مَیں نے کہ اَے صاحبِ دانش   یہ بات تو ہے صاف نہیں غور کی حاجت
اِسلام ابھی خوابِ حکومت سے نہ جاگا   گو سر میں ابھی باقی تھا سودائے حکومت
اور بادۂ عشرت سے سبھی مست ہوئے تھے   اس حال میں جب آکے پڑی سر پہ مصیبت
جو ہاتھ کہ بیکار رہے کارِ جہاں سے   جو دل کہ رہے غرقِ خیالِ مئے عشرت
کس طرح سے بگڑے ہُوئے وہ کام بناتے   کب اُن سے تھا ہوسکتا علاجِ غمِ عُسرت
جس دم اُنہیں ناکامی نے ہر سمت سے گھیرا   باقی نہ رہی بازوئے ہمت میں بھی طاقت
جو خون کبھی گرم تھا اب سرد ہوا تھا   ادبار و مصیبت سے نہ تھی لڑنیکی عادت
کوشش جو کہ معراجِ ترقی کا ہے زینہ   تھی اسکی بھی صورت سے مسلمانوں کو نفرت

بہت بدنما پاؤں ہیں اس کے بیشک بڑے خوشنما گو ہیں طاؤس کے پر

بھلا جس کو سمجھے ہوئے ہے زمانہ بُرائی بھی ہے کچھ نہ کچھ اُس میں مضمر
بُرا جانتا ہے جسے سارا عالم بھلائی کے بھی اُس میں کچھ کچھ ہیں جوہر
نہ دُنیا میں ہر چیز بالکل بُری ہے نہ کہہ سکتے ہیں اس کو اچھا سراسر

غرض ہے یہی حال سارے جہاں کا یہی حال عورت کا ہے بندہ پرور
محاسن کا مخزن اگر اس کو کہیئے تو ہے یہ قبائح کا بھی ایک دفتر
اگر پھول ہے یہ تو کانٹا بھی ہے یہ یہ پتھر بھی ہے ۔ ہے اگر لعل و گوہر
پلائے گی گر جام کوثر ۔ تو یہ ہی پلاتی ہے زہر ہلاہل کا ساغر
اگر جان ہے آفتِ جاں بھی ہے یہ اگر آب ہے تو یہی شئے ہے اخگر
جو عورت سے آبادیٔ خانماں ہے تو عورت ہی ویراں بھی کر دیتی ہے گھر
برائی اگر اس کی مخفی نہیں ہے تو ظاہر بھلائی بھی ہے بلکہ اظہر
اگر آفتیں اس کی لائی ہوئی ہیں تو آتی ہے یہ راحتوں کو بھی لے کر
اگر سنگ مرمر ہے تو موم بھی ہے یہ دلدار بھی ہے اگر ہے یہ دلبر
اگر زخم ہے یہ تو مرہم بھی ہے یہ ہے آبِ بقا بھی جو ہے آبِ خنجر
جہاں پر ہے عورت کی نیکی بھی روشن جو معلوم ہیں سب کو تریا چرتر

جو فرمائی ہے آپ نے مدح اس کی یہ ایسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر
نظامیؔ نے جو کچھ مذمت بیاں کی بُرائی ہے اُس سے بھی ہے یہ فزوں تر

عورت

(خطاب بہ جناب منشی احمد حسین خانصاحب بی۔اے)

جو فرماتے ہیں آپ سچ ہے سراسر — نہیں اس میں گنجائش شبہ تل بھر
نظامی کا ارشاد بھی سب بجا ہے — صداقت میں ہیں دونوں رائیں برابر
بظاہر یہ رائیں مخالف ہیں لیکن — یہ تطبیق ہے ان کی اے بندہ پرور

جو دے رائے کوئی کسی شے کی نسبت — کرے غور اُس شے کے سب پہلوؤں پر
ہر اک شے میں ہیں حسن اور قبح دونوں — کہ بے عیب ہے ذاتِ خلاقِ اکبر
ہیں ہر ایک تصویر کے دو جدا رُخ — جو ہے ایک تاریک تو اک منوّر
ہم باغ عالم میں ہیں رنج و راحت — کہ ہے خار بھی ہمنشینِ گلِ تر
سمندر میں ہیں دُرِّ شاہوار جس جا — پڑے ہیں وہیں لاکھوں بیکار پتھر
جہاں ماہ میں اسقدر روشنی ہے — وہیں ایک دھبہ بھی ہے اُسکے اندر
اگر نفع پہنچاتی ہے جل کے آتش — تو کر دیتی ہے خاک بھی یہ جلا کر
جو دیتا ہے ہیرا بہت مال و دولت — تو ہے جان لینے میں بھی تیغ و خنجر
اگر زہر ہیں سنکھیا اور افیوں — تو اکثر دواؤں کی ہیں جزوِ اکبر
بہت فائدے اس سے ہوتے ہیں لیکن — ڈبوتا جہازوں کو بھی ہے سمندر
بڑے کام کی چیز ہے ریل لیکن — تصادم بھی ہوتا ہی رہتا ہے اکثر
نکلتے ہیں بجلی سے مقصد ہزاروں — گرہے قیامت کہیں گر پڑے گر
بہت اس سے جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں — شک اس میں نہیں کچھ کہ اچھی ہو موثر

مشاطۂ عروسِ سخن بالیقیں ہے یہ بزمِ صفاتِ نیک میں بالانشیں ہے یہ
دشمن سمجھئے اسکو خیالاتِ خام کا
ہر ہفت کہئے شاہدِ حسنِ کلام کا

ہے رونمائے صدق و صفا خوئے راستی ہے کہربائے عفو خطا خوئے راستی
ہے فضلِ حق کو بادنما خوئے راستی ہے موجبِ رضائے خدا خوئے راستی
کچھ دخل راستی میں نہیں تین پانچ کو
سچی ہے یہ مثل کہ نہیں آنچ سانچ کو

تقریر اسی سے دلکش و عالم پسند ہو تحریر میں اسی سے نفاست بلند ہو
دلچسپ اسی سے ہر سخن و وعظ و پند ہو شیریں اسی سے لفظِ بیاں مثلِ قند ہو
سُولی سے جو بشر کو اُتارے یہ خو ہے وُہ
جو گیسوئے کلام سنوارے یہ خو ہے وُہ

سچے جو ہیں سمجھتے ہیں سب انکو ذی شعور غیبت سے فتنہ سازی سے رہتے ہیں وہ نفور
اہلِ جہاں کی ہجو سے وُہ بھاگتے ہیں دُور لب پر وُہ آنے دیتے نہیں کلمۂ غرور
ممکن نہیں غلط جو ہو بات اسکی پیچ کریں
سچ کو نہ جھُوٹ جھوٹ کو ہرگز نہ سچ کریں

عزت جہاں میں پاتا ہی جھوٹا بشر کہاں قابلِ یقین کے ہوتی ہے جھوٹی خبر کہاں
صادق کا نور پاتی ہے کاذب سحر کہاں سچے کی قدر پاتا ہے جھوٹا گہر کہاں
بھایا جو کذب کشتِ صداقت اُجڑ گئی
پُرزا جو کوئی جھوٹا ہوا ۔ کل بگڑ گئی

دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی

چاند و تہنائے یہجان و مجزا بودہ

تھا لب سرورِ پہ وقتِ نزع لفظ "امتی" "قوم" تھا، کہتے ہیں سید کا بھی حرفِ آخری
گر نبی امت کی خاطر غرقِ اندیشہ رہے مارتے سید بھی بحرِ فکر میں غوطہ رہے
لالہ زارِ داغِ غم سرور کا گر سینہ رہا سینہ سید بھی دردو غم کا گنجینہ رہا
شمعِ امت کے سدا سرور جو پروانہ رہے شاہد امت کے سید بھی تو دیوانہ رہے

ایسے نانا کے لئے ایسا نواسا چاہئے
کان ایسی سے نکلنا ایسا ہیرا چاہئے

نام جو جو ہو گئے مثبوتِ لوحِ روزگار تا بقائے نسلِ آدم وہ رہینگے برقرار
امتدادِ وقت کے ہاتھوں سے مٹنے کے نہیں کاردِ ایام کے کاٹے سے کٹنے کے نہیں
ہے اسی زمرہ میں تیرا نام اے والاتبار! اے حیاتِ جاوداں کی مملکت کے تاجدار!

آج تو گلگشت کرتا خلد کے بستاں میں ہے
نام تیرا گونجتا ہر سمت ہندوستاں میں ہے

علامہ محمد عبد اللہ

راستی

ہے باغبانِ گلشنِ تقریر راستی آئینہ بیاں کی ہے تصویر راستی
صیقل ہے بہرِ خنجرِ توقیر راستی ہے کحلِ چشم چہرہ تحریر راستی

لازم ہے غازۂ رُخِ ایماں اسے کہوں
واجب ہے وجہِ عزتِ انساں اسے کہوں

ہادی و رہبر و خضرِ راہِ دیں ہے یہ آفت میں دستگیر الم میں معیں ہے یہ

لوٹنا، تپنا، تڑپنا کام انکے دل کا ہے
برقِ مضطر ایک ادنیٰ کام انکے دل کا ہے

انکے سینہ میں ہے آتشخانۂ آذر کی آگ
سینۂ سینا کی ہے یا مجمرِ خاور کی آگ

پردۂ گل کی طرح ان کا جگر صد چاک ہے
انکے طفلِ دل کے تن پر خون کی پوشاک ہے

دیدۂ نمناک انکا ہے ہمیشہ اشکبار
رات دن، شام و سحر، جوں ناگرا کی آبشار

یہ وہ مجنوں ہیں جو لیلیٰ کیلئے مرتے نہیں
سرد آہیں وصلِ لیلیٰ کے لئے بھرتے نہیں

یہ وہ مجنوں ہیں جو ہیں دیوانۂ لیلائے قوم
کاسۂ سر میں نہیں کچھ جنکے جز سودائے قوم

مرحبا! صد مرحبا!! اے سید عالیمقام!!!
ایک شخصیت پہ تیری تھی خود آسائی حرام

خشت تھی تعمیر تیری میں لگی ایثار کی
آشکارا شان تو نے جگ پہ کی ایثار کی

منزلِ دل تھی تری کاشانۂ سوز و گداز
دل نہیں وہ، دل نہیں جو خانۂ سوز و گداز

راہ پیمائے حرارت گاہِ الفت تو ہوا
از سرِ نو نکتہ آموزِ اخوت تو ہوا

بہرِ امت گھومتا پھرتا تھا جوں موجِ ہوا
جذبۂ بے اختیارِ شوق تھا رہبر ترا

تا دمِ آخر خدمت پر کمر بستہ رہا
قوم کے جینے کی خاطر عمر بھر مرتا رہا

سینہ کوبی میں رہا جب تک کہ دم میں دم رہا[سلہ]
تو رہا اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

قوم تھی خوابِ قیامت کی بغل میں سو رہی
چشمِ عبرت تھی سرِ بالیں اکیلی رو رہی

حیف! غربت میں خلف بیدار باش اسلاف کے
بے حس و بے حرکت و جنبش تھے غفلت میں پڑے

صورِ اسرافیل پھونکا تو نے یہ جب زور سے
چونک اٹھے مردے یکایک فرشِ خوابِ گور سے

قوم کو پھر جان تیری شورشِ قم سے ملی
زندگانی تیرے اعجازِ تکلم سے ملی

درحقِ ما مردگاں الحق مسیحا بودہ

سلہ مولانا حالی مدظلہ کے ایک مشہور شعر کا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے + طور

موسمِ گل کی قسم تجھ کو۔ عطا کر ایک جام / ایسی گھڑیاں ساقیا آتی نہیں ہیں بار بار
سالِ نو آیا۔ ہے لازم عہدِ نو ساغر سے ہو / پھر بندھے پیمان پیمانے سے ساقی ایک بار
چل رہا ہے دَورِ مے۔ بازارِ مے نوشی ہے گرم / لب پہ ساقی کے "بگیر" اور لب پہ رندوں کے "بیار"
تو ہے محوِ شغلِ مے مُسلم۔ تجھے معلوم کیا / (قطعہ) تیرے ہمجنسوں کے کیسے کٹتے ہیں لیل و نہار
گو بظاہر اُنکے بُشرے سے نہیں صدمہ عیاں / گو بظاہر اُنکے چہروں پر نہیں گرد و غبار
گو بظاہر اُنکی صورت پر نہیں غم کا نشاں / گو بظاہر اُنکی صورت سے نہیں رنج آشکار
اُنکے مطبخ دیکھ جا کر سرد ہیں اے بیخبر / بی بی اور بچوں کے کپڑے ہو رہے ہیں تار تار
اُن کی نظروں میں ہے یکساں۔ ہو محرم یا کہ عید / حسبِ معمول آج بھی ہیں ہیچ کس سے وہ بیقرار
اشکِ خوں اُنکی شراب اور لختِ دل اُنکا کباب / یُوں منالی عید۔ اور دل کا نکالا یُوں بُخار

زہر کے گھونٹ اپنی مے! قطعاً حرام اپنا کباب
ہم ہوں بدمستِ تعیش! قوم یُوں زار و نزار!

سرسیّد مرحوم

اہلِ عالم پر تری ہستی نے روشن کر دیا / مادۂ ایثار ہے ذاتِ بشر میں تا کجا
کس طرح دھرتے ہیں دلِ نازک پہ بارِ سنگِ غم / ہیں اُٹھاتے دوسروں کے واسطے اہلِ ہمم
اپنی راحت اپنی آسائش کو دیتے ہیں بُھلا / فکرمندی ہے یہی ہو جائے اوروں کا بھلا
جسکو عُرفِ عام میں آرام کہتے ہیں بشر / اُس سے بیگانہ ہیں یہ خدامِ نسلِ بو البشر
فرشِ خوابِ استراحت پر خدائی شب کو ہے / اُنکی پلکوں میں مگر کب نیند آئی شب کو ہے
کود جانا آگ میں اوروں کی اُنکا کام ہے / شاہدِ احوال چشمِ گردشِ ایام ہے

عید اور انتظار یار

آ تجھ بغیر دل کا دیا ہی بجھا ہوا — ظلمت سرا یہ گھر ہے سراپا بنا ہوا

یہ کیا غضب کہ مائل عجز و نیاز ہم — اور تو غرور و کبر کی جانب جھکا ہوا

درس حدیث عشق و محبت سے ہم کو کام — اور تو جفا جوئی کا صحیفہ پڑھا ہوا

بوئے وفا و رنگ محبت سے اجنبی! — کس خاک سے بتا! ترا بت ہی بنا ہوا

پھرتے ہیں لوگ عید کو مسرور و شادماں — ہر کنج فکر و یاس میں میں ہوں پڑا ہوا

سو عید مجھ کو جان جہاں! تیری دید ہے — آ چشم انتظار کا در ہے کھلا ہوا

میں تیری رہ میں شوق کی آنکھیں بچھاؤں گا

دل کے چبوترے پہ تجھے لا بٹھاؤں گا

[illegible]

عید قرباں

عید قرباں آئی یا آئی گلستاں میں بہار — کھل رہے ہیں دل کے غنچے! اور چہکتے ہیں ہزار

وقت ہی کیسا سہانا ہے! ہوا کیا خوشگوار — لہلہاتا ہی چمن - پھولوں پہ ہے کیسی نکھار

تن رہے ہیں گل چمن میں جیسے اکڑیں نوجواں! — عیدگہ میں زیب بر کرکے لباس رنگا رنگ

گرد کعبہ پھر رہے ہیں دیکھنا حجاج یوں — جیسے گلشن پر نسیم صبح ہو خوش خوش نثار

ساعت اچھی ہے - مہیا ہیں کل اسباب نشاط — ہاں تو بسم اللہ ساقی - اب یہ کیسا انتظار!

ہاں ادھر بھی اک نظر او ساقی غفلت شعار! — مطلع ایک میں بھی ہوں نگاہ لطف کا امیدوار

بچا جاتا ہے گولی وقت پر کیسا ہی اپنا ہو

وفا و مہر و اُلفت سب کہانی ہو فسانہ ہو
برائے نام اپنایت ہو۔ کہنے کو یگانہ ہو

ذرا دیکھو تو کچھ اس نفسی نفسی کا ٹھکانہ ہو
پڑی ہو اپنی اپنی سب کو۔ خود مطلب زمانہ ہو

اُمید دستگیری بے نتیجہ ہے خیالی ہے
کسی کا اس جہاں میں کوئی وارث ہو والی ہے

عید کا چاند

لو ماہِ نو نے مژدہ پھر عید کا سُنایا
پھر دن خوشی کا ہم کو اللہ نے دکھایا

کیسا سحر سے عالم پُر نور ہو رہا ہے
ہر شخص اس خوشی سے مسرور ہو رہا ہے

بچوں نے ہر گلی میں یہ شور ہے مچایا
پھر روزِ عید آیا پھر روزِ عید آیا

اُنکا لباسِ رنگیں ہر دل کو بھا رہا ہے
اُن پیاری صورتوں کی رونق بڑھا رہا ہے

کیسی خوشی خوشی سے بازار جا رہے ہیں
بچپن کی شوخیوں سے اودھم مچا رہے ہیں

کچھ دام جیب میں ہیں ہم عمر ساتھ میں ہیں
باتیں ہیں پیاری پیاری اور ہاتھ ہاتھ میں ہیں

پابندیاں نہیں کچھ آزاد ہو رہے ہیں
گلیوں میں دوڑتے ہیں اور شاد ہو رہے ہیں

پیر و جواں سبھی تو خوشیاں منا رہے ہیں
کپڑے نئے بدل کر مسجد کو جا رہے ہیں

سجدہ میں اُس کے آگے سر کو جھکا دیا ہے
اور شکر اُس خدا کا دل سے ادا کیا ہے

جس نے کرم سے اپنے یہ دن ہمیں دکھایا
سب کو خوشی عطا کی سب کو گلے ملایا

پھر اے شررؔ تمہیں بھی یہ عید ہو مُبارک
اُس ماہوش کی تم کو پھر دید ہو مُبارک

نہ اب وہ شمس ہیں، منصور و عیسیٰ و سلیماں ہیں
دھری ہی رہ گئی حکمت فلاطوں ہیں نہ لقماں ہیں

حقیقت میں جگہ دنیا نہیں ہے دل لگانے کی — وفا کرتی نہیں یہ بیوفا سارے زمانے کی
نہیں ٹلتی مقرر ہے جو ساعت موت آنے کی — جگہ اس میں نہیں دم مارنے کی لب ہلانے کی
نہیں خوفِ خزاں کب تک بہارِ زندگانی ہیں
کہاں تک شمعِ ہستی کی جلے گی بزمِ فانی میں

سمجھ سکتا ہے کون اسکو۔ فنا کیا ہے بقا کیا ہے — کریں رد و قدح اس پر ہمارا حوصلہ کیا ہے
نہیں کچھ اختیار اپنا تو پھر چون و چرا کیا ہے — ہمیں اس بات سے کیا بحث ہے یہ ہے برا کیا ہے
گلِ تر ہیں۔ نہ بلبل ہیں۔ نہ گلچیں ہیں گلستاں کے
فقط ہم تو تماشائی ہیں اس بازارِ امکاں کے

کھلی راہِ عدم ہے۔ ایک آتا۔ ایک جاتا ہے — کہیں ہے نغمۂ شادی کہیں کہرام مچتا ہے
نیا ہر روز اس دارِ فنا کا رنگ ہوتا ہے — دورنگی اس کو کہتے ہیں اسی کا نام دنیا ہے
زمیں گردش میں ہے۔ یا گنبدِ گردوں کا چکر ہے
نیا جس وقت دیکھو سامنے آنکھوں کے منظر ہے

نہ فرزند ہیں اپنے۔ نہ بھائی اپنا بھائی ہے — جو سچ پوچھو تو یہ جھنڈے تلے کی آشنائی ہے
یہ جیتے جی کی الفت ہے محبت ہے صفائی ہے — پسِ مُردن کسی کی دوستی کب کام آئی ہے
پرائی گور میں پیر اپنے پھیلاتا نہیں کوئی
کسی کے ساتھ اس سنسار سے جاتا نہیں کوئی

غلط ہے دعویٰ الفت سراسر عاشقی جھوٹی — ثبوتِ یک دلی جھوٹا۔ دلیلِ دوستی جھوٹی
عزیزوں کی ہے تقریرِ خلوصِ باطنی جھوٹی — غرض جھوٹی ہے دنیا اور جھوٹی بھی بڑی جھوٹی
بھروسا اپنے دم کا ہی نہیں ہے غیر کا کیا ہو

دارِ فانی

سفر درپیش ہے غافل تجھے اس دارِ فانی سے — لگا دل کو نہ دنیا سے نہ عیش و کامرانی سے
چلیگا کام کب تک زور سے۔ زر سے۔ جوانی سے — کنارہ ایک دن کرنا پڑے گا زندگانی سے

سرائے دہر میں مہماں فقط تو رات بھر کا ہے
کمر باندھے ہوئے تیار رہ عالم سفر کا ہے

یہ مانا ہم نے تجھ کو عیش دنیا کا میسر ہے — فراغِ دل ہے۔ ترقی سامنے ہے۔ بخت یاور ہے
شرابِ بیخودی شوق سے لبریز ساغر ہے — نہ شرم آنکھوں میں دنیا کی نہ دل میں خوفِ محشر ہے

مگر واضح رہے۔ یہ تیری بربادی کے ساماں ہیں
نظر آتے ہیں جو جلوے تجھے خوابِ پریشاں ہیں

چلیگا بزم میں جامِ شرابِ مشکبو کب تک — رہینگے زینتِ محفل بتانِ شعلہ رُو کب تک
بڑھیگی دولتِ دنیائے دل کی آرزو کب تک — یہ تیری کرّ و فر کب تک رہیگی اور تو کب تک

کفن بر دوش صیادِ اجل پھرتا ہے گلشن میں
نہ شاخِ گل پہ چہکیگا نہ چھوڑیگا نشیمن میں

کہاں ہیں وہ کہ جنکی ربعِ مسکوں پر حکومت تھی — کہاں ہیں وہ خدائی کا جنہیں دعویٰ تھا نخوت تھی
کہاں ہیں وہ کہ جنکے پاس لاتعداد دولت تھی — کہاں ہیں وہ زیادہ آہرمن سے جنمیں طاقت تھی

کہاں نمرود ہے۔ شداد ہے۔ فرعون خودسر ہے
کہاں سہراب ہے رستم ہے۔ دارا و سکندر ہے

کہاں ہیں قُم باذنی کہکے جو مُردے جِلاتے تھے — کہاں ہیں جو مریضِ جاں بلب کا دم بچاتے تھے
ہوئے کیا وہ جو کہتے تھے منہ سے کر دکھاتے تھے — ہیں مٹی میں حسرت کی سب منہ جو مرنے سے چھپاتے تھے

جھونپڑی سے ہند میں نکلی جو دکھیا کی صدا — وہ دلِ پُر درد ونڈسر میں پریشاں ہوگیا
ہائے تیرے غم سے اے شیرازہ بندِ صلحِ کل — ناگہاں مجموعۂ ہستی پریشاں ہوگیا

اِس نگاہِ لطف سے بزمِ جہاں پُر نور تھی
بند کیں آنکھیں تو دُنیا اک شبِ دیجور تھی

ہے غمِ ایڈورڈ اعظم میں دلِ محزوں فگار — ہائے یہ کیا ہوگیا اے گردشِ لیل و نہار
جو قدومِ شاہ نے بخشا تھا جموں کو شرف — خطۂ کشمیر کو بھی تھا اُسی کا انتظار
آج تیرے ہجر میں بریاں ہوا مثلِ کباب — کر چکی تھی وہ نگاہِ ناز جس دل کو شکار
ہائے وہ صورت تری تشبیہِ حسنِ روی دوست — ہائے وہ سیرت تری تفسیرِ لطفِ کردگار
مادرِ اہلِ جہاں اے ملکۂ الکسندرہ — خالقِ کون و مکاں بخشے ترے دل کو قرار
جل گیا برقِ فنا سے خرمنِ عیش و سرور — آگئی بن کر خزاں گلشن میں تیرے نوبہار
تیرے بارِ غم کو ہم اک ذرہ گر کم کر سکیں — مال و زر جان و جگر کر دیں ترے سر پر نثار
شاہِ والا باغِ رضواں میں نہ ہوں پژمردہ دل — ملکۂ گیتی نہ کر ہجراں میں آہِ شعلہ بار
دیکھتا ہے غم کو تیرے جامع المتفرقین — دیدۂ جاناں کیلئے ہے وعدۂ یوم اللقا
زندۂ جاوید ہے وہ صلح آموزِ امم — شاہ کا ماتم نہ کر اے بانوئے فرخ تبار
صورت و سیرت پدر کی ہے پسر میں جلوہ گر — ہے جبینِ جارج سے سب سرّ ایڈورڈ آشکار
ہے غمِ شاہِ جواں ہمت سے دل کو بیکلی — جس نے کھویا راہبر سرور پدر اور یارِ غار
تختِ شاہی کی طرف ہے کھینچتا آفاق کو — جذبِ مقناطیس سے یہ دودۂ فرخ تبار
اے شہنشاہِ بلند اختر محبت میں تری — دست و بازو جان و دل لیکر ہیں حاضر جاں نثار

کوکبِ دولت کی تیرے جگ میں آب و تاب ہو
قاف سے تا قاف عالم میں ترا پرتاب ہو

مرثیۂ شہنشاہ

آنجہانی قیصرِ ہند اڈورڈ ہفتم کے انتقال پر ہمارے دیرینہ کرمفرما جناب چوہدری خوشی محمد صاحب بی۔ اے المتخلص ناظرؔ گورنر ریاستِ کشمیر نے حضور مہاراجہ صاحب بہادر والیٔ جموں و کشمیر کے خاص فرمان سے یہ پُردرد مرثیہ لکھا ہے جس میں انگریزی طرزِ مرثیہ گوئی کا تتبع کیا گیا ہے۔ چوہدری صاحب بسبب اپنے عالیشان عُہدہ کے اہم فرائض کے اب شعر و سخن سے بہت کم سروکار رکھتے ہیں۔ انکے کلام کے مشتاق مدت کے بعد اُن کی نظم کو دیکھکر ضرور مطمئن ہونگے۔

ہائے یہ کیا سانحہ اے چرخِ گرداں ہوگیا — جس سے نیلی پوش شرق و غرب یکساں ہوگیا
تھی رُخِ روشن سے جسکے باغِ عالم کی بہار — آج وہ شمعِ منیرِ بزمِ رضواں ہوگیا
آفتابِ سلطنت جس کا نہیں ہوتا غروب — آج وُہ خورشیدِ عالمتاب پنہاں ہوگیا
یعنی شہ اڈورڈ ہفتم قیصرِ ہندوستاں — اِس تماشاگاہِ عالم سے خراماں ہوگیا
وُہ لحد پر ملکۂ عالم کی پُرحسرت نگاہ — آخری نظارۂ دیدارِ جاناں ہوگیا
کہدیا اہلِ عزٰی نے بر سرِ بالینِ گور — جد و جہدِ زندگی کا آج پایاں ہوگیا
جب سوارِ دوش نکلا وُہ شہِ یوسف جمال — دیدۂ یعقوب قصر و کاخ و ایوان ہوگیا
خوبیوں میں بے بدل محبوبوں میں بے نظیر — شاہِ خوباں ہوگیا محبوبِ دوراں ہوگیا
کشت زارِ سلطنت کی آبیاری کے لئے — ہوگیا گاہے صبا اور گاہ نیساں ہوگیا
پڑگئی محفل میں جس پر وُہ نگاہِ دلنواز — خویش و بیگانہ غلامِ شاہِ دوراں ہوگیا
کالے گورے پیلے بھورے اسکے تھے حلقہ بگوش — اُس کی یکرنگی کا سب رنگوں پہ احساں ہوگیا
مندروں سے اسکی الفت مسجدوں سے اسکا پیار — گاہ ہندو بنگیا گاہے مسلماں ہوگیا

نصیبِ غیر ہے کمخوابِ راحت و آرام — ہمارا حصّہ ہے اک غم سودہ شبِ حصیر
کہاں ہیں آیتِ لَا تَقْنَطُوْا کی اُمیدیں — جگائے آج اُنہیں تو ہی نارِ سبگیر
مرے خیال میں القصّہ خوش نصیب تھے آپ — کہ اس جہاں میں ہے جنکے صاحبِ توقیر
وُہ خوش نصیب تھے ہشتاد سال تک جی کر — دیارِ شہرت و حرمت کو کر لیا تسخیر
مَیں اس حیات کی ناکامیاں بھلا دونگا — ملے جو آپ کی شہرت سے مجھ کو عشرِ عشیر
تمہاری طبعِ رسا کو مثال دوں کس سے — بجا ہے گر کہوں پارس اگر کہوں اکسیر
روا ہے گر کہوں اس کو مَیں چشمۂ خورشید — ضیائے مہر سے جسکے خجل ہو بدرِ منیر
تمہاری طبعِ رسا کان تھی جواہر کی — کہ جس کے ہیرے ہیں دنیا میں اپنی آپ نظیر
بجا ہے اسکو کہوں تو نہالِ فضل و کمال — کہ جس کے پتّوں پہ قرباں ہو خطّۂ کشمیر
تمہاری طبعِ رسا جوئے آبِ زمزم تھی — کہ جس کے آب مصفّا میں ہے حلاوتِ شیر
مؤرّخ آپ تھے اور بے بدل مہندس بھی — سمجھتا مَیں تو تبرّک ہوں آپ کی تحریر
سُنا دو مژدہ یہ تم ساکنانِ جنّت کو — لقب تمہارا ہے روشن ضمیر داتا پیر

تمہارے باغ کا جب تک بہار اُردو ہے
نہیں مجال کہ دستِ خزاں ہو دامنگیر

مولوی ذکاء اللہ مرحوم

(از منشی احمد حسین خاں صاحب بی۔ اے

ایف۔ آر۔ اے۔ ایس)

چراغ بزم ذکا مولوی ذکاء اللہ ہماری آنکھوں میں پھرتی ہے آپکی تصویر
مبارک آپ کو گلگشت جنت فردوس مبارک آپ کو کوثر کی دائمی جاگیر
مبارک آپ کو ہو کشور عدم کا سفر کہ ہم رکاب ہے شہرت تو پیش رو توقیر
تمہاری موت پہ صدقے کروں حیات خضر کہ سوگوار ہے عالم جہاں ہے دلگیر
جئے تو مردم چشم وقار کی صورت مرے تو چھوڑ گئے یادگار عالمگیر
جئے ہزار برس کوئی پھر بھی مرنا ہے مٹے نہیں کبھی ممکن نوشتۂ تقدیر
مرے خیال میں وہ رشک صد سکندر ہے جسے جہاں میں میسر ہو دولت توقیر
وگرنہ پوچھئے مجھ سے کہ زندگی کیا ہے؟ گلے میں طوق ہے پاؤں میں صدمنی زنجیر
مرے خیال میں یہ خار دار جھاڑی ہے کہ جس کا خار ہے ہر یک بجائے خود اک تیر
گلیم بخت کسی سے نہ ہو سکی اجلی ہزار ماتھے بھی رگڑے کروڑ کی تدبیر
ذرا سا چیر کے دیکھے کوئی مرا سینہ دکھائی دینگے بجائے جگر ہزاروں تیر
میں وہ مریض ہوں جسکی ہیں نارسا آہیں میں وہ اسیر ہوں نالے ہیں جسکے بے تاثیر
کمند یاس سے تار نفس خدا کی قسم میں اس کے دام میں ہوں مثل بے زبان نخچیر
ہمیشہ زچتی رہتی ہے بال و پر میرے کہ ہے ارادہ پرواز بھی بڑی تقصیر

حکمت ۔ علم ۔ عمل کے معنے و تعریفات بیان کرنے کے بعد انسان کے حرکات طبعی و وضعی ۔ ملکہ و عادت عقل عملی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد قوائے نفسانی یعنی نفس ناطقہ و قوائے غضبی و شہوی کی حقیقت اور امراض نفسانی کی کیفیت مفصل بیان کر کے بتایا ہے کہ سعادت تامہ کیا چیز ہے ۔

مقالہ دوئم میں تدبیر منزل کا بیان ہے اور اس میں منزل کے مختلف ممبروں مثلاً والدین اولاد زن و شوہر کے فرائض اور حقوق پر عالمانہ بحث کی ہے ۔ اور ایسی تدابیر بیان کی ہیں جو حسن معاشرت کے لئے اعلیٰ درجہ کی سبق آموز ہیں ۔

تیسرے مقالہ میں سیاست مدن کی تعریف انسان کو تمدن کی ضرورت سلطنت و قانون و عدالت کی حقیقت ۔ غلامی اور آزادی کی حالت مفصل بیان کی ہے اور اس کے بعد معاملات رسم و رواج کا فلسفہ بیان کیا ہے اور ایسے مضامین درج ہیں جو قوم و ملک کی سچی محبت پیدا کرتے اور قومی عزت کے حصول کے ذرائع بتاتے ہیں ۔ اس لئے اس کا مطالعہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے مرد و عورت پر واجب ہے ۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کا ذکر جا بجا آیا ہے اور کتاب دونوں فرقوں کے لئے یکساں مفید ہے ۔

مجھے قوی امید ہے کہ یہ عمدہ تصنیف ملک میں عام قبولیت کا درجہ حاصل کریگی ۔ اور میری دلی آرزو ہے کہ میرے ہموطن اس سے فائدہ اٹھائیں ۔

الطاف حسین حالی

نوٹ ۔ یہ کتاب ذیل کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے ۔ ضخامت ۲۵۰ صفحہ قیمت تین روپے (سہ) مع محصولڈاک

مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی ۔ بازار عیسیٰ میاں حیدرآباد دکن

حکمتِ عملی

ریویو از جناب شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

یہ مفید اور قابلِ قدر کتاب میرے عزیز اور لائق دوست مولوی محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی نے علمِ اخلاق پر لکھ کر کچھ عرصہ ہوا شائع کی ہے۔ لائق مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے اُردو زبان کی ایک ایسی ضرورت پوری کی ہے جو بہت مدت سے ملک میں محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ گذشتہ تیس برس کے زمانہ میں بہت سے رسالے اور کتابیں اس فن میں لکھی اور شائع کی گئی ہیں لیکن جہاں تک مجھکو معلوم ہے اُن میں سے ایک بھی ہماری ضرورت رفع کرنے والی نہ تھی۔ ہم کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اس فن میں جو کتاب لکھی جائے اس کی زبان فصیح اور نہایت صاف ہو۔ جو مطالبِ علمیہ اُس میں بیان کئے جائیں وہ علمِ اخلاق کی مقررہ اصطلاحات کے دائرہ سے خارج نہ ہوں۔ اور کتاب فلسفۂ قدیم وجدید دونوں کے ضروری مسائل پر مشتمل ہو۔ جہانتک میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے یہ سب خصوصیتیں اس میں بوجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے زبان اور بیان کی صفائی۔ اصطلاحات علمی کی تلاش اور فلسفۂ قدیم وجدید کے مطالعہ اور اُن میں امہات مسائل کے انتخاب کرنے میں کوئی دقیقہ سعی و کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا۔ اس کتاب میں وہ تمام مسائل بیان کئے گئے ہیں جو انسان کی ذات میں جوہرِ شرافت پیدا کرنے والے ہیں اور جن سے سعادتِ تامہ حاصل ہوتی ہے۔

اس کتاب کے تین مقالہ ہیں پہلے مقالہ میں تہذیبِ اخلاق کا بیان ہے اور

دُوسرے سال میکس میولر پیرس چلا گیا - وہاں ایک ہندو دوست اسے ملا جس کے ساتھ وُہ انگریزی اور بنگالی بولنے کی مشق کیا کرتا تھا اور وہیں اس نے بنگالی زبان کی ایک گرامر فرانسیسی میں لکھی مگر اس کو چھپوا نہ سکا - ان دنوں میں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تھوڑی سی فارسی بھی سیکھی مگر اُسے بڑھا نہیں سکا - پیرس میں وُہ اپنا گذارہ سنسکرت کے قلمی نسخے نقل کر کے کرتا تھا اور اوقاتِ فرصت میں رگ وید کا مطالعہ جاری رکھتا تھا - اس کو اس قدر سخت محنت کرنی پڑتی تھی کہ ایک رات وُہ شب بھر جاگتا تھا اور دُوسری رات صرف دو گھنٹے سوتا تھا اور وُہ بھی اس طرح کہ کپڑے اتارے بغیر بستر پر لیٹ جاتا تھا اور تیسری رات بالکل آرام کرتا تھا اور پھر یہی سلسلہ از سرِ نو شروع کر دیتا تھا - غذا کی کمی کام کی زیادتی صحت پر مضر اثر ڈالے بغیر نہ رہی - مگر ہمت پر آفرین ہے کہ کمزوری یا فاقے میکس مولر کے عزم و استقلال میں فرق نہ ڈال سکے اپنی کامیابی کے زمانہ میں اس وقت کی جد و جہد کا ذکر ایک خط میں میکس مولر اس طرح کرتا ہے :-

"جسمانی طور پر تو بیشک اس زمانہ میں مجھے بہت نقصان پہنچا ہوگا - مگر مجھے اس کا افسوس نہیں ہے - کیونکہ اس سخت جد و جہد کے بغیر کامیابی کیسے نصیب ہوتی"

(باقی دارد)

مسز عبد القادر

طبیعت نے یہ تقاضا کیا کہ کوئی ایسی چیز سیکھے جو اس کے دوستوں اور ہم مکتبوں کو نہ آتی ہو۔ سنہ۱۸۴۳ء میں جب اس کی عمر ابھی بیس برس سے بھی کم تھی میکس میولر نے ڈاکٹر آف فیلالوجی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کے پاس اتنی وسعت نہ تھی کہ وُہ ڈگری کے دِن کے لئے لباس بنواتا۔ اس لئے اسے مانگ کر کام چلانا پڑا۔ اس زمانہ میں پرنس ولیم نے جس کی شادی میکس میولر کی والدہ کی ایک رشتہ دار سے ہوئی تھی یہ چاہا کہ اُسے آسٹریا کے محکمۂ سفارت میں کوئی جگہ دلادے مگر میکس میولر غریبی کے باوجود اپنے اصُولوں کا اس قدر پابند تھا کہ اس نے اس ملازمت سے انکار کردیا اور یہ لکھا کہ یہ تجویز چونکہ میری آزادی میں خلل ڈالیگی۔ مجھے شوق مطالعہ جاری رکھنے کا موقع نہ دیگی اور جو منزل مقصود مَیں نے اپنی زندگی کے لئے اپنے ذہن میں ٹھہرائی ہے اس سے پرے لیجائیگی۔ اس واسطے مَیں معافی چاہتا ہوں۔

سنہ۱۸۴۴ء میں میکس میولر ایک سال کے واسطے برلن گیا اور وہاں سنسکرت اور فلسفہ پڑھتا رہا اور وہاں کے کُتب خانہ میں سنسکرت کے قلمی نسخے دیکھتا رہا جو شاہ پرشیا انگلستان سے خرید کر لائے تھے۔ تعجب ہے کہ اس سال میں میکس میولر کا گذارا کس طرح ہوتا رہا۔ صرف چھ پونڈ اُسے وظیفہ ملتا تھا جو بمشکل ضروریاتِ زندگی کے لئے مکتفی تھا۔ خوش قسمتی سے اسے بعض دوست ایسے مل گئے جو اسے کبھی کبھی دعوتیں کھلاتے تھے ان دعوتوں کا ذکر اپنی ماں کو لکھتے ہوئے میکس ایک خط میں لکھتا ہے کہ "گھر پر تو مَیں صرف روٹی اور مکھن کھاتا ہوں اور قہوہ بغیر دودھ اور شکر کے پیتا ہوں" ایک اور خط میں یہ لکھتا ہے "آج کھانا نہیں میسر آیا اور کام رات کے تین بجے تک کرتا رہا"۔ اِن تمام تکالیف میں اس کا یہ عقیدہ اس کو سہارا دیتا تھا کہ خدا ئے دانا و بینا کے حکم سے سب کام ہو رہے ہیں اور اس کے خطوں میں اکثر یہ الفاظ ملتے ہیں کہ وُہ ہو جو خدا کی مرضی ہو۔

کے وقت سے لیکر تمام عُمر جب تک اُس کی ماں زندہ رہی میکس اسے محبت بھرے خط لکھتا رہا - اپنی تعلیم کی بابت مفصل حالات اپنی پیاری ماں کو لکھتا تھا اور اکثر ان کتابوں کی بابت جو اس کے مطالع میں آتیں - ماں سے مشورہ لیا کرتا تھا -
ان ابتدائی خطوط میں سے ایک خط میں اپنا روزمرہ کا پروگرام یُوں بیان کرتا ہے -
"میں صبح پانچ بجے یا کبھی اس سے بھی پہلے اُٹھتا ہوں - اور سات بجے تک کام کرتا ہوں - پھر مدرسے جاتا ہوں - وہاں سے آکر گیارہ بجے وایولین بجاتا ہوں اور بارہ بجے پیانو - اس کے بعد کھاتا ہوں اور دوبارہ سکول جاتا ہوں وہاں سے آکر قہوہ پیتا ہوں اور جمناسٹک کی ورزش کے لئے جاتا ہوں - اس کے بعد شام تک پھر کام کرتا ہوں - شام کو تازہ ہوا کھانے باہر نکلتا ہوں - کیونکہ آج کل گرمی میں سورج ڈوبنے سے پہلے ٹھنڈی ہوا نہیں ملتی - مَیں صبح پانچ بجے سے دوپہر کے ایک بجے تک صرف ایک روٹی پر گذارہ کرتا ہوں اور سویرے چائے یا قہوہ نہیں پیتا - اسی لئے بعض اوقات میں ضُعف محسُوس کرتا ہوں" -
یہ باقاعدگی اور استقلال عمر بھر اس کا شیوہ رہا -
جب لائپزگ کے سکول سے نکلنے کا وقت قریب آیا تو میکس اس سے مہینوں پہلے اس پریشانی میں رہتا تھا کہ آئندہ اُسے کیا کام کرنا چاہیئے - وُہ یہ خوب جانتا تھا کہ یونیورسٹی میں جاکر اُسے کوئی ایسا علم سیکھنا چاہیئے جس سے وُہ یونیورسٹی کا نصاب ختم کرتے ہی روزی کمانے لگ جائے - کبھی سوچتا تھا کہ فیلالوجی یعنی علم اللسان میں نام پیدا کرے اور یونیورسٹی میں ہی روزگار حاصل کرے - کبھی ڈرتا تھا کہ اگر امتیاز پیدا نہ ہوسکا تو اس نصاب کی تعلیم سے روزگار کی اُمید نہیں ہوسکتی - آخر توکل پر اُس نے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی سنسکرت پڑھنی شروع کر دی - زیادہ تر اس خیال سے کہ اس کی جدت پسند

میکس میولر

ہندوستان میں سنسکرت کے مشہور علاّمہ میکس میولر کے نام سے ہر تعلیم یافتہ واقف ہے۔ اور رگ وید کا ترجمہ جس سے اس جرمنی کے فاضل نے علمی دُنیا میں نام پیدا کیا۔ یہاں بھی ایسا ہی مُستند سمجھا جاتا ہے جیسا یورپ میں۔ اس لئے ہر علم دوست شخص کو علاّمہ موصوف کے حالات زندگی سے دلچسپی ہوگی اور امید ہے کہ ذیل کے حالات شوق سے پڑھے جاوینگے۔

فرڈرک میکس میولر ۶ر دسمبر سنہ ۱۸۲۳ء کو بمقام ڈیسو واقع صوبہ پرشیہ مُلک جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کے بچپن ہی میں مرگیا۔ اور اس کی ماں اپنے دو چھوٹے بچوں کو لیکر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو بیچارے میکس کی عمر صرف چار برس کی تھی اور اس بے وقت کی یتیمی نے اس کی ابتدائی زندگی کو بہت غمناک بنا دیا۔ مگر قدرت نے اسے طبیعت ایسی عطا کی تھی کہ حالات کی مخالفت اس پر کم اثر کرتی تھی اس لئے وُہ بچپن میں بظاہر خوش اور چلبلا نظر آتا تھا۔ چھ برس کا ہوا تو وُہ مدرسہ میں داخل ہوا اور بارہ برس کی عمر تک وہیں ڈیسو کے مدرسہ میں پڑھتا رہا۔ اندنوں اسکی زندگی بڑی سختی کی زندگی تھی۔ اس کے کپڑے غیر کافی ہوتے تھے اور اسے غذا قلیل ملتی تھی۔ مصیبت پر مصیبت یہ پڑی کہ تیرہ برس کی عمر میں دادا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کی ہمت تھی کہ اس حالت میں بھی بیٹے کو ہونہار دیکھ کر اس کی تعلیم کو جاری رکھا۔ اور سنہ ۱۸۳۶ء میں اسے تعلیم پانے کے لئے لائپزگ بھیجدیا۔ جہاں وُہ پانچ برس رہا اس عرصہ میں اس نے لاطینی زبان میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ وہ آسانی سے لاطینی بول سکتا تھا۔ اس سے پہلے سفر

یہ الوداعی حسرت ناک سین حسن کے خرمن صبر کے ساتھ بھی برق بلا کا کام کر جاتا لیکن عاشقانہ ضبط و استقلال سے کام لیا۔ اور فی امان اللہ" کہکر رخصت کیا، دل میں جذبات کا دریا اُمڈا، مگر ؎

دمِ رخصت زباں تو کھل نہ سکی
دل کی باتیں ہوئیں نگاہوں میں

اس وقت حسن کی حالت بھی جو تھی وہ تھی، لیکن اُس نے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ اور اس طریقہ سے اپنے پہلو میں پاک و محبت کیش دل رکھنے والے عاشق و معشوق کی یکجائی کی وہ گھڑیاں تمام ہوئیں +

جواد علیخاں عالی (از دکن)

گلستان کا عربی ترجمہ

گلستان سعدی تعریف سے مستغنی ہے۔ اور ہر شخص اسکی خوبیوں کا معترف ہے۔ اسکا ترجمہ عربی میں ۱۲۵۸ ہجری میں مصر میں شائع ہوا تھا۔ اور یہ ترجمہ ایک مستند فاضل جبرئیل آفندی بن یوسف مخلع رومی نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس عربی عبارت میں ہے صاحب مترجم نے اسکا نام جلستان رکھا تھا۔ گویا لفظ گلستان کی تعریب ہے۔ مگر اہل مصر ج کو تلفظ میں گاف یعنی کاف فارسی کیطرح ہی ادا کرتے ہیں۔ پس یہ کہنا پڑیگا کہ صاحب مترجم نے اصلی نام کو بحال رکھا تھا۔ اب اس ترجمہ عربی کو جناب مولوی محمد عبد العلی صاحب آسی مدراسی نے عربی زبان کے سیکھنے والوں کے فائدے کے لئے مع لفظی ترجمہ اُردو شائع کیا ہے۔ اور بڑی تقطیع پر کتاب جلستان مع اردو ترجمہ موسوم بہ سنبلستان چھپی ہے۔ مولوی صاحب موصوف سے دفتر البیان لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ **قیمت** دو روپیہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے اس عربی ترجمہ کو چھاپ کر ہندوستان کے عربی دانوں پر احسان کیا ہے اور اُردو ترجمہ نے اس کتاب کو اور بھی کارآمد بنا دیا ہے۔ مگر ہم انہیں یہ مشورہ دینگے کہ جب کتاب کے دوبارہ طبع ہونے کی نوبت آئے تو موجودہ تقطیع کی بجائے کوئی اور موزون تر تقطیع پسند فرمائیں +

وحرص کا شکار رہنے میں عذر نہیں۔ لیکن یہ سب تدابیر ہیں نے اُس وقت تک کے لئے کرلی تھیں جب تک مجھے تمہارے مشورہ سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ ملے۔ اب میرے بارہ میں جو تمہاری رائے ہو اس کی پابندی کے لئے مَیں ہمہ تن تیار ہوں۔

حسن۔ افسوس میری ایک اہم ذمہ داری نے ابھی مجھے اس قابل نہیں رکھا ہے کہ میں تم کو خاطرخواہ مشورہ جو بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ تم اس ظالم پنجہ سے نکلکر امن و آسائش کی دُنیا میں چلی آؤ۔ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ جہاں میں جا رہا ہوں۔ وُہ آجکل ایک ایسا پُرآشوب مقام بنگیا ہے۔ کہ تمہارا جانا وہاں کسی طرح مصلحت نہیں۔

سمیہ۔ پھر ایسے مقام پر تم خود کیوں جا رہے ہو۔ سُنتی ہوں کہ حرم کعبہ کا بھی دشمنوں نے محاصرہ کر لیا ہے۔ مکّہ والے عجیب مصیبت میں گرفتار ہیں ایسے سفر سے تو حتی الامکان احتیاط ہی چاہیئے۔

حسن۔ کچھ ایسی ہی مجبوری آپڑی ہے جس سے مَیں فسخ عزیمت نہیں کرسکتا تم میری واپسی تک اپنے موجُودہ طرزِ عمل پر قائم رہو۔

اِتنے میں اُس نے اُونٹ کی آواز سُنی۔ جو یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر اس کا ملازم لئے انتظار میں کھڑا تھا۔ سمجھگیا۔ وقت زیادہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اُس نے سمیّہ کیطرف مخاطب ہو کر کہا۔

حسن۔ گو دل نہیں گوارا کرتا کہ اس مسرّت بخش ملاقات کو ختم کروں لیکن ابھی ضروریات نے جن پر نخلِ اُمید کی آئندہ سرسبزی منحصر ہے۔ پابہ زنجیر کر دیا ہے لہٰذا پیاری سمیّہ! اب اجازت کا طلبگار ہُوں۔

سمیّہ۔ مَیں اپنی زبان سے جانے کا لفظ تو نہیں کہہ سکتی۔ ہائے میرا اضطراب تو مجھے اب اَور بھی مار ڈالیگا۔ اِتنا کہا، اور زار و قطار رونے لگی۔

ہی میرے اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔

حسن (بات کاٹ کر) تمہارا منشا میں پا گیا۔ نہ ورتم اپنے والد سے مجھ پر خوف کھاتی ہو۔

سمیّہ اس جملہ پر دل ہی دل میں سخت پشیمان ہوئی۔ اور دیر تک گم سم کھڑی رہی دیر تک انتظار کے بعد حسن کے اس جملہ نے طلسم خاموشی توڑا۔

حسن۔ میں تو کہہ چکا کہ ایسی مخالفتوں کا مجھ پر خاک اثر نہیں پڑ سکتا۔ جب تک تمہاری نظر مجھ سے سیدھی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ساری دنیا میرے موافق ہے۔ کیا؟ تم اپنی محبت کا مجھے قول دے سکتی ہو"۔

سمیّہ کی طرف سے اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ تو اس خاموشی کو عین ایجاب سمجھکر حسن نے کہا۔

حسن۔ جب ہم دونوں کا عہدِ الفت مضبوط ہو چکا تو کسی کے ظالمانہ ارادے اُسے توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ بتا دو کہ تمہارے والد آخر میرے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ میرا کوئی قصور!

سمیّہ۔ قصور یہی کیا کم ہے کہ تم نے ان کے ساتھ احسان کیا ہے، لیکن میں کہتی ہوں کہ اب آیندہ اُن کی چرب زبانی پر نہ جانا،

حسن۔ مجھے ڈر ہے کہ میری طرفداری کی، جس سے تمہیں کوئی صدمہ اُنکے ہاتھ سے نہ پہنچے۔

سمیّہ۔ نہیں۔ تم خاطر جمع رکھو۔ میں نے مصلحت کے خیال سے اپنی طرز سے انہیں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ میں اپنے عشق و محبت کے ارادوں سے باز آگئی۔ اور میرے جذباتِ محبت کو فرزندانہ اطاعت کے جوش نے مغلوب کر دیا۔ اور ان کے حسبِ خواہش مجھے اُن کے ارادہ ہائے طمع و

حسن۔ جب تم دشمن ہو جاؤ۔ تو مجھے خود ہی زندگی وبال ہو جائیگی۔ اور اس وقت جو میری جان لیگا اُسے میں اپنا سب سے بڑا محسن اور رفیق سمجھونگا۔ لیکن میں نہ مانوں گا۔ جو تمہارے دل میں ہے صاف صاف کہہ ڈالو جسے میرا دشمن سمجھتی ہو، اُس کا نام اگر بتلادو تو تم کو دکھا دُوں، کہ کیونکر اس کا قصہ پاک کرتا ہوں۔

حسن کے چہرہ کی معمولی متانت میں اس گفتگو سے فرق آگیا تھا۔ اس نے پھر یہ الفاظ کہے۔

حسن۔ میری پیاری! کیا تم مجھے اُس شخص کا نام بتلا سکتی ہو۔

سمیہ۔ (جسے اب جوشش گریہ سے یارائے ضبط نہ رہا تھا، اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی) میں نہیں چاہتی، کہ اسے میں خاک و خون میں غلطاں دیکھوں۔

وُہ اس وقت عجیب کشمکش میں تھی، باپ کا نام لینے پر عاشق کے میل خاطر آجانے کا خیال مجبور کرتا تھا، لیکن حمیت وغیرت بار بار زبان پکڑ لیتی تھی۔ حسن دشمن کا نام بتلانے میں سمیہ کی طرف سے اتنا تأمل دیکھکر حیرت زدہ ہو رہا تھا، کہ اس میں کیا راز ہے،

حسن۔ اب زیادہ انتظار نہ کراؤ! کیا میرے اصرار کا نہیں بالکل خیال نہیں۔ مدینہ سے نکلے ہُوئے مجھے بہت عرصہ ہو گیا۔ اور میرا ایک دوست یہیں قریب میرا انتظار کرتا ہوگا۔

سمیہ۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اُس کا نام لوں، میرا فرض ہے کہ میں اُسکی طرف سے عذر خواہی بھی کر لوں۔ گو میں جانتی ہوں کہ یہ عذر خواہی مجھے ذمہ واریوں کی عام اخلاقی گرفت سے سبکدوش نہ کر سکیگی۔ لیکن مجھ اسیر دام محبت کو وُہ بات جو تمہارے خلاف ہو۔ بھلا کس طرح گوارا ہو سکتی ہے۔ جبکہ ایک تمہاری رضامندی

"کچھ تو کہو، آخر یہ حیرانی و پریشانی کس بات کی ہے، کیا تمہیں میرے مکہ"
"کے سفر سے کچھ اندیشہ ہے"؟

اس فقرہ کا ختم ہونا تھا کہ سمیہ اپنی دلی کاوشوں کو نہ روک سکی، اور جو دلخراش خیال اس کے جگر میں چٹکیاں لیتا تھا، اُس میں واقعیت کی جھلک پاکر اُس کا دل قابو سے باہر ہوگیا۔ غم کی گھٹا دل پر چھا گئی اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن فرطِ بکا سے یارائے سخن نہ تھا، دیر کے بعد تھرتھراتی ہوئی آواز سے غمناک لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کے اُس نے یہ الفاظ ادا کئے۔

سمیہ۔ "بے شک مجھے ہر وقت تمہاری جان کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ نہ صرف اس تمہارے سفر سے، بلکہ:۔

ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر اُس کا دل بھر آیا، اور محبت بھری آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔ سمیہ پر تاثیر کا یہ رنگ دیکھ کر حسن کا دل بھی بیقرار ہو گیا۔ بے ساختہ اُس نے سمیہ کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیلیا۔ چونکہ حسن کو یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُس نے نازک اندام سمیہ کی نرم نرم انگلیوں کو مس کیا تھا، اِس لئے اُس کی رُوح میں ایک عجیب مقناطیسی احساس ہوا۔ اس غیر معمولی تاثیر سے سنبھلکر کہنے لگا:۔

حسن۔ کیا کہتے کہتے رُک گئیں۔ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ بلا تکلف کہو۔ کیا خاکِ مدینہ میں بھی کوئی میرا دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ مگر تم کچھ خیال نہ کرو۔ مجھے کسی کی دشمنی کی مطلق پروا نہیں، جب تک کہ تم مجھے چاہتی ہو، تمہارا اقرارِ محبت اور اس بات کا جان بخش اطمینان کہ تم میرے سوا کسی کو نہیں چاہتیں، میری زندگی میں ہزار نعمتوں کی ایک نعمت ہے، اور اُس کی قوت پر میں تمام دنیا کی مخالفت کی تاب لا سکتا ہوں۔

سمیہ (دیگر آواز میں) اور جب میں ہی تمہاری دشمن ہو جاؤں؟ ...

"تجھے ان خام خیالیوں سے باز آنا چاہیئے۔ میں نے بار با تجھے"
"سمجھایا لیکن تو کسی طرح راہ پر نہیں آتی۔ لے! اب سُن۔ آج سے"
"تجھے میری خاص نگرانی میں رہنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے"
"جس کے بعد تو کبھی حسن کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیگی"۔

چونکہ حسن کو قرینہ میں معتبر ذرائع سے اس کی محبت کی وجہ سے سمیّہ پر اسکی والد کی طرف سے سخت گیری کی خبر مل چکی تھی، اس لئے یہ دل دوز خیال اس مبارک گھڑی میں بھی آموجود ہوا۔

اس خیال کے آتے ہی حسن نے پھر آتنا کہا:-

حسن۔ "میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا مبارک موقع بھی دنیا میں آج تک کسی کو"
"نصیب ہوا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا یہ خیال بھی اس موقع"
"پر رشک کرتا تھا۔ متواتر کوششوں کے بعد ناکامی کا خیال اس کا"
"حوصلہ پست کر دیتا تھا، لہٰذا اس کی مسرت جو کچھ میرے دل میں"
"ہے اُس کے اظہار سے زبان قاصر ہے لیکن اس کے ساتھ یہ"
"کھٹک بھی دل میں پیدا ہو گئی ہے کہ اس ملاقات کا کوئی بُرا اثر"
"میری جان سے زیادہ عزیز دلربا پر نہ پڑے"۔

سمیّہ نے اس آخری جملہ کو حیرت سے سُنا، کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس ارادہ سے سمیّہ حسن کو مطلع کرنے آئی ہے۔ اُس سے نہیں تو اس معاملہ کے کسی نہ کسی پہلو سے حسن ضرور واقف ہے، اب سمیّہ سے مارے شرم کے کچھ جواب دیتے نہ بنتی تھی، کیونکہ وہ کسی بیر کا ارادہ نہ تھا، بلکہ اس کے والد کا، وہ مُبت بنی کھڑی تھی، حسن سے اس کا انداز خموشی نہ دیکھا گیا۔ اس نے کہا:-

کہ جس اولوالعزمی کے صلہ میں سمیّہ نے دربارِ محبت سے تمغہ کا استحقاق قائم کیا ہے، اُس سے اس کے صنمخانۂ دل میں حسن کی تصویرِ عشق کی گلکاریوں سے نہایت دلفریب نظر آرہی ہے جس کے دیکھنے کو چشمِ وجدان درکار ہے۔ عشاق کی اس رُوحانی مسرّت کا کہ اُن کا منظورِ نظر بھی ان کے عشق کی تہمینی ولذّت اپنے دل میں رکھتا ہے ۔ کوئی چیز مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ اور جب یہ کانٹا بھی نکلجاتا ہے کہ اُن کی خلوتِ محبّت کی تاک جھانک سے رقیب کی چشمِ بدبین بھی قاصر ہے، توامیدوں کا سبز باغ آنکھوں کے سامنے لہلہانے لگتا ہے۔ گلہائے آرزو کی خوشبودار چادر اُن کے بسترِ عیش پر بچھ جاتی ہے ۔ ذوق وشوق پیر پھیلاتا ہے، اور کاشانۂ دل نئے اور خوشنما سازوسامان سے معمور کیا جاتا ہے ۔

ہمارا عربی نژاد حسن اسوقت انہیں جذبات کے اثر سے باغ باغ ہورہا ہے ۔ جس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ؎

اضطرابِ دلِ بُلبل کوئی دیکھے اُسوقت
کِھل کے جب بُوئے محبت گُلِ تر دیتا ہے

لیکن حسن کے خیالات میں کسی فوری انقلاب کے اثر سے اُس کے چہرے کی تازگی اور انبساطی کیفیت میں گونہ فرق آگیا ۔ جو کامیابی کی سُرخی ابھی ابھی چہرہ پر جھلک رہی تھی وُہ جاتی رہی اور ظاہر حال کسی منقبض خیال کے پیدا ہوجانے کا پتہ دینے لگا ۔ وُہ خیال یہ تھا کہ :۔

جب گلشنِ امید کی گلگشت میں وہ مصروف تھا ۔ دفعتہً ایک طرف سے سمیّہ کے والد (عرفجہ) کی خیالی تصویر نظر آئی ۔ جو سمیّہ کو اس کے عزائمِ الفت پر تہدیدی تیور دکھا کر بولی :۔

اور اب اس مقناطیسی طریق تعارف کے بعد وُہ دونوں پُر ارمان، اور دل از دست دادہ عاشق و معشوق آمنے سامنے آگئے۔

حسن (حیرت سے) کیا فی الحقیقت میں اپنی دلربا اور پری پیکر سمیّہ کو ان آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، یا مزید برآں حیرت خیز خواب کا نظارہ میرے پیش نظر ہے۔ اگر ماہ طلعت سمیہ واقعی اس ظلمتکدہ دل کو منور کرنے آئی ہے، تو کیا پوچھ سکتا ہوں۔ کہ وُہ کیا چیز تھی، جس نے میری حور شمائل محبوبہ کو اس تشنہ کام محبت تک پہنچایا۔ اگر میں اُسے اپنی بیداری بخت کہوں تو دل نہیں قبول کرتا، اب تک کبھی میں ایسا خوش قسمت تو نہ تھا۔ نہیں! نہیں! یہ جذب اُلفت کا معجزہ ہے۔ جو میرے نزدیک اب عین الیقین کا درجہ رکھتا ہے۔ میری تمام عمر میں یہ وہ مبارک گھڑی ہے، جس کی قدر و قیمت کو عیش جاوداں بھی نہیں پہنچ سکتی۔"

حسن یہ کہہ رہا تھا۔ اور سمیہ (جو شجاعت اور فریفتگی کے انداز سے) ایک خرمے کے درخت کے تنہ سے ٹیک لگائے دم بخود کھڑی تھی۔ اور باوجود اس کے کہ رات کی گھٹا ٹوپ اندھیری عالم پر محیط تھی۔ عفت کوش سمیّہ کا رُخ زیبا اب بھی نقاب سے چھپا ہوا تھا، ہوا کا دست گستاخ اگر نقاب کے ساتھ کچھ اٹھکھیلیاں کرتا ہوا دکھائی دیتا تو بڑی پھرتی سے ہاتھ کے اشارہ سے وُہ اس گستاخی سے روک دیا جاتا۔

حسن دل ہی دل میں اسوقت اس خیال سے نہال ہوا جاتا تھا کہ اسکی معشوقہ کے دل میں اس کی طرف سے بڑی جگہ ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے سمیہ سے تنہائی میں ملاقات کی کوشش کی تھی، لیکن اس کی کوشش لاحاصل رہی تھی، بخلاف اس کے آج سمیہ نے باوجود سخت جکڑبندیوں کے بھی نخل آرزو سے ملاقات سرسبز کر دکھایا تھا۔

سمیّہ کیا بحیثیت اپنے عادات و اخلاق کے اور کیا بحیثیت حُسن و جمال کے زینتِ خواتینِ مدینہ کہلاتی ہے۔ اور ہم نے بھی اُس کے ہر انداز میں جو بات پائی وُہ یہ تھی کہ اس کے تمام حرکات و سکنات تہذیب متانت اور دانشمندانہ بھولپن کے کانٹے میں تلے ہُوئے معلوم ہُوتے تھے، تصنّع اور تکلّف تو اسے نام کو چھو نہیں گیا ہے۔

حُسن صورت کے متعلق یہ کہنا کافی ہو کہ دستِ قدرت نے اپنی کمال صنّاعی سے ایک بُت تراش کر، اُس میں جان ڈالی تھی۔

اس کا مذاق بھی صُورت کی طرح بولتا ہوا تھا۔ مدینہ بھر میں وُہ بزم مشاعرہ بے رنگ مانی جاتی تھی جس میں سمیّہ سی خوش فہم داد و تحسین سے گرمیٔ کلام، اور شعرا کا حوصلہ بڑھانے کے لئے رونق افزائے بزم نہ ہو۔

الغرض سمیّہ کو چونکہ حسن کی روانگی کی اطلاع باب المدینہ کے راستہ سے ہوکر ملی تھی، اس لئے وُہ باب المدینہ پر پہنچ کر نشیبی جانب ٹھہر گئی اور انتظار کے مزے لوٹنے لگی۔ حسن جُوں ہی باب المدینہ سے نکلا، شاہراہ کے نشیبی درختوں سے کسی آدمی کے نکلنے کی آہٹ معلوم ہُوئی۔ اور کچھ آواز کی بھنک بھی کان میں پڑی، حسن اس آہٹ سے ٹھٹک گیا۔ لیکن آواز پر کان لگائے رہا۔ درختوں سے جو چیز نکل رہی تھی وُہ برابر بڑھتی رہی اور راستہ سے قریب ہوکر اس کی زبان سے ایک آواز نکلی، جس سے حسن کو ایک آرزومندانہ تحریک ہُوئی۔ اور بجائے اپنے وجود کو چھپانے کے اس نے جلد تر اپنے کو اس نو وارد انسان تک پہنچایا، اور اس کے پہلے لفظ کا جواب جو غالباً اس کا نام تھا اور اُسے متنبہ کرنے کے لئے ادا کیا گیا تھا۔ آگاہی کی شان سے استعجاب کے لہجہ میں جس لفظ سے دیا گیا وُہ سمیّہ کا پیارا نام تھا،

باندھ چکی ہے، جسکی استواری میں وہ دل سے کوشاں ہے۔ لیکن اس کا باپ اس کے خلاف ہے' اور اس قدر خلاف ہے، کہ حسن پر کسی ظالمانہ حملہ کی تاک میں ہے' اور موقعہ پاکر وہ اس وقت حسن کو اُن ارادوں سے آگاہ کرنے اور تدابیر حفظ ماتقدم کرنے کا مشورہ دینے کو گھر سے نکلی ہے۔

ایک کنواری نازنین کا بے محابا ایک غیر شخص سے ملاقات کرنے کے لئے جانا، موجودہ نیز قدیم الایام کے معیار تہذیب میں شرافت پر دھبہ لگانے والی بات ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین ستیہ کی اخلاقی غرض و غایت سے لاعلم نہیں' نیز اس کے سچے جوش' اور عرفانی جذبات میں پاک نفسی' اور صفائی باطنی کا جو رنگ ہے، وہ اس کے ان پچھلے الفاظ میں جھلکتا ہے۔

یاالٰہی ماھذالحبُّ ؟..... اِذاکنتَ
ترٰی اَنْ اَخْطِی فی مَا اقول
فانزع..... حُبّ ھٰذا الشّاب من
قلبی..... لا..... لاتنزعه...
او انزعه یاالٰہی..... اوکماتشآءُ
'اه .....لااریٰ ھذا کلہٗ الّا
ھمّا یزید نی تعلقًّا وھیانًا..
اللّٰه ..... ھوالذی اراد ان
نحب احدنا الاخریٰ..... والحبّ
الّذی یکون خالیًا من الدنس
وغایته شریفةٌ اِنّما ھومِن
عنداللّٰهِ +

خداوندا! محبت کیا شے ہے؟ اگر میرے لبیں کوئی بات
ہے تو ٹھنڈے دل سے میں یہ کہتی ہوں کہ حسن کی محبت
مجھ سے چھین لے۔ نہیں۔ نہ چھین یا چھین لے۔
جیسے تو چاہے تیری مصلحت میں مصلحت ہے۔ اسکی محبت نے
مجھے دیوانہ کر رکھا ہے' حقیقت تو یہ ہے،
کہ اس محبت کا دلوں میں ڈالنے والا تو ہی ہے'
ہماری محبت کو تو چاہتا ہے' محبت بھی وہ
محبت جو رکیک حالات سے پاک ہے'
اس کا منشار خالص، اور وہ خدا
پاک کی عطا کردہ ہے +

"مانا کہ والد کے ..... کہنے کا میں پاس ..... کروں، اور اُلفت ..... سے"
"باز آؤں۔ لیکن ایک بے گناہ پر ..... جو بیجا حملہ کا .. .. ارادہ ... کیا"
گیا ہے، ..... اگر میں اُس کی ..... روک نہ بن سکوں ..... تو کم از کم ....."
"اُس کی اِطّلاع تو اُسے ..... ضرور کر دوں"۔
" ادائے حق والدین کے یہ معنی ... نہیں کہ خلافِ انصاف .... امورِ عامہ"
"امور میں بھی اُنکی خاطر سے ..... دریغ کیا جائے، اور پھر یہ تو ایسے"
"شخص کے مقابلہ میں ہے، جو اِس عمومی حیثیت سے کہیں بلند پایہ"
"اور تیری .... امکانی امداد کا سچا مستحق ہے - اور جبکہ اس کی کوئی خطا"
"بجز اس کے نہیں، کہ وہ ہمارا سچا محسن ہے، اور اسی استحقاق سے"
"وہ اپنا حق میری نسبت جتلاتا ہے - جس کے شکریہ کا احسان اور ایفا"
"وعدہ یہ کیا جا رہا ہے - معاذ اللہ"۔ میرے والد کے خیالات سراسر"
"ظالمانہ ہیں، اور اللہ پاک کو ظلم ناپسند ہے پس مجھے بھی ناپسند"
"ہی کرنا چاہیئے"۔

اِتنا کہکر وہ سرو قد کھڑی ہو گئی - شام کا وقت گذر کر تاریکی کا پردہ پڑ چکا تھا، اور اس کی حسبِ مرضی وقت آ چکا تھا، لہٰذا جو لباس اُس کے نرم و نازک جسم پر تھا، وُہ معمولی اوتار چڑھاؤ سے - بدن پر اس طرح سیج دیا گیا جو تیز رفتاری میں ذرا بھی ہارج نہ ہو سکے، پھر نُورانی چہرہ ایک خوبصورت نقاب سے چھپایا گیا، اور ان سب تیاریوں کے بعد حُور وش سمیّہ ایک محرم راز کنیز کے ساتھ بابُ المدینہ کی سمت روانہ ہو گئی -

سمیّہ کے متعلّق جہانتک ہمیں خود اس کے اضطراری خیالات نے دریافت حال کا موقعہ دیا وُہ یہ ہے کہ سمیّہ اور پاکباز سمیّہ کسی شخص مسمّی حسن سے عہدِ اُلفت

تیری آنکھوں سے بجائے مشتاقِ تماشا شوخ، اور للچائے ہوئے تارِ نظر کے اشکوں کی جھڑی جاری ہے۔ لیکن کیا دنیا کے گوہر آفرین سمندروں نے آجتک جتنے آبدار موتی پیدا کئے، انکی قیمت ان اشکوں کی لڑی کے ایک دانہ کو بھی پہنچتی ہے؟

اگر آج تیرے زخمِ دل سے یہ خارِ غم نکلجائے، تیرے پہلو سے یہ میٹھا درد جاتا رہے، اور تیری صدفِ چشم ان گوہر اشک کا رُون بند کرے، تو زندگی بے مزہ، خیال تاریک، اور تو جسم بےجان ہوکر رہ جائے۔ حق تو یہ ہے، کہ جس کے دل میں داغِ الفت نہیں، وُہ لطفِ زندگی سے بے بہرہ ہے، اور اس کی زندگی زندگی نہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد

تو جب تک اس لطف سے آگاہ نہ تھی، نہ تھی، اب آگاہ ہوکر بے اس کے چین نہیں پاسکتی، تیری وُہ گھڑیاں کس بےچینی و اضطراب سے گذرتی ہیں، جب ذکرِ حبیب سے تیرا مرکزِ خیال ہٹ جاتا ہے۔ یہ اسی رُوحانی نسبت کا کرشمہ ہے، واہ کیا پیارا اور دلکش نام ہے، (حسن) جو لذت و شیرینی اس نام میں ہے وُہ کسی دوسرے لفظ میں ہیں، نام لیتے ہی زبان میں ایک احساس پیدا ہوا جو جسم میں رُوح بنکر دوڑ گیا۔ فرطِ شوق میں کسی خیال کے آجانے سے دامنِ صبر ہاتھ سے جاتا رہا، اشک آنکھوں سے جاری ہی تھے، ایک آہِ سرد دلِ دردمند سے نکلتے ہی، جسم پر سکون طاری ہوگیا، اور خیالات کا سیلاب بھی کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔

دفعتہً کسی سخت خیال نے گویا اسے ہوشیار کیا، نیم باز آنکھیں کھولیں، اور اُسے اُکھڑے ہُوئے الفاظ میں (جو نیم ہوشیاری کی وجہ سے تھے) ہم نے یہ کہتے سُنا:-

معشوقۂ عرب

مندرجہ ذیل مضمون ایک عربی ناول کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ ہمارے کرم جناب جواد علی خاں عالی نے یہ باب نموتۃً بھیجکر یہ لکھا ہے کہ اگر ناظرین اس کو دلچسپ پائینگے۔ تو اور باب بھی جو ترجمہ ہو گئے ہیں پیش کئے جائینگے ہم سمجھتے ہیں کہ انہیں عربی عبارت کو اُردو لباس پہنانے میں بہت کامیابی ہوئی ہے اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کے اور حصے بھی عنایت کرینگے۔

سمیّہ !!! (دل میں) یہ خانہ خراب محبّت ہم تینوں کی (یعنی اس کی خود، اُس کے باپ اور اس کے عاشق حسن) کی عذاب جان نکلی۔ اگر عشق کی راہ اختیار کرتی ہوں تو والد کے احکام سے سرتابی کرنی پڑتی ہے۔ دُنیا کی نگاہ میں بد لحاظ ٹھہرتی ہوں، اور والدین کے جو حقوق سعادتمند اولاد پر ہیں اُن کے رُو سے ملزم قرار پاتی ہوں۔ اگر ان خیالات سے درگذر کرتی ہوں تو بھی نہیں بنتی، ذرا سے تغافل میں ایک قیمتی جان کے لالے پڑجائینگے۔ محبت والوں میں ہمیشہ پن کے ہلکے لفظ سے یاد کیجاؤں گی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھ سے ایسا ہوگا کیسے؟

محبّت کو عذابِ جاں میں کہنے کو تو کہہ گئی۔ لیکن اَے دل! تو ہی اِنصاف سے کہدے کہ دُنیا میں یہ لذّت تو نے کسی اَور بات میں پائی؟ جب سے اُلفت آشنا ہوا دُنیا کی کسی اَور بھی بُری بھلی شے کی تو نے تمنّا کی، اس میں شک نہیں کہ اس میں مبتلا ہونے سے تیری تمام زندہ دلی، تیری ظاہری خوش مذاقی، کی جگہ غم و الم، حسرت و تمنّا نے لے لی، لیکن اُس دلاویز غم پر کیا تو اپنی تمام خوشیاں دل سے نثار کرنے کو تیار نہیں،

پیدا ہوگیا۔

جب اس کے کئی سالوں کے بعد بالفرڈ گرے جیکب ایسٹرڈین کا وارث ہوا۔ تو وُہ بہت دفعہ اپنی والدہ کے لفظوں کو دُہرایا کرتا تھا۔ جو اس نے اسے بستر مرگ پر کہے تھے۔ کہ "بیٹا راستباز رہو۔ اس کی پروانہ کرو کہ تمہیں کس قدر تکلیف اُٹھانی پڑے۔ کبھی سوائے راستبازی کے اور کسی چیز کے حریص نہ بنو" اور وُہ خوش تھا۔ کہ شکر ہے۔ مَیں ویسا ہی نکلا +

(ترجمہ از انگریزی)

کاشتِ انگور

نواب عزیز جنگ بہادر کی طبع تنوع پسندی کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ ایک طرف آصف اللغات جیسی خالص علمی خدمت میں مصروف ہیں تو دُوسری طرف فن زراعت میں معقول دخل رکھتے ہیں اور اس میں بھی صاحبِ تصنیف و تالیف ہیں۔ انکی دو کتابیں زراعت و باغبانی کے متعلق اسوقت ہمارے سامنے ہیں۔ ایک فلاحۃ النخل یعنی کھجور کی کاشت پر ہے۔ اور دُوسری کاشتِ انگور پر ہے۔ موخر الذکر میں درخت انگور کے جغرافی حالات۔ خصوصیات۔ اقسام۔ طریقہ کاشت۔ امراض اور انکے علاج کے طریقے بیان ہُوئے ہیں۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ ساڑھے چار سو صفحہ کی ضخیم کتاب بنگئی ہے۔ اس طرح کھجور کی کاشت میں درخت خرما کا تاریخی و جغرافی احوال۔ اس کی خصوصیات۔ کیمیائی تحقیق۔ طریقہ کاشت امراض و علاج سب درج ہیں۔ یہ کتاب کوئی پونے تین سو صفحہ کی ہے۔ محکمہ زراعت آگرہ و اودھ نے اس کتاب کو نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک بڑی خوبی ان دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ عربی کُتب سے بھی انکی تالیف میں مدد لی گئی ہے اور انگریزی کتب سے بھی۔ اور اس اعتبار سے یہ اردو زبان میں بہت ہی مفید اور مغتنم مجموعہ معلومات ہیں کتابیں مجلد ہیں اور قیمت حسب ذیل ہے۔ کاشت انگور قیمت ۲ محصولڈاک ۸ کھجور کی کاشت قیمت ۲ محصولڈاک ۴

پتہ:۔ عزیز باغ۔ سُلطان پورہ۔ حیدر آباد دکن۔

ایسٹرڈین ۔ "اچھا تو پھر مجھے دیدو"۔ لڑکا چُپ چاپ میز کی طرف بڑھا اور شیشی لاکر بڈھے کے ہاتھ میں دیدی ۔ بُڈھے نے شیشی اپنی جیب میں ڈال لی ۔ اور کہا کہ تم اپنی ٹوپی لو ۔ اور میرے ساتھ چلو ۔

لڑکے نے کہا کہ مَیں آپ کے ساتھ آؤں تو لیکن مَیں نہیں سمجھتا ....

بُڈھے نے بات کاٹ کر کہا "تم ہر ایک بات کو تھوڑی دیر میں سمجھ لوگے ۔ اسوقت تم صرف میرے ساتھ چلے چلو ۔ اگرچہ بڈھے آدمی کا لہجہ مجبور کرنیوالا تھا مگر پھر بھی ہالفرڈ نے اس کے برخلاف کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وُہ کوئی اور سوال کرے اس کا سر چکرایا ۔ اور وُہ فرش پر گر پڑا ۔

کروڑپتی جلدی سے اس کی طرف پھرا ۔ اور جُھک کر اس کا کالر بٹن کھولتے ہُوئے بڑبڑایا "بھوک سے مر رہا ہے ۔ اور نوکری سے انکار کرتا ہے ۔ کیوں صرف اس لئے کہ وہ اس کو راستبازی نہیں سمجھتا ۔ ہاں ہاں مَیں یقین کرتا ہوں کہ آخر کار مَیں نے ٹھیک آدمی حاصل کرلیا ۔ قبل اس کے کہ لڑکا ہوش میں آنے کے آثار ظاہر کرے ۔ ایسٹرڈین فوراً اُٹھا اور اپنے منتظر شافر (موٹر چلانیوالا) کو حکم دینے کے لیے باہر نکل گیا ۔

اس کے پانچ منٹ کے بعد ہالفرڈ گرے کی بیہوش مورت پارک لین میں جبکہ ایسٹرڈین کے گھر کی طرف لیجائی جا رہی تھی ۔

اس واقعہ کو ایک ماہ کا عرصہ گذر گیا ہے ۔ اور آج وکیلوں کی مشہور کمیٹی ایک لاوارث کروڑپتی کی (جو کہ وسٹ انڈیز کے بہت بڑے حصّے کا مالک تھا) وصیت کو مرتب کرنے کے لئے بیٹھی ۔ تو ایک کاغذ کے پیش ہوتے ہی جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ۔ کہ "ہالفرڈ گرے کون ہالفرڈ گرے صرف دیانتدار جسکو میں جانتا ہوں ۔ میرا متبنّٰی ہے" ۔ ایک عجیب شور سا

فوراً دروازہ اندر سے کھلا۔ جونہی لڑکے کی نظر بڈھے ایسٹرڈین پر پڑی۔ لڑکے نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا پہلے وُہ بڑبڑایا۔ پھر ٹوٹے پھوٹے چند الفاظ کہے لڑکا "آپ مجھے ملنا چاہتے تھے"۔ ایسٹرڈین نے سر ہلایا۔ اور کہا کہ ہاں مَیں نے تمہارے گھر کا پتہ لگا لیا۔ سچ یہ ہے کہ۔ مَیں تمہیں پسند کرتا ہُوں۔ اور تمہارے ساتھ اس مُلازمت کے متعلق پھر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ صرف تم ہی ایک ایسے ہو۔ کہ جس کو میں نے دیکھا اور نوکری کے لئے پسند کیا۔

لڑکے نے مختصرًا کہا۔ کہ "جناب عالی! میں بھُوکا مر جاؤنگا۔ لیکن اپنی ماں سے کبھی وعدہ خلافی نہیں کرونگا"۔

بڈھے نے کہا کہ دس پونڈ ماہوار کی طرف بھی تو دیکھو۔

لڑکا"لیکن بے عزتی کے۔ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں"۔

ایسٹرڈین کی آنکھیں لڑکے سے اُٹھ کر اس کے غریبانہ مگر آراستہ کمرے کی طرف پھریں۔ اور سب کمرہ کا چکّر لگا کر ایک چھوٹی میز پر جس کے اوپر ایک چھوٹی سی نیلے رنگ کی شیشی سُرخ نشان والی پڑی ہوئی تھی۔ جا ٹھہری۔ اس نے گھبرا کر لڑکے کی طرف دیکھا جس کی حالت بہت ہی مایوسانہ ہو چکی تھی۔

لڑکے کے چہرے پر ایک رنگ دَوڑا۔ اور اس نے کہا کہ ہاں لیکن میں خیال کرتا ہُوں کہ کبھی دَوڑ میں بھی مجھے اس کی (یعنی شیشی کی) ضرورت نہیں پڑے گی۔ بوڑھے ایسٹرڈین نے اپنا ہاتھ لڑکے کے کندھے پر رکھکر کہا کہ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایسی موت اور زندگی دونوں ہی میں بے عزتی ہے۔ اور ساتھ ہی دُوسرے ہاتھ سے شیشی کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا کہ پھر یہ کیا ہے۔

لڑکا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ مجھے اس کا خیال تک بھی نہیں۔

جو مَیں نے اپنی ماں سے بستر مرگ پر کیا تھا۔ اور میرا ارادہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہنے کا ہے۔ یہ کہہ کر وہ مایوسانہ مگر اپنی ثابت قدمی پر ناز کرتا ہوا اُٹھا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔

جس وقت وُہ چلا گیا تو بُڈھے نے باہر کے دفتر سے ایک کلرک کو بلایا۔ اور اسکو لڑکے کے پیچھے جاکر اس کے مفصل حالات دریافت کرنے کے لئے حکم دیا۔

کلرک کو حکم دینے کے بعد بڈھا کئی منٹوں تک خیالات میں ڈوبا رہا۔ اور آخر اس کے مُنہ سے نکلا "حیرانگی ہے۔ کہ پہلی ہی دفعہ اسے نوکری ملی۔ اور وُہ اس سے انکار کرتا ہے"۔ ابھی وُہ انہی سوچوں میں تھا۔ کہ کلرک واپس آگیا۔

بڈھا۔ (شوق سے) تم نے کیا معلوم کیا۔

کلرک۔ وہ سکاٹلنڈ کا رہنے والا ہے۔ مَیں نے دو ایجنسیوں تک اس کا پیچھا کیا۔ لیکن ابھی تک اس کو جگہ نہیں ملی۔ ایجنسی والوں نے کہا ہے کہ وُہ اس کام کے کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تب وُہ اپنے گھر بلومسبری کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ جب وُہ اندر داخل ہُوا۔ تو اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وُہ مایوس ہو چکا ہے۔

بُڈھا۔ مَیں بھی یہی چاہتا تھا۔ اچھا میری موٹر گاڑی منگواؤ۔ کلرک جُھکا اور باہر چلا گیا۔

شام کا وقت ہے۔ اور سڑک پر ایک موٹر گاڑی جارہی ہے۔ جس میں ایک کروڑپتی صاحب سوار ہیں۔ وُہ گاڑی چلتے چلتے یکایک ایک بہت پُرانے اور خستہ گھر کے آگے جا کھڑی ہُوئی (یہی الفرڈ گرے کا گھر تھا)۔

کروڑپتی اُترا۔ اور اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک لڑکی نکلی اور کروڑپتی کو ایک ہال میں داخل کرکے اور ایک اور دروازے پر دستک دیکر چلی گئی۔

کی طرف مخاطب ہوا۔

لڑکا۔" جناب معاف کیجئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ کا اشتہار ایک دیانتدار آدمی کے لئے تھا۔ لیکن آپ کے کام میں ایک یا دو موقع مجھے ٹھیک یاد نہیں ہیں ایسے ہیں کہ جنکو میں دیانتداری نہیں سمجھتا"۔

جیکب ایسٹرڈین۔" ٹھیک درست مگر میرے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ میں ایک ایسا نوکر رکھوں۔ کہ جس پر مجھے پورا پورا اعتبار ہو۔ ورنہ میں بہت کچھ لوٹا جا سکتا ہوں"۔

لڑکا۔ (لاپرواہی سے)" یہ سارا کام ہی کچھ گڈمڈ سا ہے۔ اوّل تو جو شخص اس قسم کے کام کو اختیار کرلے۔ وہ اپنے آپ کو دیانتدار کہہ ہی نہیں سکتا۔ اور پھر آپ کا یہ مطلب ہو۔ کہ وہ اپنی جیبوں سے روک کر آپ کی اس قدر جیبیں بھرے۔ کہ اوپر اُچھلنے لگیں۔ اس سے تو کمپنی کو دائیں بائیں ہر طرف سے لوٹنے کا مطلب ہو۔ لہٰذا یہ جگہ میرے واسطے نہیں"۔ یہکر لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت اس کا چہرہ نہایت زرد ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں غصہ سے چمک رہی تھیں۔ اور اس کی نازک نوجوان مورت سرو کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ جیکب ایسٹرڈین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور مسکراکر کہا" نوجوان! تم تو کہتے تھے۔ کہ تم کو کوئی ملازمت نہیں ملسکتی لیکن اب تم خود دس پونڈ ماہوار کی ملازمت نہایت بے پروائی سے چھوڑے جاتے ہو۔ لڑکے نے جواب دیا۔ کہ ہاں یہ ٹھیک ہو۔ لیکن اگر میری دیانتداری کی سفید چادر پر بددیانتی کا بدنما دھبہ لگنے کی بجائے موت پیش کی جاوے تو میں بڑی خوشی سے دنیا کو چھوڑنا پسند کرونگا۔ جناب عالی! یہ ایک عدہ ہے

کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیئے - یہ کیا معاملہ ہے - اچھا میں سچ سُننا چاہتا ہوں" - لڑکے نے اپنی تھکی ہوئی مگر مشتعل آنکھیں بڈھے کی آنکھوں سے ملائیں اور بولا "آپ سچائی چاہتے ہیں - تو یہی جواب ہے کہ صرف اس لئے کہ میں بدقسمتی سے یہاں کوئی دوست نہ رکھتا تھا - ورنہ میں ہر ایک کام کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ مجھے ملے" -

بُڈھا "زمانے کے بہت شاکی معلوم ہوتے ہو - تمہارے پاس کس قدر روپیہ باقی رہ گیا ہے" - لڑکے نے غمگین آواز میں جواب دیا - کہ ایک پائی تک نہیں - آہ! ایک پائی تک نہیں! بوڑھے نے یہ فقرہ ہونٹوں میں کہا - اور پھر لڑکے کی طرف گہری نظر ڈال کر بولا "تم میرے پاس اس لئے آئے ہو کہ تم دیانتدار ہو"!

لڑکا - اگرچہ میں بالکل مفلس ہوں - مگر دیانتداری ابھی تک میرے پاس ہے - اگر میں دیانتدار نہ ہوتا - تو کیوں روپے کے بغیر ہوتا -

بوڑھا آدمی (دل میں) اس میں کچھ صداقت پائی جاتی ہے (بآواز) "اچھا میں اُمید کرتا ہوں - کہ تم میرے کام آسکو گے - لیکن پیشتر اس کے کہ ہم آپس میں کچھ سمجھوتہ کریں - میں مناسب سمجھتا ہوں - کہ جو کام میں تم سے کرانا چاہتا ہوں اس سے تمہیں آگاہ کردوں - اب پوری توجہ دو" - . . . . . .

اس کے بعد بڈھے نے ایک کاغذوں کا بڑا گٹھڑ اُٹھا لیا - اور دس منٹ تک ہالفرڈ گرے کو اپنے کام کی اصلیت سمجھاتا رہا -

لڑکا چپ چاپ اپنی نظر زمین کی طرف گاڑے ہوئے کچھ سوچتا رہا - اور آخرکار نظر اُٹھائی اور جیکب لیسٹر ڈین (بوڑھے آدمی کا نام - جو لڑکے کے دلی جذبات کو معلوم کرنے کے لئے پورے غور سے کوشش کر رہا تھا)

اس کے سوا کسی کو درخواست کرنے کی ضرورت نہیں"۔ تو اس کی مایوسی تھوڑی دیر کے لئے حیرت آمیز تعجب سے بدل گئی۔ اسکو بھروسے اور حوصلہ نے اُٹھایا۔ اور وُہ دل میں یہ سوچتا ہُوا بڑھا کہ اگر صرف دیانتداری پرہیزگاری اور محنت ہی کی لیاقت چاہئیں۔ تو سب سے پہلے مجھے ہی اس جگہ کے حاصل کرنے کا بہت عُمدہ موقع ملنا چاہئیے۔

جب وہ اندر داخل ہُوا۔ تو وہاں بہت سے درخواست کنندے موجُود تھے جنہیں آئے ہُوئے ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ یہ دیکھکر لڑکا دیر کرکے آنے پر بہت پچھتایا۔ مگر خلافِ اُمید وہ سب سے پہلے مشتہر صاحب کے دفتر کی طرف بلایا گیا۔

اندر جاکر اس نے ایک سفید بالوں والا بڈھا دیکھا۔ جو ایک کھڑکی کے نزدیک میز پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس بڈھے نے اس پر ایک تیز اور متجسس نظر ڈالی اور کہا بیٹھ جاؤ۔ لڑکے نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔

بوڑھا۔ "تمہارا نام"۔

لڑکا۔ مجھے ہالفرڈ گرے کہتے ہیں۔

بوڑھا۔ پہلے تم کیا کرتے تھے۔

ہالفرڈ گرے۔ (ذرا جھجکتے ہوئے) میں سکاٹ لینڈ میں ایک کھیت پر نوکر تھا۔ لیکن مَیں نے اس کو اس خیال سے چھوڑ دیا۔ کہ مَیں لندن میں اس سے زیادہ کما سکونگا۔ آج مجھے یہاں آئے ہُوئے قریب دو ماہ کے گذر چکے ہیں اور ابھی تک کوئی کام حاصل نہیں کر سکا۔

بڈھا آدمی۔ "کیوں نہیں" اور پھر اپنی شستہ نظر اپنی سنہری چوکھٹے والی عینک کے اوپر سے لڑکے پر ڈال کر کہا۔ "ایک نوجوان آدمی کو کام کے حاصل

آزمائش

وُہ لاغر ہو کر انسان کا صرف سایہ رہ گیا تھا۔ کئی دن تک اُس نے اپنی زندگی کے چراغ کو روٹی کے ایک ٹکڑے اور دُودھ کے ایک پیالے پر جلتا رکھا۔ اور آج صبح جبکہ اُس نے اپنی جیبوں کو بے فائدہ اِدھر اُدھر اُلٹا۔ تو سوائے مفلسی کے کچھ نہ پایا۔ اگرچہ اسکو کھانے پینے کو کچھ نہ ملا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس نے اپنی کھوئی ہُوئی طاقتوں کو کچھ عرصہ کے لئے پھر جمع کیا۔ اور اخبار کے کالموں میں سے "کارکنوں" کی ضرورت دیکھنے لگا۔ جس میں سے اُس نے چند اشتہار چُنے۔ لیکن پے درپے تین جگہوں سے دریافت کرنے پر جواب ملا۔ کہ "جگہیں پُر ہو چکی ہیں"۔ اگرچہ یہ متواتر شکستیں اس کے ٹوٹے ہُوئے دِل کو پژمُردہ کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ لیکن اس نے صبر اور ہمت کے تلخ عصا کو ہاتھ میں لیا۔ اور چوتھی جگہ قسمت آزمائی کے لئے روانہ ہُوا۔ اس وقت گرمی کی شدّت اُن لوگوں کو بھی تنگ کر رہی تھی جنہوں نے تمام رات عیش و عشرت اور آرام میں گذاری تھی۔ برخلاف اس کے ایک شخص کہ جس کا دماغ جسم اور رُوح سب کچھ بیمار تھا۔ ایک اجنبی راستہ پر سخت دھوپ میں ننگے پاؤں بھوکا اور پیاسہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہُوا لئے جا رہا تھا۔

آخر جب وُہ اسی حالت میں تین میل کی مسافت طے کر کے منزلِ مقصود پر پہنچا تو اس کے پاؤں بالکل مجروح ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ اس مکان کی دہلیز پر ستانے اور اشتہار کو دوبارہ پڑھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اشتہار میں جب اُس نے یہ غیر معمولی عبارت پڑھی۔ کہ "دیانت دار آدمی جو پچیس سال کی عمر سے کم اور تندرست پرہیزگار اور محنتی ہو

لڑکی کے دل میں ایک اجنبی سے طعن آمیز فقرے سُنکر پیدا ہوتا ہے مگر بڑھیا ساس کو بھولی بہو کی نسبت اس واقعہ کا حال زیادہ معلوم ہے۔ نیلی گھوڑی والا سوار کنوئیں کی گوری کی تلاش میں اپنی ماں سے ملکر نکلا تھا۔ اس لئے ساس نے جواب دیا:-

اَے بہو وُہ تمہارے شامیا تھوڑا سا پنیا دینی پلا

نادان لڑکی جس کی شادی سات برس کی عمر میں ہوگئی تھی اور اُس دن سے آج بارہ برس ہونے آئے تھے کہ اُس نے اپنے میاں کی شکل نہیں دیکھی تھی حیرت سے کہتی ہے:-

مَیں کیا جانوں وُہ میرے شامیا تھوڑا پنیا دیتی پلا

سات برس کی مَیں بیاہی چھوڑی تو بارہ برس پیچھے آئے

خیر یہ بات تو ہولی۔ اب میاں بیوی کا سامنا ہوتا ہے۔ میاں اٹھوانٹی کھٹوانٹی لیکر پڑجاتے ہیں اور بیوی سے اتنے برس پیچھے تو ملے گا بات تک نہیں کرتے تو بیوی کہتی ہے:-

کیا تمہیں کئی نیند یا اور کیا تمہیں چڑھا خمار

دل کی گھنڈی کھولو میرے پیارے مکھ سے اتارو رومال

میاں نے انداز سے کہا:-

نہ ہمیں کئی نیند یا اور نہ چڑھا ہی خمار۔ وُہ بات یاد کر میری گوری تھوڑا سا پنیا دیتی پلا

بیچاری بیوی دل میں شرمندہ ہوتی ہے اور پشیمانی کے لہجے میں مگر نخرے سے کہتی ہے:-

اجی میں کیا جانوں تم میرے شامیا تھوڑا سا پانی دیتی پلا

سات برس کی تم نے بیاہی چھوڑی تو بارہ برس پیچھے آئے۔

اس بھیا نتہ پن کی معافی سے میاں بھی خوش ہوگئے اور دونوں کا ملاپ ہوگیا۔

کی مَیں بہو ہوں اس ہیں۔ تجھ جیسے تو مزدور ہوتے ہیں پھر مَیں تیرا کام کیوں کرنے لگی۔ یہ جواب سُنکر اگر کوئی کنارِ رود کا رہنے والا ہوتا تو یہ شعر پڑھتا :-

غرورِ حسن اجازت مگر نہ داد اے گل ۔ کہ پرسشے بکنی عندلیب شیدا را

مگر یہ حضرت تو کوئی بڑے بگڑے دِل تھے۔ راجپوتی خون اُن کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ ایسا فقرہ ایک عورت سے سُنیں اور خاموش رہیں۔ دل میں بھی ان کے کوئی لگی لپٹی بات نہ تھی فوراً تلخ ہو کر بولے :-

"کاہیکا تیرا گڑوا اور کاہیکا تیرا ڈول۔ کاہیکی تیری اینڈوی ری گوری تو کے ٹکے تیرا مول"

اِس پر جواب ملتا ہے :-

سونے کا میرا گڑوا رُوپے کا میرا ڈول

رتن جڑاؤ میری اینڈوی رے چھیلا تو لاکھ ٹکے میرا مول

مسافر صاحب سُنکر اور بھی برافروختہ ہوتے ہیں۔ جل کر فرماتے ہیں :-

پیتل کا تیرا گڑوا اور چمڑے کا تیرا ڈول

گھاس پھونس کی تیری اینڈوی ری گوری تو پھوٹی کوڑی تیرا مول

اس پر مسافر اور پنہاری دونوں بگڑ جاتے ہیں۔ مسافر اپنی راہ لیتا ہے اور پنہاری

بھر گڑوا لے چلی اور چڑھ گئی چندن چوبار

یہ لڑکی کچھ ایسی ویسی نہ تھی۔ اچھے کھاتے پیتے گھر کی تھی۔ پانی گھڑے میں بھر کر چلی اور اپنے دو منزلے مکان پر جس میں چندن کے کٹہرے تھے چڑھ گئی وہاں جا کر اُس نے اپنی ساس سے شکایت کی۔

ساس جی نیلی سی گھوڑی پاتلی اور پاتلیا تھا سوار

کنوئیں کی گوری تم پانی پلا دو تو راہ مسافر جائے

بہو کی یہ شکایت اُس غصّے کو ظاہر کرتی تھی جو ہر صاحب عصمت اور شریف

ایک ہندی گیت

شام کا وقت ہی۔ گرمی کا موسم ہے۔ پیاس کا زور ہی۔ گاؤں کے سرے پر بڑ کے شاندار درخت کے نیچے ڈگر سے بچا ہوا ایک پکا کنواں ہی۔ بہت سی گاؤں کی کمسن اور خوبصورت لڑکیاں اس کنوئیں پر پانی بھرنے کے شغل سے دل بہلا رہی ہیں اور اپنی الھڑپن کی بے خبری میں ایک دوسری سے چہل کر رہی ہیں۔ اتنے میں ایک مسافر ایک گھوڑی پر سوار پیاس کا مارا ہوا گرمی سے زار و نزار اس کنوئیں کی طرف بڑھتا ہے۔ اس واقعہ کو ہندی شاعر نے ایک گیت میں نظم کیا ہے اور وُہ گیت اِس طرح شروع ہوتا ہے:-

نیلی سی گھوڑی پاتلی اور پاتلیا ہے سوار

پھر یہ نیلی گھوڑی والا دبلا پتلا سوار پنہاریوں سے یُوں مخاطب ہوتا ہے:-

کُنوئیں کی گوری تم پانی پلا دو تو راہ مسافر جاتے

پنہاریاں مُسافر کی اس بے باکی پر چونک پڑتی ہیں اور اُن میں سے ایک جو سب سے زیادہ تیز و طرّار اور شوخ ہے یُوں جواب دیتی ہے:-

آپے بھر پیو چھیلا بھر پیو میرا بالا سا جوبن دیکھ نہ بھُول

جس کی میں بالی بوہڑیا اُس کے تمسے تو راج مزور

اس جواب میں کس قدر اپنے حُسن اور اپنے سُسرال والوں کی امارت کی ترنگ ہے پانی پلانے سے انکار ہے۔ مگر کس انداز کا انکار ہے۔ کس قدر خودداری کا اظہار ہے کہ میاں پانی پینا ہے تو خود بھر کر پی لو۔ کیا تمہارے ہاتھ نہیں ہیں۔ کہیں اسی وہم میں نہ رہنا کہ میں بالی بھولی ہوں تو تمہارا کام کر دونگی جس گھرانے

تک اسی طرح چاہونگی - گو بی بی کا نام دُنیا کی نظر میں معزز ہی - لیکن معشوق کے لفظ میں زیادہ جادو ہی - یہ میری شومیٔ قسمت تھی کہ میں ایسے ظالم خاندان میں پیدا ہُوئی جنکی دشمنی نے میری مطئن زندگی کو خاک میں ملا دیا - اگر وُہ نیک مزاج ہوتے تو میں کیوں نہ اپنے پیارے شوہر کے ساتھ خوش خوش رہتی - ہائے وُہ کیسے بیرحم ہیں کہ تم کو قتل کرنے پر ایک بدمعاش کو اُبھارا - اُس وقت میں کہاں تھی - اپنے پیارے کو بچانے میں مجھے کس قدر فخر ہوتا - اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر میں تمہاری نگہبانی کرتی - آہ - یہ جذبات کی روانی مجھے کہاں کہاں بہا رہی ہی - اب محبت گھبراتی ہی اور حیا زبان کو روکتی ہے -

میں ان عورتوں میں اپنی زندگی گذار رہی ہوں جو اپنے تیئں خدا سے بیاہی ہُوئی سمجھتی ہیں - لیکن ان میں صرف ایک میں ہی ہُوں جو انسان سے بیاہی گئی ہُوں میں ان لوگوں میں رہتی ہُوں جو عیسیٰ کے بہشتیاں ہیں - لیکن میں صرف ایک ہی ہُوں جو انسانی جذبات کی بندی ہُوں - میں ایک تن ہوکر اپنے ابیلارڈ پر فدا ہوں - اگر میں عشرت پسند ہوتی تو کیا مجھے اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں دیر تھی - میری عمر بائیس سال سے زیادہ نہ تھی - یہ صرف تمہارے ہی لئے تھا کہ میں نے اپنے حُسن و جوانی کو تم پر قربان کر دیا اور اسکے بدلے میں بیچین گھنٹے اور فرقت کی کٹھن راتیں گذارتی ہُوں - افسوس میرا خیال کرو - مجھے نہ بھُولو - میری محبت اور وفا کو یاد کرو - اور مجھے اپنی معشوق سمجھکر پیار کرو - یاد رکھو میں تمہیں دل دیا کرتی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کوشش کرتی ہوں کہ تمہارا خیال صفحۂ دل سے مٹادوں - ہائے - یہ کسقدر خوفناک خیال ہی - میں مارے خوف کے کانپتی ہوں اور میرا دل مجھ سے نفرت کرتا ہی - اسوقت میرا دل بھر آیا ہی اور ہاتھ کانپ رہا ہے - معاف کرنا یہ میرے آنسو ہیں جو خط کو تر کر رہے ہیں - خدا حافظ +

(ترجمہ از لیٹن) محمد سعد الدین خاں (از لندن)

ابھی وُہ خوشی نہیں ہے کہ مَیں تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں ۔اِس لئے اِس کے بدلے میں صرف تمہارے خطوط ہی میرے لئے باعثِ اطمینان ہونگے ۔مَیں تمہارے پاک خیالات کو پڑھوں گی ۔انکو ہمیشہ اپنے ساتھ جان کی طرح رکھونگی اور ہر لحظہ آنکھوں سے لگاؤں گی چُوموں گی ۔ اگر تم نہ لکھو کہ تم مجھے دل سے پیار کرتے ہو تو مَیں کسی صُورت سے زندہ نہیں رہ سکتی ۔

جب تم مجھے لکھو گے تو تم اپنی بی بی کو لکھو گے ۔عقد نے ایسی خط کتابت کو جائز بنا دیا ہے تو تم کیوں نہیں مجھے مطمئن کرتے ہو ۔مَیں صرف اپنے تمام عہدوں ہی سے پابند نہیں ہوں ۔ بلکہ میرے لئے میرے چچا کا خوف ہے لیکن تمہیں تو کچھ وجہ نہیں جو تم ڈرو ۔ تم ہی میری بدبختی کا باعث ہُوئے ہو ۔اِس لئے تم میری راحت کا سبب بنو۔ تم بھُولے نہیں ہو (کیونکہ عاشق کبھی بھُولتے نہیں) کہ کبھی خوشی سے پُورا دن تمہارے ساتھ گذارتی تھی اور جب کبھی تم باہر ہوتے تو مَیں اپنے آپ کو ہر ایک سے جُدا کر کے تم کو خط لکھتی تھی ۔جب تک میرا خط تمہیں نہیں پہنچتا تھا مَیں کس قدر بےچین و بیقرار رہتی تھی ۔ پیامبر کو پانے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ اس رام کہانی سے شاید تم گھبراؤ ۔لیکن میرے جذبات کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔کیونکہ مَیں اس سے بھی زیادہ دُکھ اُٹھا چکی ہُوں مَیں نے اپنے سے نفرت کی ہے تاکہ صرف تم ہی سے محبت کروں ۔مَیں خود کو برباد کرنے کے لئے اس قید خانہ (ننری)[1] میں اس لئے آئی کہ تم کو آرام سے رہنے دوں ۔ یاد رکھو ! صرف اُس ہی دل میں یہ جذبات گھر کرتے ہیں جو پاک محبت کے شعلہ سے منوّر ہو ۔ ناپاک دل میں ایسے خیالات آتے ہُوئے بھی گھبراتے ہیں ۔ مَیں تم کو دُنیا کی ہر ایک چیز سے زیادہ چاہتی ہُوں اور اپنی زندگی کے آخری دم

---

[1] رُہبان کا مسکن جو تارک عورتوں کے لئے مخصوص ہو ۔

ابیلارڈ اور ہیلائیس

یہ ایک سچی محبت کا تاریخی واقعہ ہے جو سنہ [illegible]ء میں فرانس میں گذرا ہے۔ عاشق و معشوق پیرس کے ایک مقبرہ میں ہمیشہ کی نیند سوتے ہیں۔ ذیل کا خط زمانہ فراق میں لکھا گیا ہے:۔

مجھے یہ دیکھنے سے کس قدر حیرت ہوئی کہ تمہارا پورا خط دلشکن بدبختی کے کوائف سے بھرا ہے۔ زمانہ دراز میرے زخموں کو بند کرنے کو چاہیئے تھا لیکن تمہارے خط نے زخم تازے کر دیئے۔ دیکھو! میں منت کرتی ہوں تم نے کس قدر پریشان حال مجھے بنا دیا ہے۔ دُنیا میں میرے لئے کسی قسم کی راحت نہیں ہے سوائے اس کے کہ تم ہی میرے لئے باعث شادمانی ہو۔ نامہربان نہ ہو۔ میں تھوڑی سی راحت تم سے بھیک مانگتی ہوں اور تم مجھے دے سکتے ہو۔ مجھے اپنے پورے حالات معلوم کراؤ۔ شاید میری آہ و زاری تمہاری تکالیف کو کم کرے۔ جب تم مجھے لکھو گے میں جانونگی کہ تمہارے دل میں میری یاد باقی ہے اور یہ بات میرے لئے باعث شادمانی ہوگی۔

میرے کمرے میں تمہاری تصویر ہے اور جب کبھی وہاں سے گذرتی ہوں تو اُسکو ایک تمنا بھری نظر سے دیکھنے کے لئے کھڑی رہجاتی ہوں۔ دیکھو! ایک تصویر سے مجھے اسقدر راحت ہوتی ہے جو صرف تمہارا عکس ہے تو تمہارے خط سے کیوں نہ خوشی ہو۔ ہم کو آپس میں لکھنا چاہیئے۔ میں پڑھوں گی کہ تم میرے شوہر ہو اور تم دیکھو گے کہ میں اپنے آپ کو تمہاری بی بی لکھوں گی۔ میری قسمت میں

زندگی کے ضروری لوازمات مہیا کرنے والے غیر ضروری چیزیں بنانیوالوں سے پندرہ ہزار کے قریب کم ہیں اور فی کس بارہ روپیہ ماہوار آمدنی کے حساب سے سُناروں کی اس چار لاکھ نکمّی فوج پر ملک کا چھ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے جو اگر مفید حرفوں میں لگایا جائے تو کیا اچھی ترقی ہوسکتی ہے۔ آئے دن کے قحط اور گرانی کی عالمگیر شکایات سے ملک کی حیثیت ظاہر ہے وُہ ایسا مالدار نہیں ہو کہ ضروری چیزیں چھوڑ کر کھلونوں پر اپنا روپیہ برباد کرے۔

۵ - زیور انسان کی خود نمائی کے جذبہ کو اُبھارنے والا ہے پہننے والے کے دل میں بچوں کی سی خواہش پیدا ہو کر ویسی ہی عادت بنجاتی ہے۔ یہ پہننے کیلئے نہیں پہنا جاتا دکھانے کیلئے پہنا جاتا ہے۔ جسکا ثبوت ذیل کے لطیفے سے کیا اچھا ملتا ہے کہتے ہیں کہ کسی ڈومنی نے جوشن بنوائے پہنکر دن بھر شہر میں پھری۔ اتفاق کی بات اُس بیچاری کو کسی نے نہ پُوچھا کہ وہ جوشن کب بنوائے اور کہاں سے بنوائے۔ واپس آکر گھر کو آگ لگادی۔ جب لوگ جمع ہوئے تو ایک نے پُوچھا یہ آگ کہاں سے لگی؟ ڈومنی جوشن کی طرف اشارہ کرکے بولی یہیں سے تو لگی۔ تب اُس نے پُوچھا یہ جوشن کب بنوائے ہیں جھنجھلا کر جواب دیا۔ کمبخت اگر پہلے ہی یہ بات پُوچھی ہوتی تو آگ کیوں لگتی۔

آراستگی تو بُری چیز نہیں البتہ اس سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وُہ خطرناک ہے۔ کہ انسان جو کچھ تو پہلے ہی خود نما پیدا ہُوا ہی ہونے ہوتے نمائش میں ایسا منہمک ہوجاتا ہے کہ اصل غرض ہی کو بھُول جاتا ہے۔ جس کے لئے یہ پیدا کیا گیا ہے۔

ہوشیار

کیا سنگدل آدمی ہے کہ آپ تو گھوڑے پر سوار ہے اور عورت بیچاری پیدل چل رہی ہے۔ تب وُہ دونوں ہی سوار ہوگئے اور لوگوں سے بدتہذیبی کے طعنے سُنے۔ پھر دونوں پیدل چلنے لگے اور گھوڑا خالی ہیٹھ ہاتھ میں تھام لیا۔ اس پر بھی وُہ بیوقوفی کے طعنوں سے نہ بچ سکے۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ لوگوں کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے انکو کس رواج کی پابندی کرنی چاہئے تھی۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ دُنیا میں کوئی رواج نہیں۔

زیور کو البتہ نقصانِ مال اور جان کا وبال کہو تو بجا ہے۔ استعمال سے گھس گھس کر اس کی قیمت دمبدم گھٹتی رہتی ہے۔

چور بار ہا بالیاں کان سمیت۔ نتھ ناک سمیت۔ کنگنی ہاتھ سمیت اور ہار گلے سمیت لیجاتے ہیں۔

اور اس پر بھی کیا ہمارے ملک کی مستورات جب آپس میں ملتی ہیں تو انکا پہلا سوال زیور کی نسبت نہیں ہوتا۔ کیا انکی پہلی نگاہِ تفتیش ایک دُوسری کے زیور پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر ملنے سے بچھڑنے کے وقت تک اسی ایک ہی مضمون پر طبع آزمائیاں نہیں ہوتی رہتیں۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انکو زیور کے ساتھ مجنونانہ پیار ہے۔ کیا اُنہوں نے لازمی مضمونوں میں کامیابی حاصل کرلی ہے کہ اختیاری مضمون ہر وقت زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔

۴۔ ظاہر ہے کہ زیور ضروریاتِ زندگی میں سے نہیں ہے۔ البتّہ لوہے کی چیزوں کے بغیر انسان کا زندگی بسر کرنا محال ہے۔ جس کی کسان کے ہل سے لیکر بادشاہ کے محل تک کے لئے یکساں ضرورت ہے اور اب ذرا مقابلہ کرو کہ ہندوستان میں لوہار کتنے ہیں اور سُنار کتنے۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں لوہار ۳۸۴۹۰۸ تھے اور سنار ۴۰۱۵۲۸ تھے (اب تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہونگے) گویا انسانی

ہے تو اپنے ہی گوہر آبدار سے یعنی اُس گوہر سے جس کا تعلق ایک طرف تو اس سے ہے اور دُوسری طرف براہِ راست خدا سے۔ اشرف ہوکر غیر اشرف چیزوں میں خوبصورتی ڈھونڈھنا نادانی ہے۔ اور اگر کلمہ احسن تقویم پر غور کیا جائے تو بدصورتی کا نام لینے سے بھی شاید گناہ لازم آئیگا۔ اور خداداد حُسن میں انسانی دخل۔ دخل درمعقولات ٹھہریگا۔

(۳) کسی بی بی کا زیور کیا ظاہر کرتا ہے؟ یہ کہ اس بی بی کا میاں مالدار ہے یا اُسکا والد امیر ہے۔ پہننے والی کی اپنی قابلیت تو اُس سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ گویا زیور کسی مرد کی امارت جتانے کا ایک ادنیٰ سا ذریعہ ہے وہ نہ اُس کی زمین۔ اُس کے مکانات۔ اُس کے مویشی وغیرہ بجائے خود امارت کا ایک اعلان ہے۔

زیور کیوں پہنا جاتا ہے؟ خوبصورتی بڑھانے کو۔ امارت جتلانے کو۔ رواج نبھانے کو۔ امرِ اوّل یعنی خوبصورتی بڑھانا تو وُہی دخل درمعقولات ہے۔ امرِ دوم یعنی اظہارِ امارت اس کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ رہا رواج سو رواج کیا ہے؟ ایک ایسی رسم کی پابندی ہے جس سے عام خلقت کی پسندیدگی حاصل کرنا مقصُود ہوتا ہے۔ خواہ وُہ رواج منقولاً اور معقولاً درست ہو یا نہ۔ اور یہ بات کہ کوئی شخص رواج کی پابندی سے دنیا کے لوگوں کی پسندیدگی حاصل کرسکے ناممکن۔ طبیعتوں کا اختلاف اور زمانے کا انقلاب کسی رواج کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتا۔ کوئی میاں بی بی سفر کر رہے تھے۔ بی بی گھوڑے پر سوار تھی اور میاں پیدل۔ دیکھکر ایک راہرو بولا کیسا بزدل مرد ہے کہ بی بی کے خوف کے مارے خود تکلیف اُٹھا رہا ہے اس پر وُہ خود سوار ہوگیا اور بی بی پیدل چلنے لگی۔ جس پر ایک دُوسرا بولا

زیور

جسم انسان سے زیور کا تعلق اور ملک کی حیثیت پر اثر

(۱) ۔ خوبصورت آدمی کی لوگوں میں تعریف ہوتی ہے اور بدصورت کی مذمت مگر چند روز ۔ نیک سیرتی البتہ انسان کے لئے مستقل نام پیدا کرتی ہے جیسا کہ بدسیرتی دائمی رُسوائی ۔ ناممکن ہے کہ دُنیا میں یوسف مصری جیسے خوبصورت شخص پیدا نہ ہوئے ہوں ۔ ہوئے ہونگے اور اُن کی سیرت کمزوری کے سبب صُورت کے ساتھ ہی محو ہو گئی ہو گی ۔ کیا دُنیا میں سب سے زیادہ بدوضع نمرود ۔ شداد اور فرعون ہی تھے ؟ کیا یوسفؑ کا نام اُنکی موزونیِ اعضا کے سبب سے قائم ہے ؟ ذرا غور کیجئے اور پھر جواب دیجئے ۔ جاپان سے لیکر امریکہ تک گُلِ گلاب کو جو شہرت حاصل ہے کیا یہ اس کی بناوٹ اور رنگت کے سبب سے ہے ؟ نہیں ہوا میں ملکر فضا میں پھیل جانے والی چیز اس کی خوشبو ہے ۔

(۲) ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو صُورت گری میں کہاں تک دخل ہے اور سیرت بنانے میں کہاں تک ۔ ظاہر ہے کہ حقیقی مصوّر نے صُورت گری میں تو انسان کو مطلق دخل نہیں دیا ۔ سیرت البتہ یہ بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی ۔ خُدا نے جس شخص کو جیسا بنا دیا بنا دیا ۔ معدنیات کا ملمع چڑھا کر ہم اسکو ذرا بھی تو جلا نہیں دے سکتے ۔ البتہ ایسی چیزوں کا ملمع کچھ اسی قسم کی چیزوں کے لئے موزون ہو سکتا ہے (جیسے دیگچی پر قلعی) انسان کے ساتھ انکا جوڑ بے جوڑ ہے ۔ ہاں انسان اگر جلا پا سکتا

کے اقوال کا اعتبار نہیں۔ انکی ایسی مثال ہے کہ جیسے اندھا بٹیر مارنے جائے۔ جھوٹی حکایتیں انکے پاس ہیں اور بس۔

مختصر یہ کہ محققین کیمیا۔ کیمیا کو صنائع وعلوم سے خارج سمجھتے ہیں جیسے کہ لکڑی کے مادہ سے لکڑی اور حیوان کے مادہ سے حیوان ایک دن یا ایک مہینہ میں نہیں بنایا جاسکتا۔

اسی طرح سونے کے مادہ سے ایک دن یا ایک مہینہ میں سونا نہیں بن سکتا۔ پس اب جو شخص علمی طور پر کیمیا کا طالب ہوتا ہے وُہ اپنے مال کو اور کام کو ضائع کرتا ہے۔ اِسی لئے کیمیا کو تدبیر عظیم کہتے ہیں۔ کیمیا کا بنا لینا ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی آدمی پانی پر چلے۔ ہوا میں اُڑے۔ اجسام کثیف میں نفوذ کرے۔ یا کوئی جانور پیدا کرے اور یہ سب خرق عادت اور معجزات ہیں جو اکثر مرد صالح کو ملتے ہیں۔ اور وُہ دوسروں کو بتلا دیتا ہے۔ لیکن یہ قوت دُوسرے شخص کے پاس عاریت ہوتی ہے گروہ تیسرے کو نہیں دیسکتا۔

اِسلیئے حکما کے اقوال اس کے متعلق معمہ وچیستاں ہیں بغیر علم تصرف کوئی اسپر قادر نہیں ہوسکتا۔ عام لوگ جو اس صنعت کو اختیار کر لیتے ہیں وُہ اکثر معاش کے اسباب طبعی پر قدرت نہیں رکھتے اور چاہتے ہیں کہ اس تدبیر سے ایک ہی دفعہ مالا مال ہوجائیں۔

دیکھو فقیر اور مساکین کو اس کا زیادہ خبط ہوتا ہے بلکہ حکما بھی اس طلب سے خالی نہیں۔ ابن سینا اس کے محال ہونیکا قائل ہے جو وزیر وصاحب ثروت تھا۔ فارابی اسے ممکن بتاتا ہے جو بمشکل پیٹ بھر کر کھانا پاتا تھا۔ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ

سید محمد علی افسوس وکیل

ہوتا ہوا اپنے کمال تک پہنچتا ہے اور ہر حالت میں آخری کی نسبت مقدار و کیفیت
بدلتی رہتی ہے اگر یہ نسبت نہ بدلے تو نطفہ کی حالت میں بھی ہرگز تغیر نہ ہو سکے۔
اسی طرح حرارت غریزیہ سے بھی ہر حالت کی مختلف حیثیت ہوتی رہتی ہے۔ اب
خیال کرنا چاہیئے کہ ایک ہزار اسی سال میں سونے کی کتنی حالتیں بدلنی چاہئیں
کیمیا گر بھی چونکہ ایک ناقص دھات کو کامل بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ضرور
ہے کہ وہ بھی طبعی اطوار تدریجی کے پیرو بنیں تاکہ چاندی سونا بنا سکیں۔ اب
صنعت کی شان ہو کہ مقصود و غایت کا تصور صاحب صنعت کے ذہن میں
موجود ہو۔ کیونکہ ابتدائے عمل آخر فکر ہوتا ہے اور آخر فکر اول عمل اس لئے
ضرور ہے کہ کیمیا گر ان تمام حالات اطوار کو جانتا ہو جو ایک معدنی کو سونا
ہونے تک پیش آتے ہیں۔ ان سب باتوں کا علم کیمیا گر کو ہونا چاہئے۔ مگر
علوم بشریہ ناچیز اور محدود ہیں۔ پس اس حالت میں جو کوئی سونا چاندی بنا دینے
کا دعویٰ کرے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی مدعی کہے کہ میں مٹی سے آدمی پیدا
کر سکتا ہوں۔ مگر یہ نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے جبکہ ایک دھات کے چاندی
سونا ہونے تک کان میں کیا کیا حالتیں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں مدعیان
کیمیا کے دعووں کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

دوسری دلیل شیخ الرئیس کے بطلان کیمیا پر یہ ہے کہ طبیعت کبھی سہل
طریقہ کو چھوڑ کر بعید و مشکل کو اختیار نہیں کرتی۔ اگر کیمیا کا صنعتی طریقہ صحیح ہوتا
تو طبیعت اس طریقہ کو چھوڑ کر ہرگز اس کے خلاف طریقہ پر نہ چلتی۔ طغرائی
نے اس کیمیائی تدبیر کو سانپ بچھو کی تخلیق سے تشبیہ دی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح
ہو لیکن سانپ اور بچھو کیچڑ اور بالوں سے پیدا ہوتے تو لوگوں نے دیکھے
ہوں گے لیکن کسی اہل علم نے کیمیا نہ بنائی اور نہ اس کا طریقہ معلوم کیا [illegible]

اور بنتا ہے۔

پھر چاندی سونا بھی اگر اسی طرح بنالیں یا اُن کے بنانے کی ترکیب ڈال لیں تو کیا غیر ممکن ہے؟ ان اقوال کی صریح تردید یہ ہے جن سے کیمیا کا بننا محال ثابت ہوتا ہے:-

قائلانِ کیمیا کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مادۂ قابل بہم پہنچانے کے بعد وہی اعمال کرتے ہیں۔ جو طبیعت معدنیات پر اثر کر کے ایک تو سونا چاندی بناتا ہے اور ساتھ ہی ایسی تدبیریں بھی کرتے ہیں کہ فاعلہ و منفعلہ قوتوں کی طاقت چند در چند ہو جاوے۔ تاکہ اعمال کیمیائی کے ذریعہ سے معدنیات جلد تر چاندی سونا بن سکیں۔

بخلاف اس کے طبیعیات میں ثابت ہو چکا ہے کہ سونا کان میں ایک ہزار اسی سال یعنی آفتاب کے ایک بڑے دورے کے بعد کامل طور پر تیار ہوتا ہے۔ پس اگر قویٰ موثرہ و منفعلہ کی قوت چند در چند ہو جائیگی تو سونا نسبتاً بہت کم زمانہ میں تیار ہو جائیگا۔

اگر اکسیر دم کے دم میں معدنیات میں استحالہ کر دیگی اور ظاہر ہے کہ جو چیز عناصر سے ملکر بنے اس میں چاروں عناصر کے ہونے کے علاوہ کسی ایک چیز کا غالب ہونا ضروری ہے۔ تاکہ طبیعت قائم ہو سکے اور جو مرکب ہوگا اس میں حرارت غریزیہ کا ہونا بھی ضروریات سے ہے تاکہ حافظ صورت ہو سکے۔

اور پھر جو متکون ایک عرصہ میں تیار ہوتا ہے وہ زمانہ تکوین میں برابر حالت بدلتا رہتا ہے۔ یہانتک کہ غایت کمال کو پہنچ جائے۔

آدمی ہی کو دیکھ لو کہ نطفہ سے خون بستہ بنتا ہے پھر لوتھڑا ہوتا ہے پھر تصویر بنتی ہے۔ ازاں بعد جنین ہوتا ہے اور پھر مولود اور رضیع وغیرہ

کا نسی ۔ مختلف النوع نہیں اگر ہیں تو ایک ہی نوع ۔ لیکن خواص مختلف ہیں اس لئے ایک نوع کی چند صنفیں کہلا سکنے کے مستحق ہیں ۔
ابو نصر فارابی اور اس کے پیرو حکمائے اندلس کی رائے یہ ہے کہ یہ سب معدنیات ایک ہی نوع کی ہیں ۔ اختلاف رطوبت و یبوست نرمی و سختی اور رنگت کا ہے اور ابن سینا اور اس کے متبع حکمائے مشرق کی رائے میں معدنیات ہفت گانہ مختلف النوع ہیں اور ہر ایک جنس و فصل علیحدہ ہے۔
فارابی چونکہ اتحاد نوع کا قائل ہے اسی لئے ان معدنیات میں قلب استحالہ کو ممکن مانتا ہے اور کیمیا اس کے نزدیک صحیح اور سہل المأخذ ہے ۔
اور ابن سینا چونکہ معادن کی جداگانہ انواع مانتا ہے ۔ اس لئے وہ کیمیا سے انکار کرتا ہے اور اسے محال سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ ممکن نہیں کہ انسانی تدابیر سے اجناس فصول میں رد و بدل ہو سکے ۔ خصوصًا ایسی حالت میں کہ فصول مجہول الکیفیت اور بعید از تصور ہوں ۔
طغرائی کیمیا گر بو علی سینا کی تردید کرتا ہے کہ کیمیائی تدابیر سے معدنیات کے لئے ہم فصلیں پیدا تو نہیں کرتے صرف مادہ کو کسی خاصہ کے قبول کرنے کے قابل بناتی ہیں ۔ جب مادہ میں یہ صلاحیت اور قبولیت پیدا ہو جاتی ہے تو فصل اُس میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتی ہے جیسے کہ نور اجسام شفاف میں نفوذ کرتا ہے ۔ جب تک اجسام شفاف نہوں یا نہ کئے جائیں نور سے وُہ کامل فیض نہیں پا سکتے اس صورت میں ہمیں فصول کے علم و ادراک کی کیا ضرورت ہے ۔ ہم خود بعض حیوانات پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور ہمیں اُن کی فصول کا علم تک نہیں ہوتا ۔ مثلاً بچھو ۔ مٹی اور مادۂ متعفن سے ۔ اور سانپ بالوں سے ۔ نرسل کھر والے جانوروں کے سینگوں سے پیدا ہوتا ہے ۔

اب اُن لوگوں کا حال سُنیں جو بجائے اصل کیمیا گری کے حیلہ و فریب سے کام لیتے ہیں اور جھوٹی کیمیا بناتے ہیں۔ یہ لوگ چاندی کو سونے کا ہم رنگ اور تانبے کو چاندی کی طرح سفید کرکے اپنی کیمیا گری کا ثبوت دیتے ہیں۔

بعض اُن میں سے محض ملمع کاری سے کام لیتے ہیں اور بعض ہڑتال وغیرہ کے جوہر سے چاندی تانبے کو رنگتے ہیں۔ بعض جوڑا بناتے ہیں۔ یعنی اگر چاندی بنانی ہوتی ہے تو کچھ چاندی اور کچھ تانبہ ملاکر چاندی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح چاندی اور سونا ملاکر سونے کا جوڑا تیار کرتے ہیں۔ اور ایسی صفائی سے کام لیتے ہیں کہ بڑے بڑے نقاد اُسے نہیں پہچان سکتے۔ اور ایسے لوگ کھوٹی چاندی اور سونا بناکر رائج الوقت سکہ ڈھالنے لگتے ہیں۔ اور کھوٹے سکوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ نہایت بد عاقبت لوگ ہیں۔

ہم نے آجتک کوئی کیمیاگر نہیں دیکھا کہ چاندی سونا بناتا ہو۔ ہاں یہ دیکھا ہے کہ اسی خبط میں اکثر نے اپنی عمریں تباہ کردیں اور ہمیشہ ایک آنچ کی کسر ہی رہ گئی۔

جوہر اور تیزاب تیار کرنے میں عمریں تمام ہوگئیں۔ مگر جلنے پھونکنے اور روپیہ خراب کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور نتیجہ بے سود رہا۔ تحقیقات سے اسبات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ کیمیا گری کا خبط قدیم سے چلا آتا ہے اور اکثر متقدمین نے اصُول کیمیا پر بحث کی ہے اور متاخرین نے اس کی واقعیت پر زور دیا ہے اس لئے ہم اول اس فن کے متعلق لوگوں کی رائیں لکھ کر اس پر محققانہ نظر ڈالتے ہیں۔

اس کیمیا سازی کے متعلق مذہب حکما یہ ہے کہ آیا معادن ہفتگانہ جو جنوری سی بڑھ سکتی ہیں یعنی سونا۔ چاندی۔ رانگ۔ لوہا۔ سیپ۔ تانبا۔

اس مادۂ خاص کو اس میں رکھکر کسی نے اسے کسی خاص قسم کے پانی اور بوٹیوں میں تاؤ دیئے تا کہ کشتہ ہوکر اکسیر ہو جائے۔

کسی نے شورہ لیا اور خاص خاص بوٹی وغیرہ کے تیزاب میں بجھا کر اُس کا نمک نکالا۔ اور پھر اُسے پانی میں حل کرکے آب اکسیر تیار کیا۔

مختصر یہ کہ کسی نے خاک کی چٹکی کو اکسیر سمجھا اور کسی نے تیزابوں کو کیمیا کا اصل اصول ٹھہرایا۔ اور ۲۵ تولہ پاؤ رتی کی دعوت شروع ہوئی۔ یعنی اگر معدنیات کو پگھلا کر یہ اکسیر اس میں ڈالی جائے تو چاندی سونا تیار ہو جائیگا۔

اس فن میں جو لوگ محقق و مبصر و ماہر پائے گئے ہیں اُن کا خیال ہے کہ اکسیر ایک ایسا مادہ ہے جو عناصر اربع سے مل کر بنتا ہے اور کیمیاوی اعمال سے اس میں ذو قوت طبعی مزاج پیدا ہو جاتا ہے کہ جب معدنیات میں اکسیر ڈالی جاتی ہے یا معدنیات اس میں ڈالی جاتی ہیں۔ اکسیر کا زور آور مزاج معدن کی اصلی طبیعت کو بدل کر اپنا ہم رنگ بنا لیتا ہے نہ عارضی طور پر بلکہ دائمی طور پر۔ جیسے کہ خمیرہ آٹے میں پڑکر تمام آٹے کو خمیر کر دیتا ہے۔ یہی حال چاندی سونے کے اکسیر کا ہے کہ ادنیٰ معدنیات کو چاندی سونا بنا دیتی ہے۔

یہ ہے خلاصہ کیمیا گروں کے زعم و استدلال کا جس کے بھروسہ پر وہ دن رات اسی شغل میں لگے رہتے ہیں۔ مَیں نے ایک مرتبہ ایک نہایت ماہر و عالم کامل حکیم سے اس معاملہ میں گفتگو کی اور اس فن کی ایک کتاب جو جونپور کے کسی صاحب نے چھاپی ہے انہیں دکھلائی۔ اُنہوں نے دیر تک اُسے بغور دیکھا اور پھر مجھے واپس دیکر کہا کہ اس بات کا مَیں ضامن ہوتا ہوں کہ ان کتابوں سے کچھ حاصل وصول نہ ہوگا اور ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔

یہ تو اُن لوگوں کی حالت ہے جو اس دھن کے پکّے اور اس مرض کے مریض ہیں۔

کیمیاگری

جو لوگ کہ وسائل طبیعہ سے معاش پیدا نہیں کر سکتے وہ کیمیا کی فکر میں پڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کیمیا بھی حصولِ معاش کا ایک ذریعہ ہے بلکہ انکو یقین ہوگیا ہے کہ اُس کی مدد سے بہت جلد کیمیا گر مالا مال ہو سکتا ہے:-

یہی خیال ہے جو ہوسوں کو گوناگون محنت اور مشقت کا متحمل بناتا ہے ایسی ایسی مصیبتوں میں پڑتے ہیں کہ جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ اور اس قدر مال کیمیا کی دُھن میں خاک کر دیتے ہیں کہ اگر بالفرض کیمیا بن بھی جائے تب بھی اتنا مال حاصل نہ ہو۔ اکثر ناکامی کے صدمہ میں مرجاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہوس لوگوں کو کیمیا کے خیال سے باز نہیں آنے دیتی۔

کیمیاگروں کے سر پر کیمیا کا بھوت اس لئے سوار ہو گیا ہے کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ معادن میں استحالہ ہوتا ہے اور اشتراکِ مادہ کی وجہ سے بعض معدنیات دُوسری صُورت میں آجاتی ہیں تو انہیں خیال ہوا کہ اگر تدبیر سے کام لیا جائے تو چاندی سونا۔ اور تانبا رانگ چاندی ہو سکتی ہیں۔

اس خیال کا دِل میں پیدا ہونا تھا کہ طرح طرح کی تدبیریں شروع ہوگئیں۔

ہر ایک نے بخیال خود ایک تدبیر نکالی کسی نے ناکدخدا لڑکی کو سنگ پارس ٹھہرایا۔ کسی نے خون کو کسی نے بالوں کو کسی نے انڈے کو کسی نے سنکھیا کو۔

غرض بہرصورت ایک ایسا مادہ ٹھہرایا گیا جو استحالہ کا ذریعہ ہو سکے اور انہیں مادوں سے اکسیر بنانے لگے۔ بھٹی اور دھونکنی درست ہوئی اور

کتنی باتیں محل آئیں۔ مگر کوئی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت لامتناہی ہے اور اس کی حکمت کے کُنہ تک پہنچنا ہمارے ادراک اور فہم سے بالاتر ہے۔ سچ کہا ہے ؎

توان در بلاغت بہ سحبان رسید ۔ نہ در کُنہِ بیچون سُبحان رسید

اے خدائے جلّ شانہٗ۔ تیری عظمت و سطوت کے جلوے اور تیری قدرتِ کاملہ کے کرشمے ذرّے ذرّے سے ظاہر ہیں۔ ہماری آنکھیں خود روشن نہیں کہ اُنہیں دیکھ سکیں۔ بیشک اُنکو دیکھکر بڑے بڑے دانا اور عقلمند لوگ بھی تیری صنعت اور حکمت کا اعتراف دل سے کرتے ہیں اور گمراہ ان سے واقف ہوکر تیرے جلال اور ہیبت سے ڈر کر راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ تحقیق اِنہیں نشانیاں ہیں ایمان لانیوالوں کیلئے۔

سیّد محمد فاروق

ہمارے لئے پھر صاف کر دیتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے بقائے حیات کے لئے درختوں اور پودوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ سائنس کے محققین نے اس مسئلہ کو بالخصوص آئینے کی طرح صاف کرکے دکھا دیا ہے۔ چنانچہ اگر شیشے کے ایک مجوف گولے میں کسی چھوٹے سے جانور کا بچہ اور کوئی ننھا سا پودا رکھ کر اُس کو اس طریقے سے بند کر دیں کہ اُس میں ہوا نہ جاسکے تو مذکورہ بالا اصول پر دونوں زندہ رہینگے اور نشو و نما پاتے رہینگے۔ جاندار بچہ جو غلیظ ہوا اپنے جسم سے نکالیگا اُسے پودا پھر صاف کر دیگا اور اس طرح ان دونوں کے قائم اور زندہ رہنے کے اسباب مہیا رہینگے۔

اس جگہ مختصراً یہ بتانے کی بھی ضرورت ہو کہ "کاربانک ایسڈ گیس" کی تحلیل نباتات صرف اسی حالت میں کرسکتے ہیں۔ جبکہ آفتاب کی شعاعیں اُس پر پڑ رہی ہوں۔ اس مسئلہ کی تحقیقات میں ڈاکٹر ولیم ڈریپر[1] نے نہایت کوشش و جانفشانی سے کامیابی حاصل کی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ "تحلیل" کے لئے شعاع بنفشی[2] کارآمد ہے۔ لیکن ولیم ڈریپر نے عملی تجربات و مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ عام خیال بالکل غلط تھا۔ بلکہ فی الحقیقت اس کیمیاوی عمل میں درختوں کی مدد و معاون شعاع اصفری ہے۔

اب آپ غور کریں کہ ایک معمولی سے مسئلہ کی تحقیقات میں شاخ در شاخ

---

[1] ڈاکٹر موصوف ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوا ۱۸۳۲ء میں عازم امریکہ ہوا اور ۱۸۳۶ء میں پنسلوینیا یونیورسٹی سے ایم۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر موصوف کی علمی تصانیف نہایت مستند و معتبر خیال کیجاتی ہیں۔

[2] نور یا روشنی سات قسم کی شعاعوں سے مرکب ہے۔ بنفشی۔ سُرمئی۔ ازرقی۔ اخضری۔ اصفری۔ نارنجی۔ احمری۔ اگر کسی شیشے کے چوپہل ٹکڑے کو آفتاب کی شعاع کے مقابل کرکے دیکھا جائے تو اس کے عکس میں کئی قسم کے رنگ پیدا ہوتے ہیں +

اور پانی کے بغیر بھی کچھ مدت تک اُس کا رشتہ حیات قایم رہ سکتا ہی لیکن اگر اُسے صاف اور تازہ ہَوا ایک منٹ کے لئے بھی نہ ملے تو اُس کی زندگی غیر ممکن ہے۔ اِسی واسطے ہَوا کو سب سے زیادہ کار آمد عطیۂ قدرت خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہَوا جب انسان کے جسم میں جاکر واپس آتی ہے تو کثیف ہوکر آتی ہے۔ اب اگر اسی کثیف ہَوا کو آدمی بار بار استعمال کرے تو اس سے بجائے فائدہ کے ضرر پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اِس لئے یہ ضروری ہُوا کہ اِس کثیف ہَوا کی صفائی کا کوئی معقول اِنتظام ہو۔ اور یہ اِنتظام قدرتاً درختوں کے تفویض ہُوا ہے۔ اور چونکہ اس اِنتظام کے بخوش اسلوبی انجام پانے پر خود درختوں کو فائدہ ہے اِس لئے اُن کے جانب سے ادائے فرائض میں کبھی کسی قسم کی سُستی اور کاہلی عمل میں نہیں آتی۔ اور انسانی اور نباتاتی طبقہ امداد باہمی کے اصُول پر ایک دُوسرے کے لئے اضطراری طور پر اپنا مفوضہ کام کیا کرتا ہے۔

"آکسیجن وُہ عنصر ہے جو آدمی سانس کے ذریعہ اپنے جسم کے اندر لیجاتا ہے۔ وہاں سے آکسیجن کاربن کے ساتھ ملکر کاربانک ایسڈ گیاس" کی شکل میں نکلتا ہے۔ اور کاربن وُہ جزو ہے جس پر نباتات کی نشو ونما کا انحصار ہے۔ لہٰذا قدرت کی تعلیم سے درخت آفتاب کی روشنی میں کاربانک ایسڈ گیاس کو جو انسان سانس کے ذریعہ باہر نکالتا ہے اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور اُسے تحلیل کرکے کاربن اپنے لئے رکھکر آکسیجن کو صاف وشفاف حالت میں خارج کردیتے ہیں۔ گویا کہ اُسے پھر اس قابل بنادیتے ہیں کہ انسان اس کا اِستعمال بلا کسی خوف کے کرسکے۔ غرضکہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ اسی طرح سے جاری رہتا ہے کہ ہم سانس لیکر ہَوا کو غلیظ کرتے ہیں اور بیچارے درخت اُسے

حضرتِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے "برگِ درختانِ سبز" والے تجربہ سے بہت مشابہ ہے۔ لیکن ابھی شاید بہت کم لوگ کیمسٹری کے دعوے کو تسلیم کریں۔ تاہم تفصیلی حالات معلوم ہو جانے پر انہیں معلوم ہوگا کہ دُنیاوی اسٹیج پر یہ کٹ پتلیاں (درخت) کیا کچھ اہم پارٹ انجام دیتی ہیں اور انسانی طبقہ کو اُن کی ذات سے کسقدر فائدہ پہنچتا ہے۔

بادی النظر میں اِس سے کسی کو انکار نہیں کہ انسانی سوسائٹی کی ضروریات زندگی لکڑی سے بہت کچھ نکلی ہیں۔ لکڑی فطرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس نے ہمارے مہذب و متمدن بنانے میں بڑی مدد دی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اِس کی وجہ سے ہم کو بہت آرام و آسائش پہنچی ہے۔ لیکن صرف اسی قدر اُمور بنی نوع اِنسان کو درختوں کا زیربار احسان نہیں بنا سکتے۔ دُنیا کی تمام چیزیں اِنسان کے لئے ذریعہ راحت و آرام ہیں۔ پھر درختوں کی کیا تخصیص ہے جو انکو چار چاند لگائے جاتے ہیں۔ درحقیقت درخت کچھ اَور ہی فائدہ پہنچاتے ہیں جو حیوانات اور جمادات سے ممکن نہیں۔ اور وُہ فائدہ یہ ہے کہ صاف و شفاف ہَوا جس کے اوپر حیوانات کی زندگی منحصر ہے۔ درختوں کے ذریعہ ہم پہنچتی ہے۔ ورنہ اگر درخت اس خدمت کو انجام نہ دیتے تو صفحۂ دُنیا پر جسقدر ہَوا ہوتی وُہ جانداروں کے سانس پینے کے سبب سے غلیظ ہوتے ہوتے بالکل بیکار ہو جاتی اور اس کے زہریلے اثر سے سخت نقصان پہنچتے۔ اِس مسئلہ کو ہم کسیقدر وضاحت سے بیان کرتے ہیں تاکہ ناظرین اس کو پُورے طور پر ذہن نشین کر سکیں۔

انسانی زندگی کے برقرار رکھنے کے لئے ہَوا کی جس قدر ضرورت ہے وُہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بلا غذا کے آدمی ایک عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے

سونا بنا دیتی ہے۔ تاہم کیمسٹری کے پُرمفاد وجود سے جو نفع انسانی سوسائٹی
کو حاصل ہے وُہ سونا اور چاندی بنانے سے کہیں افضل ہے۔ اگر کیمیاوی
تغیرات دُنیا میں برابر اور اپنے وقت پر نہ ہوتے رہیں تو دُنیا کے بہت
سے کاموں میں ہرج واقع ہوجائے اور انسانی طبقہ کی زندگی دشوار ہوجائے۔ ہم
اس وقت صرف ایک معمولی مسئلے کو اُردو دان اہلِ مُلک کی خدمت میں پیش
کرتے ہیں۔ کیمسٹری کا شاید یہ پہلا ہی سبق ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں جن
اصحاب کو سائنس کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ اُن کے لئے مندرجہ ذیل بیان
دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"انسانی زندگی کا مدار کس چیز پر ہے"؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اکثر احباب
بے معنی خیال کرینگے کیونکہ بنی نوع آدم بلکہ کل ذی رُوح ہستیوں کو حیات و ممات
کے معاملے میں براہِ راست خدائے واحد سے تعلق ہے۔ وُہ جسکو چاہے پیدا
کرے اور جس کو چاہے فنا کر دے۔ اس میں کسی کو ذرا دخل نہیں۔ اس سے
کسی کو انکار نہیں ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک نے زندگی اور موت اپنے
حیطہ اختیار میں رکھی ہے لیکن دُنیا کو اس نے عالمِ اسباب قرار دیکر یہاں
اس قسم کے سامان بہم پہنچائے ہیں کہ اُس کی مخلوق ایک دُوسرے کی امداد و
اعانت سے نشو و نما پاسکے اور اپنی زندگی کی مقررہ مدت پُوری کرسکے۔ لہٰذا
اس سوال کی تفصیل یُوں ہوسکتی ہے کہ وُہ کونسا ذریعہ ہے جس سے ذی رُوح
مخلوق اپنی مقررہ زندگی کے دن پورے کرسکتی ہے۔ اور اگر وُہ ذریعہ مفقود
ہوجائے تو انسان کے لئے جینا محال ہو؟

اس سوال کے حل کرنے میں ہم کو کیمسٹری کی امداد ضروری ہے۔ کیمسٹری کا
دعویٰ ہے کہ "انسانی زندگی کا انحصار درختوں پر ہے"۔ کیمسٹری کا یہ انکشاف

مسائل پر عبور کرتے جائینگے۔ اُسی قدر قدرت کے رموز ہم پر روشن ہوتے جائینگے۔ اور جس وقت ہم سائنس کی امداد سے نیچر کے عجیب و غریب بھیدوں سے واقف ہوجائینگے اس وقت ہمارے دل پر اُس خالقِ برحق کی عظمت و شوکت کا سکہ بخوبی بیٹھ جائیگا۔ جو اس وسیع عالم کا بنانے والا ہے اور جو اپنی دانش و حکمت کے زور سے یہاں کے کاروبار کو اس طرح سے چلا رہا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند دیکھکر متحیّر ہوجاتے ہیں۔ قدرت کے سربستہ رازوں پر کافی عبور حاصل کرنا تو انسانی طاقت سے باہر ہے اور یقیناً ہمیشہ باہر رہیگا۔ لیکن سائنس کے انکشافات میں بھی ہم ایسے کوتاہ نظروں کے لئے کچھ کم باعث دلچسپی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دخل دینے کا دعویٰ سائنس نے فی نفسہٖ کبھی نہیں کیا اور نہ اُسکا مُنہ تھا کہ حقیقت و معرفت کے پیچیدہ اور دشوار گذار مرحلوں کے طے کرنیکا حوصلہ کرتا۔ تاہم جن معمولی مسائل پر بھی سائنس نے روشنی ڈالی ہے وُہ ہماری نظروں کے سامنے نہایت دلاویز پیرایہ میں پیش کئے گئے ہیں۔ اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامّل نہیں کہ سائنس کی معمولی سے معمولی بات بھی "دفترِ معرفت" کا ایک ورق" ہونے کی حیثیت سے اس قابل ہو کہ ہم اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور دیکھیں کہ وُہ اپنی بساط کے اندر رہکر کیسی پتے کی بات بتاتی ہے۔

سائنس کے دربار میں "کیمسٹری" گوشہ نشین پر جگہ ملی ہے۔ یہ کیمسٹری مشرقی دنیا میں کچھ اجنبی نہیں بلکہ ہمارے خام خیال ہوسوں کی بدولت ہندوستان کا پُرانے سے پُرانا شخص بھی اس سے ناواقف نہوگا۔ کیمسٹری کہو خواہ کیمیا ایک ہی بات ہے۔ دُنیا کی مشینری کے چلانے میں کیمسٹری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس کہنے سے یہ مطلب نہیں کہ معمولی اسفل دھاتوں کو وُہ ایک دو تاؤ سے چاندی اور

کرشمۂ سائنس

معبودِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا ظہور شجر حجر سے نمایاں ہے۔ صرف دیکھنے والے کی ضرورت ہے۔ دُنیا کا یہ عظیم الشّان کارخانہ بجائے خود اس حکیم علی الاطلاق کی حکمتِ بالغہ کا روشن ثبوت ہی۔ شیراز کے حقیقت شناس شاعر نے خدا جانے "برگِ درختانِ سبز" میں کیا اسرارِ قدرت دیکھے کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا کہ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

جو جلوے بلبلِ شیراز نے ایک پتّے میں دیکھے ممکن ہے کہ ہم اُنہیں محسوس نہ کر سکیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے گرد و پیش ہزاروں۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں قسم کی اشیاء ایسی موجود ہیں کہ اگر ہم اُن کے متعلق غور کریں تو خلاقِ عالم کی صنعت و قدرت کے دل ہی دل میں قایل ہو جائیں۔ موجودہ زمانہ میں غریب سائنس بہت ہی بدنام ہے اور سطحی نظر والوں کے نزدیک وہ گویا مذہبی [illegible] ناقص [illegible] اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ ہم جس قدر سائنس کے

دسمبر ۱۹۱۰ء
ایڈیٹر شیخ عبد القادر بی اے
جلد ۲۰ نمبر (۳)

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام شیخ عبد الحق عالمگیر پریس لاہور میں چھپا اور شوق صاحب سپرنٹنڈنٹ نے شائع کیا

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم دوم ۴ فی پرچہ ساڑھے تین آنے ۳۔

ہندوستانی دواخانہ کی جدید فہرست ادویات

تیار ہے

اس فہرست سے اس کارخانہ کی کُل پہلی فہرستیں جو یونانی اینڈ ویدک لمیٹڈ کمپنی یا ہندوستانی دواخانہ کے نام سے شائع ہوئی ہیں منسوخ ہو کر یکم نومبر ۱۹۱۰ء سے ہر ایک دوا کی جدید فہرست کے مطابق قیمت وصول کیجائے گی۔ کُل ادویات کی پڑتال ہونے کے بعد از سر نو قیمتیں مقرر کیگئی ہیں اور اسّی فیصدی ادویات کی قیمتوں میں تخفیف کیگئی ہے۔ سابقہ فہرستوں کا کوئی مطالبہ یکم نومبر ۱۹۱۰ء کے بعد قبول نہ کیا جائیگا۔ جدید فہرست جو حقیقتاً ایک مفید طبی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور سوا سو صفحہ کی کتاب ہے مفت پیش کیجاتی ہے۔

ملنے کا پتہ

منیجر ہندوستانی دواخانہ۔ دہلی

(از میر جالب صاحب دہلوی)

جاتی نہیں جب آ گئی شامت کو کیا ہوا! کٹتی نہیں ہے۔ اس شب فرقت کو کیا ہوا!
شوخی نے دخل پا کے کہا چشم یار میں کس جا گیا حجاب مروت کو کیا ہوا!
اے برق حسن یار سنبھلنے تو دے ذرا مطلق سکت نہیں مری طاقت کو کیا ہوا!
ہم کو تو مدعا ہے فقط دید یار سے خلوت ہیں بار گر نہیں جلوت کو کیا ہوا!
ویرانی چھا گئی مری تربت پہ کس لئے ارماں مرے کدھر گئے حسرت کو کیا ہوا!

دہلی کے ساتھ حضرت جالب چھٹی غزل
کچھ کند ہو چلی ہے طبیعت کو کیا ہوا!

(از جناب بسمل دہلوی)

کوئی لقمہ جو کبھی ہم کو میسر آیا ساتھ ہی دانت کے نیچے کوئی کنکر آیا
کھو کے عزت کو جو گوہر [illegible] میسر آیا [illegible] سے گوہر [illegible] پتھر آیا
جامہ حسن ہر [illegible] سے نہیں سلوٹ ہے نہ جھول [illegible] قد کے برابر آیا
منہ لگائے کوئی [illegible] آبرو انسان کی کیا [illegible] کے لب تک کبھی جھنا لی کوئی ساغر آیا
شرق سے غرب کو تیرا جو اشارا پایا سورج آیا ہے اور کانپتا تھرتھرا آیا
عیش و عشرت نہ سہی رنج و مصیبت ہی سہی شکر کوئی تو رفیق اپنا بھی بن کر آیا
عجب و نخوت سہی تو اس شوخ کے یہ ہیں عجب کہ کسی کے وہ تصور میں ہی کیونکر آیا
کل بھرے تھے جو مکاں دیکھ کے خالی ہیں آج آنکھ بھر آئے نہ کیوں جی ہی مرا بھر آیا

اضطراب دل بسمل کی اگر چاہے ہے سیر
اتنا کہدے کوئی لے وہ ترا دلبر آیا
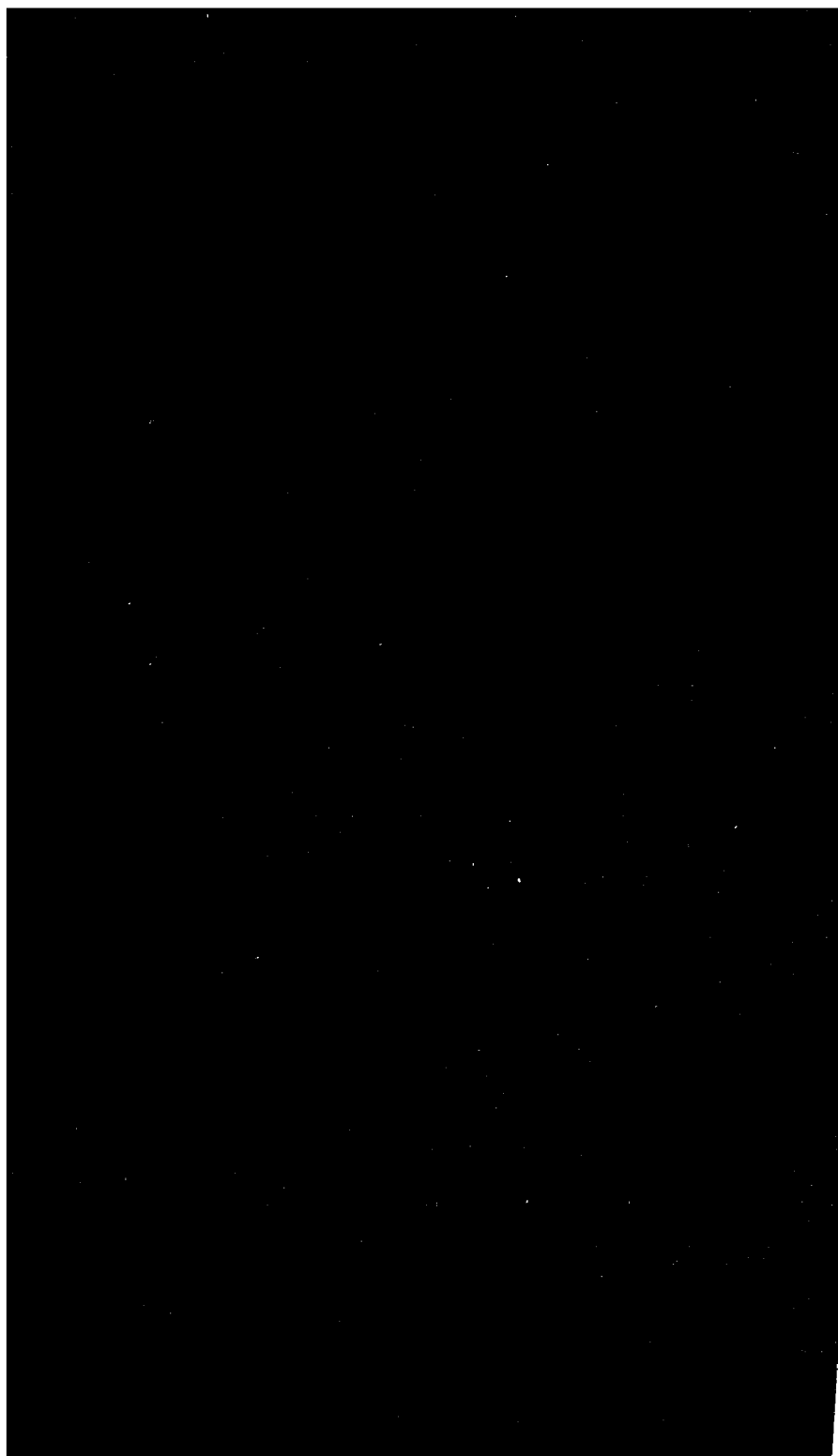
(از میر ولایت علی صاحب فرد[illegible]س)

انفعالِ معصیت مدِ نظر ہونیکو ہے
آفسو[illegible]وں سے نامۂ اعمال تر ہونیکو ہے

ہے انہیں رونکس یاس میں ہر اہلِ درد
دیکھ کر ہو[illegible]نیلوں کی خشکی چشم تر ہونیکو ہے

مجھ سے مجنوں سے نہیں کچھ فرق وحشت میں مگر
طائروں کا آشیاں [illegible] بالائے سر ہونیکو ہے

ہجر میں دیکھوں تو کس کس رنگ میں آتی ہے آنکھ
خونِ دل ہونے کو ہے پانی [illegible] جگر ہونیکو ہے

(از جناب مولوی محمد عبد الاحد صاحب شمشاد لکھنوی)

تم ہی کو دل دیکے میں بیدل ہوا رسوا ہوا
پھر مجھی سے پوچھتے ہو دل تمہارا کیا ہوا

یہ سمجھنا چاہئے سب کو کہ میں اس کا ہوا
یہ غلط سمجھے ہیں وہ نا آشنا اپنا ہوا

وہ پھرا مجھ سے تو اب ساری خدائی پھر گئی
ایک عالم وہ بھی تھا میرے ہی جو چاہا ہوا

سچ ہے استغنا زمانے میں عجب اکسیر ہے
خاک کا ہر ذرہ میرے واسطے سونا ہوا

ظلمتِ عصیاں تھی مثلِ تیرہ شب چھائی ہوئی
خوابِ غفلت سی سارے چونکتے تڑکا ہوا

دیکھئے کیا رنگ لائی ہے مری دل کی تڑپ
ہاتھ میرے قلب پر رکھکر انہیں دھڑکا ہوا

تیرے رخساروں کا جلوہ تھا عیاں ہر گل پہ سحر
بے سبب کب بلبلوں کا باغ میں غوغا ہوا

ایک دن خلدِ بریں میں پائینگے رفعت ضرور
سرنگوں ہونگی ندامت سے اگر نیچا ہوا

رہ گئیں بے سود سب تدبیریں اچھے کام کی
ہاں برائی سے مرے دل میں جو کچھ آیا ہوا

جس پہ استغنا کی تھوڑی سی توجہ ہوگئی
اپنے بیگانوں سے وہ دم بھر میں بے پروا ہوا

غیر سے ممکن نہ تھا کچھ پیرِ کنعاں کا علاج
اپنے ہی نورِ نظر سے آپ جب اندھا ہوا

میں ہوں شمشاد رواں تم لالہ رو غنچہ دہن
میں اگر شیدا ہوا تم پر تو کیا بیجا ہوا

تری گلی میں ہو مدفن یہ شوق ہے دل میں
نہ ہو مزار مرا تیرے آستاں سے الگ

چمن میں تجھ سے جو ہے ظلم کا یقین صیاد
تو فصلِ گل میں بھی بلبل ہے آشیاں سے الگ

مسافرانِ عدم پہنچے اپنی منزل پر
ہمیں ہیں آج تلک اپنے کارواں سے الگ

بہار میں گل و بلبل پہ سخت آفت ہے
غمِ خزاں سے الگ دستِ باغباں سے الگ

اُسی کے حسن و ادا پر رہی جو محویت
خیالِ یار نے رکھا ہمیں جہاں سے الگ

یہ حال قیس تھا گذری جو تجھ سے لیلیٰ
کبھی تھا ساتھ کبھی محملِ رواں سے الگ

وُہ قافلہ میں ہے اور میں غریب تنہا ہوں
فغاں جرس کی ہے کوسوں مری فغاں سے الگ

فنا کے بعد توقع ہے یہ صبا سے مجھے
رہے نہ خاک مری اُس کے آستاں سے الگ

ہمارا شیشۂ دل ان بتوں نے چور کیا
ستم ہے اپنے الگ سنگِ امتحاں سے الگ

ہزاروں طالبِ دیدار مٹ کے خاک ہوئے
ہوئی نقاب نہ اُس روئے دلستاں سے الگ

کھلی نہ کچھ خبر راہِ عشق و راہِ عدم
کہ دونوں ایک کہاں تک ہیں اور کہاں سے الگ

یہی دعا سحر و شام اپنی ہے امداد
سرِ نیاز نہ ہو اُسکے آستاں سے الگ

(از جناب حفیظ جونپوری)

محشر کی باز پرس سے جی بے ہراس ہے
مجھ روسیاہ کو تری رحمت کی آس ہے

اُمید وُہ عدو کی جو پوری ہی ہو رہے
بندھ کر جو ٹوٹ جائے ہماری وہ آس ہے

ساغر پہ ہے وُہ روپ وہ مے میں آب و تاب
ساقی جو اُٹھ گیا ہے تو محفل اُداس ہے

دیکھا تو رنگ و بو کا یونہیں سا ہے کچھ بناؤ
غنچے کی کچھ گرہ میں نہ کچھ گل کے پاس ہے

اک چھیڑ ہے یہ میرے کڑھانے کے واسطے
بشاش ہو کے پوچھنا تو کیوں اُداس ہے

جنسِ وفا خرید کے ناداں ہے بوالہوس
اسکی خبر نہیں کہ وُہ جوہر شناس ہے

چند ہی روز میں پھر پہنے عنب مُنہ کو لگی ۔ پورٹ وائن کو سمجھنے لگے آبِ زم زم

اسی عرصہ میں کہیں آ گئے اُنکے والد ۔ پاس بٹھلا کے کہا لڑکے سے اے لختِ دلم
مُنہ ذرا سا نکل آیا ہے تمہارا کیسا ۔ "اتنی محنت نہ کرو پڑھنے پہ نورِ نظرم
خیر اچھا یہ بتاؤ تو پڑھا کیا تم نے؟ ۔ ہو ترقی سے تمہاری دلِ محزون خُرّم"
پہلے کچھ دیر تو شرماتے رہے پھر بولے ۔ "آبا جان! آپ نہ پوچھیں یہی از راہِ کرم
"پڑھ چکا ہُوں بھی مسلمانوں کے بچوں کی طرح ۔ جاؤ کا ترجمہ "گو" "آؤ" کی انگریزی "کم"
اس سے زائد کی ضرورت بھی نہیں ہے فی الحال ۔ "اک مسلمان کے بچے کو یہی ہے کیا کم"
"سچ تو یہ ہے کہ بس اب ورد زباں ہیں وہ شعر ۔ حضرتِ خواجہ حافظ نے کئے ہیں جو رقم"

"فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم
نیست بر لوحِ دلم جز الفِ قامتِ یار
چکنم حرفِ دگر یاد نداد استادم"

ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید

تازہ غزلیں

(از جناب امداد صاحب)

جُدا ہیں تجھ سے نہیں تیرے آستاں سے الگ ۔ ترے فقیر اگر ہیں تو اس جہاں سے الگ
خزاں میں بھی نہ ہُوئی صحنِ بوستاں سے الگ ۔ بھلا بہار میں بلبل ہو آشیاں سے الگ
بلا کے گھر میں نہ کی اُس نے بات تک مجھ سے ۔ وُہ میزبان رہا اپنے میہماں سے الگ

کہو تو اشک ہیں چشمِ زار و حیراں سے — خنک ہیں یہ وہ دیدارِ رُوئے تاباں سے
بلا سے گر نہ ہوں آنکھیں کہو تو دل رو دے — تمہارے حکم پہ لیکن سرِ نیاز جھکے

کہو تو حسرت و ارماں کی زندگی کاٹوں — کہو تو سرو کے سائے میں آہ سرد بھروں
جو حکمِ موت ہو دم بھر میں خاک ہو جاؤں — ذرا بھی پاؤں اشارا تو نقدِ جاں دیدوں

تو میری جان ہے پیاری ہے دل کا ارماں ہے — سرورِ چشم ہے غارتگرِ دل و جاں ہے

احمد شجاع

مُسلمان صاحبزادے

عمر کا سال ہوا ختم سے جب شانزدہم — رفتہ رفتہ ہوا اسکول کا جانا کچھ کم
کُتب درسیہ بنتی چلیں دیمک کی غذا — دل کو بھانے لگا ناول۔ وُہی افسانۂ غم
[illegible] ہوا کارِ فضول — طبعِ نازک کو کیا جا گرفتی نے برہم
نقشۂ ملکوں کے ٹنگے [illegible] — کھو لئے کی جنہیں اک عرصے سے کھائی ہے قسم
میز پڑھنے کی جو تھی اس کی یہ آرائش ہے — ایک ٹوٹی سی دوات، ایک پُرانا سا قلم
شکلِ اُستاد سے ہوتی چلی نفرت دل کو — بدمعاشوں کو بصد شوق بنایا ہمدم
کھیل اسکول کے ایک آنکھ نہیں بھاتے اب — شغل گنجفہ شطرنج ہے جاری ہر دم
ناموافق ہوئی آبادی سے باہر کی ہوا — چاندنی چوک کی گلگشت کا آیا موسم
شام کی داک کو اب ٹھنڈی سڑک کر دی ہے — چلے با جمعِ احباب سُوئے کوئے صنم
خط جو آیا بھی والد کا تو نوکر سے کہا — ابھی فرصت نہیں رکھو اسے پھر دیکھینگے ہم
صحبتِ ماہ جبیناں ہے کہاں صوم و صلوٰۃ — اب نہ دنیا کی رہی شرم نہ عقبیٰ ہی کا غم

قبولِ درگہِ ربِّ غفور آتے ہیں
اُٹھو اُٹھو کہ ہمارے حضور آتے ہیں

صدائیں دیتے ہیں یہ حاملانِ عرشِ الٰہ کہ ہے یہ محفلِ میلادِ سرورِ ذی جاہ
وُہ کون جنکی حکومت میں ہر سپید و سیاہ وُہ کون خلق کے سرداروں کے پُشت و پناہ
وُہ کون جنکے اشارے یہ نخل چلتے ہیں
وُہ کون جنکے تکلم سے دل پگھلتے ہیں

محمد سیف الدین شتاب

محبت نامۂ نپولین

بہادر نپولین جو قتل و غارت کو ایک ادنیٰ کھیل سمجھتا تھا۔ محبت سے مغلوب ہے۔ اپنی دلربا جوزافائن کی خدمت میں اپنا بے نظیر دل پیش کر رہا ہے۔ رضاجوئی اور تسلیم اسے کہتے ہیں۔ جوزافائن وہی ہے جو بعد کو اُسکی مشہور ملکہ ہوئی:۔ (احمد شجاع)

تمہارا ہو کے رہوں گر مجھے اجازت ہو کہو تو زندہ رہوں میں نثار ہونیکو
کہو تو تم سے محبت کروں تمہیں چاہوں دلِ اسیرِ محبت تمہاری نذر کروں
وہ دل جو صاف ہو۔ پیارا ہو۔ مہربان دل ہو تمہاری دید کا مشتاق تم پہ مائل ہو
زمانے بھر میں جو ڈھونڈو ملے نہ ایسی شے وہ دل تمہارے لئے میری جان حاضر ہے
تمہارا حکم جو اس دل کو ہو کہ مر جائے تو نکلے وُہ زیست سے فوراً وہیں گذر جائے
خوشی فنا میں جو پائے ابھی فنا ہو جائے کسی طرح اسے حاصل تری رضا ہو جائے

صُبحِ ازل

شفق ہے پھُولی فلک پر کہ لالہ زارِ سحر کچھ اَور رنگ دکھلانے لگی بہارِ سحر
ہے نُور بار زمانے میں آبشارِ سحر جبینِ حوُر کی طلعت ہے خود نثارِ سحر

جو ذرّہ یاں کا ہے مہرِ سپہرِ خوبی ہے
اب آسمان سے کُرسی زمیں کی اُونچی ہے

نکھار پر ہے حسینانِ باغ کا جوبن ہر ایک شاخِ گُل تربنی ہُوئی ہے دُلہن
ہے عطر بیز ہر ایک سو نسیم کا دامن مثالِ باغ مہکتے ہیں اس سمے سلے بن

ہَوا کے جھونکے جدھر لیکے بو یہ بڑھتے ہیں
چٹک کے غنچے چمن میں درود پڑھتے ہیں

زباں پہ شور کہ ہے رحمتِ خدا کا نزول لبِ دُعا کی طرح وا ہُوئے ہیں بابِ قبول
چمن میں پھُولے سماتے نہیں خوشی سے پھُول ہوئے ہیں صورتِ گُل باغ باغ قلبِ ملول

نثار حور کا گیسو ہے سنبلِ تر پر
زمیں کے حُسن کی ہے دھوم چرخِ اخضر پر

فرشتے جمع ہیں ہر سو پرے جمائے ہوئے کھڑے ادب سے ہیں سر اپنا سب جھکائے ہوئے
نظر میں شوق تو ارمان دل پہ چھائے ہوئے کسی کی شمعِ محبت سے لَو لگائے ہوئے

یہ عشق ہے۔ ہمہ تن قلب اضطرار میں ہیں
کہ ہر نگاہ سے پیدا کہ انتظار میں ہیں

کھڑی ہیں حورِ جناں اِک طرف بناؤ کئے پڑے ہیں ہاتوں میں جنّت کے پھُول کے گجرے
بتا رہے ہیں اشارے نشیلی آنکھوں کے خُدا کا شکر کہ اب دو جہاں کے دن ہیں پھرے

جتنی مخلوق ہے سب زیرِ اثر رہتی ہے اتنے گھمسان میں کیڑوں کی خبر رہتی ہے
اُس کی مرضی ہو کسی میں جو کسر رہتی ہے جڑ تنہ شاخ کے ریشوں پہ نظر رہتی ہے

اس کی قدرت سے شجر نشو و نما پاتے ہیں
خشک لکڑی سے بھی پھل پھول نکل آتے ہیں

بوٹیاں جتنی یہ اقسام نباتات سے ہیں معدن و کوہ یہ جتنے بھی جمادات سے ہیں
گرچہ وابستہ و معذور ہر اک بات سے ہیں رزق اپنی جگہ پاتے یہ اسی ہات سے ہیں

اپنی ہستی پہ وہ احمق ہے جسے غرہ ہے
اُس کے آگے تو یہ خورشید بھی اک ذرہ ہے

وہ خدائی کے جز و کل پہ نظر رکھتا ہے سرو شمشاد و سنبل پہ نظر رکھتا ہے
پرِ قمری دلِ بلبل پہ نظر رکھتا ہے انتہا ہے کہ رگِ گل پہ نظر رکھتا ہے

پھول میں حسن تو کانٹوں میں خلش اسکی ہے
چاند میں خنکی تو سورج میں تپش اسکی ہے

جب سرِ شاخ پہ لب بند کلی آتی ہے [illegible] ہے
اوٹ میں پتوں کی نازوں سے پلی آتی ہے روزی پاتال سے اسکی چلی آتی ہے

راز سربستہ ہیں غنچوں کی طرح کھلتے ہیں
پتے ہلتے نہیں یہ دستِ دعا ملتے ہیں

اسکو ہر پردے میں ہر شے ہے دکھائی دیتی شبِ دیجور میں کیڑی ہے سجھائی دیتی
قدمِ مور کی آہٹ ہے سنائی دیتی جوگی اب چپ کہ نہیں طبع رسائی دیتی

نور سے اُسکے ہی آنکھوں نے ضیا پائی ہے
اپنی قدرت کا وہ خود آپ تماشائی ہے

جوگی جی دکنی

آسماں پر ابر اندھیری رات میں چھایا ہوا ۔۔۔ چاند کا چھپنا، نکلنا، دل کو دیتا ہے مزا
ٹھنڈی ٹھنڈی چار جانب سنسناتی ہے ہوا ۔۔۔ دور تک جاتی ہے سناٹے میں نغموں کی صدا

اپنے اپنے رنگ میں سب اہلِ محفل مست ہیں
نخلِ گل پر پہلوئے گل میں عنادل مست ہیں

آج اہلِ امتیازِ دین و ملت کفر ہے ۔۔۔ جس میں ہو تفریقِ انساں وہ شریعت کفر ہے
ناصحِ مشفق کی ایسے میں نصیحت کفر ہے ۔۔۔ شرع کی رو سے بھی ہمسایوں سے نفرت کفر ہے

یکدلی کا دور ہو ہندو مسلماں ایک ہوں
متحد اغراض ہوں اجزائے ایماں ایک ہوں

نظر لکھنوی

میرا ربّ

ہندوؤں کا ہے خدا اور نہ مسلمانوں کا ۔۔۔ نہ یہودوں کا مجوسوں کا کرسٹانوں کا
پاس سکھوں کا اسے ہے نہ کچھ افغانوں کا ۔۔۔ وہ تو داتا ہے ہر اک قوم کے انسانوں کا

جس نے پیدا کیا ہے لاج اسی کو سب کی
"پالنا سب کو" یہ تعریف ہے میرے رب کی

فرق اعزاز کا معدوم ہے اس کے در پر ۔۔۔ کوئی بلبل ہو کر ہو بوم۔ ہے اسکے در پر
خوانِ نعما ہے بچھا عموم ہے اس کے در پر ۔۔۔ ایک سفرے پہ سخی شوم ہے اسکے در پر

میز کرسی پہ مٹن چاپ کوئی کھاتا ہے
خاک پہ بیٹھ کے روٹی کوئی چھکتا ہے

میکشوں کے جمگھٹوں سے اک جہاں پُرشور ہے

لیکے بربط نکلی ہے سلما بھی اپنی قبر سے باہر آئی جھوم کر لیلا بھی اپنی قبر سے
نکلے ہیں جمشید بھی دارا بھی اپنی قبر سے اور سکندر سا جہاں پیما بھی اپنی قبر سے

اُٹھ کے بیٹھا ہے جہانگیر شہِ رنگیں مزاج
بزمِ کہنہ از سرِ نو منعقد ہوتی ہے آج

جامِ جم نکلے زمیں سے بعد مدت اے مغاں انجمن کی دھوم ہو جائے میانِ دو جہاں
اہتمامِ بزم اے ساقی ہو با صد عز و شاں کان میں آئے نہ اب مذکور فریاد و فغاں

بزم میں شاہنشہانِ ہفت کشور آئیں گے
نازنینانِ پریوش حور پیکر آئیں گے

جلوہ گر ہوں ایک جانب آج محمود و ایاز بعد مدت کچھ کھُلے کیفیتِ راز و نیاز
ہو نہ کچھ شاہ و گدا میں آج فرق و امتیاز ابرِ رحمت سر پہ چھایا ہے درِ جنت ہے باز

جامِ زرّیں ہیں لبالب بادۂ گلرنگ سے
گونج اُٹھی بزم آوازِ رباب و چنگ سے

مستیاں پیدا ہیں گلشن کے در و دیوار سے لغزشِ پا کا مزا پوچھے کوئی میخوار سے
ٹپکی پڑتی ہے جوانی پھول کی ہر خار سے اک سماں ہے نغمہ ہائے عندلیبِ زار سے

سازِ ہستی بج رہا ہے ابر کی رفتار پر
دوڑتے ہیں نغمۂ دلکش ہوا کے تار پر

ابر میں مہ ہے چراغِ زیرِ داماں کی طرح دھیمی دھیمی روشنی ہے داغِ پنہاں کی طرح
جلوہ گر پردے میں ہے شمعِ فروزاں کی طرح چاہ میں بیٹھا ہے چھپ کر ماہِ کنعاں کی طرح

جھانک لیتا ہے جو یہ پردہ اُٹھا کر دور سے
دفعتہً معمور ہو جاتی ہے دنیا نور سے

شعور سیکھ۔ تجھے امتیازِ عشق کہاں
کہاں تو۔ لذتِ سوز و گدازِ عشق کہاں

سرور جہان آبادی

ابرِ بہار

جھومتی آتی ہے مغرب سے وہ اک کالی گھٹا — رقص کرتی، راگ گاتی، منتشر زلف رسا
سر سے لیکر پاؤں تک چھائی ہے متوالی ادا — دمبدم طغیانیِ مستی و شورِ نغمہ زا
بھر گئے ارگن ہوا میں ابر کی آواز سے
بزمِ عالم گونج اٹھی نغمہ ہائے راز سے

دامنِ کہسار سے گذری ہے اٹھلاتی ہوئی — دخترِ دوشیزۂ دہقاں کو للچاتی ہوئی
پیچھے پیچھے دوڑتی آتی ہے گھبراتی ہوئی — ہاتھ آ جائے یہ دولت کس طرح جاتی ہوئی
لیجئے کیونکر اسے بڑھ کر کنارِ شوق میں
ہائے کیا ننھا سا دل ہے کس فشارِ شوق میں

بجلیاں دامن میں ہیں شوخی میں اپنی بے نظیر — بنگئی بڑھ کر نقابِ عارضِ مہرِ منیر
جب افق پر جا کے چمکی بادۂ دلپذیر — کھینچدی چمکا کے بجلی ایک سونے کی لکیر
ڈر گئے معشوق جب چمکی یہ بجلی زور سے
ہل گئے سینوں میں دل اس کی کڑک کے شور سے

ہو گیا بیدار عالم آ گئی فصلِ بہار — پڑ گئے باغوں میں جھولے گا رہی ہیں ملار
کھل گئے گلہائے رنگیں لہلہائے سبزہ زار — کوئلوں کی کوک نے ڈالی ہے دنیا میں پکار
بلبلوں کے چہچہوں سے بوستاں پرشور ہے

سمجھ نہ شمع کو دلسوز۔ عاقبت دشمن! جلا کے آہ! رہیگی یہ مشتِ پر تجھ کو
نہیں ہے تو ابھی سوز و گداز کے قابل
نہیں ہے عشق کے عرضِ نیاز کے قابل

تپش یہ بزم میں فانوس پر نہیں اچھی کہ آگ لاگ کی او بیخبر نہیں اچھی
کھڑی ہی آنچ محبت کی۔ شمعِ محفل سے لگا وٹیں ارے نُفتہ جگر نہیں اچھی
تڑپ تڑپ کے نہ دیوانہ وار شمع پہ گر کہ آہ! یہ تپشِ بال و پر نہیں اچھی
یہ جانگدازیِ سوزِ وفا سرِ محفل کہیں نہ ہو ترے جی کا ضرر نہیں اچھی
لڑا نہ شمع سے آنکھیں۔ کہ ہی عدو تیری تری نگاہِ محبت اثر نہیں اچھی
یہ ننھے ننھے پروں کی تڑپ۔ یہ بیتابی حریفِ شوخیِ برقِ نظر نہیں اچھی
ہوائے شوق میں فانوس پر ترا گرنا یہ بیخودی ارے شوریدہ سر نہیں اچھی
چمن میں چل! کہ دکھاؤں ادائے شاہدِ گل
ہیں دلفریب عجب خندہ ہائے شاہدِ گل

پروانہ

مَیں بوالہوس نہیں۔ سمجھا ہی تونے کیا مجھکو پسند شاہدِ گل کی نہیں ادا مجھکو
جنوں نہیں۔ کہ ہو سودائے گل چمن میں مجھو سمجھ نہ اپنی طرح آہ! بیوفا مجھ کو
فراقِ گل میں ہیں چیخوں تری طرح۔ ای وائے! یہ داغ سوزِ جدائی نہ دے خدا مجھکو
دلِ گداختہ لیکر ازل سے آیا ہوں بنایا بزم میں ہے سوز آشنا مجھکو
تڑپ تڑپ کے گروں کیوں نہ شمعِ محفل پر فنائے سوزِ محبت میں ہے بقا مجھکو
جلے وُہ بزم میں چُپ چاپ اور مَیں جلوں بعید عشق سے ہی۔ ہو غمِ فنا مجھکو
تہری نگاہ میں جانسوز ہے۔ جوائی بُلبل! وہ آہ! آگ کا شعلہ ہی جانفزا مجھکو

حفظ کرتا ہے کوئی سلسلۂ مرسومات — یعنی وُہ لفظ جو رہتے ہیں زباں پر اکثر
ہو ہوا کے کوئی کچھ کون یہاں اور وہاں — ایسے ویسے نہیں تم مولوی صاحب مسٹر
الغرض کوشش و محنت کو ہر اک کی آخر بخت — دیکھکر صورتِ آئینہ ہوا میں ششدر
بس زباں سے مرے بیساختہ نکلی یہ دُعا — مشکلیں انکی سب آسان تو کرائے داور
بخش ان سب کو صلے محنت و جانکاہی کے — یا خُدا کھولدے دروازۂ دولت ان پر
یا الٰہی یہ رہیں باغِ جہاں میں سرسبز — یا خدا پائیں یہ سب اپنی ریاضت کا ثمر

جاہ و منصب میں ترقی ہو سدا ان کو حصُول
حال پر ان کے رہے حاکموں کی نیک نظر

سیّد امیر حیدر بخت اکبر آبادی

بُلبُل و پروانہ

بُلبل پروانہ سے

گرا رہا ہے ترا شوق شمع پر تجھکو — مجھے یہ ڈر ہے۔ نہ پہنچے کہیں ضرر تجھ کو
فروغِ شعلہ کہاں۔ اور کہاں تجلّیِ حُسن — ہزار حیف! کہ اتنی نہیں خبر تجھ کو
تڑپ تڑپ کے جو بے اختیار گرتا ہی — نہیں ہی آگ کے شعلے سی آہ! ڈر تجھ کو
یہ ننھے ننھے پر و بال۔ یہ بلا کی تپش — رُلا ہے آہ! قیامت کا کیا جگر تجھ کو
قریب شمع کے آکر جو تھرتھراتا ہے — نہیں ہی جان کے جانیکا غم مگر تجھ کو
ملے گی خاک بھی ڈھونڈھے نہ تیری محفل میں — صبا اُڑائے پھرے گی دمِ سحر تجھ کو

دیر تک عالمِ حسرت میں گریہ وزاری کرتا اور بدھا کے مصاحبوں کو بُرا بھلا کہتا رہا۔ آخر کار بادلِ بریاں و چشمِ پُرنم مکان پر واپس آگیا اور سینکڑوں آدمیوں کو اس کی تلاش میں اطراف و جوانب میں چلتا کیا اسی وقت تمام ریاست میں بذریعہ منادی اعلان کیا گیا کہ بدھا کے لانے والے کو اس کی ہموزن چاندی سونا اور جواہرات کا انعام دیا جائیگا

دن پر دن اور رات پر رات گذرنے لگے لیکن بدھا کا کہیں پتہ نہ لگا بوڑھے راجہ کی حالت واقعہ کے بعد بہت خراب ہوگئی وُہ شاذ و نادر ہی دربار کرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس دن سے راجہ کو کسی نے ہنستا نہ دیکھا بہرحال ہمنے تو بدھا کا حال تاریخ ہند کے اس باب میں دیکھا جس کا عنوان "بدھا اور بدھ مذہب کی ترقی ہے"۔ اور معلوم کیا کہ چشمِ تحقیق عمدہ دل پر کسقدر اثر ڈال سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک عاقل کے لئے اشارہ کافی ہے لیکن گدھا مار پیٹ سے بھی درست نہیں ہو سکتا۔ دُنیا میں جو سانحے ہمیں درپیش آتے ہیں اُنکو قدرت ہماری تادیب کرنے کے لئے پیدا کرتی ہے۔ لیکن ہم چند آنسو بہا کر تھوڑی سی گریہ وزاری کر کے اور قسمت پر لعن و طعن کر کے ہر سانحہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قدرت کا یہ منشا ہے کہ اُس سانحہ کو یاد رکھ کر عاقبت بالخیر کے لئے افعال کو درست کریں اور جو مشکلیں درستی افعال میں پیش آئیں ان کو عارضی اور فوری خیال کر کے پروا نہ کریں۔

تے ہوئے چلے آرہے تھے۔ بدھا نے اِن لوگوں سے بڑی دیر تک بات چیت
کی جس سے اسے موت کی نسبت بھی کچھ علم ہُوا؛ اب تو بدھا کے خیالات نے
عجیب خوفناک شکل پیدا کرلی۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے کو ساتھیوں کے
سامنے غیر متاثر ظاہر کیا حالانکہ اسکا دل ڈوبا جارہا تھا۔ اب ڈانڈی تیسری
مرتبہ پھر روانہ ہوئی اور ایک نوجوان خوش مذاق ساتھی نے ایک دلچسپ کہانی
کہنی شروع کردی۔ بدھا بھی ظاہری طور سے ہاں ہاں کہتا رہا اسی اثنا میں
ڈانڈی ایک بلند مقام پر پہنچ گئی جہاں بڑے بڑے پتھر صف بستہ تھے
بدھا نے یہاں پہنچکر ساتھیوں پر چہل قدمی کرنے کی خواہش ظاہر کی جسکی
فوراً تعمیل کی گئی۔ بدھا کچھ دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا آخر کار ایک بلند ٹیلہ
پر چڑھکر جسکے پہلو میں ایک عمیق غار تھا اپنے ساتھیوں سے جو اس سے کسی قدر
فاصلہ پر تھے للکار کر کہا۔ تم لوگ اسی وقت محل چلے جاؤ۔ والدین سے کہدینا
کہ آج کے واقعات نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ مَیں بادشاہت کا خواہشمند
نہیں۔ انجام بخیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے مارا مارا پھرونگا۔ جب تک
یہ حل نہ ہوگا۔ والدین یا بیوی بچے کو اپنی شکل نہ دکھاؤنگا۔ تم لوگوں نے مجھ
سے بیفائدہ بادشاہی کرنے کی امید رکھی۔ مَیں کسی اَور کام کے لئے پیدا کیا
گیا ہوں۔ میرے لئے غم نہ کرو۔ خبردار تم میرے نزدیک آنے کی ہرگز
کوشش نہ کرنا ورنہ اس کھڈ میں کودکر اپنی جان ضایع کردونگا"۔ بدھا کے تمام ساتھی
پریشان ہوگئے۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ پتھر پر چڑھکر شاہزادہ کو گرفتار
کرلے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ بدھا جو کہتا ہے وہی کرتا بھی ہے۔ پس
وہ مشورہ کرکے محل کی جانب سب بھاگے تاکہ بادشاہ کو جلد موقع واردات
پر لاویں۔ لیکن راجہ نے جس چٹان پر ساتھیوں نے چھوڑا تھا وہاں بدھا کو نہ پایا

کہ مصیبت تنہا نہیں آتی ایک انگریزی شاعر نے خوب کہا ہے۔ جانور جب
بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو مالک، اُسے نکال دیتا ہے۔ جنگل میں پہنچکر اُسے
معلوم ہوتا ہے کہ اتحادِ دشمنانِ جاندار ان کیسی خوفناک چیز ہے؛ موسم کی
تکلیف؛ ناطاقتی؛ بھوک اور پیاس کے آگے بیچارہ سرِ تسلیم خم کر کے
منہ زمین پر ڈال دیتا ہے۔ ایک گدھ جو اس سے بہت بلندی پر اڑ رہا ہے
اس کو دیکھ نیچے اترتا ہے پھر گدھوں کے جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو جاتے ہیں
اور اس کی انتڑیاں کھینچنے لگتے ہیں۔ میرے خیال میں اس حالت میں یہ
زیادتی اور ہو جاتی ہے کہ جنگل کے درندے بھی اس برے وقت میں بڑائی
میں حصہ بڑی بری طرح لیتے ہیں۔ الغرض اس بوڑھے پر بھی مصیبتوں نے
ایکا کر کے حملہ کیا تھا۔ بدھا نے یہ حالت دیکھ کر بوڑھے سے مصائب کی
ماہیت سے آگاہی حاصل کی اور اسے کچھ نقدی دے کر رخصت کیا۔ بدھا نے
معلوم کر لیا کہ کم و بیش نوعیت میں یہ حالت ایک دن ہر شخص پر طاری ہونے
والی ہے۔ اس خیال نے اُسے اور بھی افسردہ خاطر کر دیا۔ جاہ و حشم کی
جانب سے وہ بیدل ہو گیا۔ نیرنگیٔ منظر کے خیال سے جو اداسی اُس کے
دل میں پیدا ہو گئی تھی وہ اور بھی بھڑک اٹھی۔ بدھا کے کنارہ دل سے سمندر
کی موجوں کی طرح بار بار یہ خیال ٹکرا رہا تھا کہ یہ حالت جب بدلنے والی ہے
تو سارا جاہ و حشم بیکار ہے۔ پھر نہ کیوں اس میں ڈوبے رہیں۔ کیوں نہ اس
راہ کو خیرباد کریں جو نزہت گاہ اس کی جانب جاتی ہے۔ بیوی بچے
دوست اور عزیز سب بیکار ہیں۔ جب کہ وہ ہماری حالت کو نہ بدل سکتے ہیں
نہ قائم ہی رکھ سکتے ہیں۔ افسوس یہ سب لوگ کس کام کے ہیں۔ سلسلۂ خیالات
نے بدھا کو یہیں تک پہنچایا تھا اس کی نظر ارتھی پر پڑی جسکو قصبہ کے باشندے

ہواؤں کے جھونکے غروب ہونے والے آفتاب کا ڈر کے مارے زرد ہو جانا
گھاٹیوں دروں اور وادیوں میں پیلی پیلی دھوپ کے مختلف منظر گلہائے رنگ
رنگ سے پُر رونق پہاڑ شجر اور حجر کی مختلف الاشکالی قدرت کی اعلیٰ صناعی کو
ثابت کر رہے ہیں۔ اس وقت پہاڑ لاکھوں پرندوں سے بھرا ہوا ہے جو
دامنِ کوہ سے اپنے آب و دانہ معمولی کو لیکر اس وقت خالقِ اکبر کی حمد
اپنی جنس کی زبان میں گا رہے ہیں۔ اس محظوظ کر دینے والے منظر نے بدھا
کے دل کو لبھا لیا وُہ دل میں خیال کرنے لگا" کاش یہ منظر ہمیشہ میرے پیش
نظر رہتا۔ ہر وقت یہی شام ہوتی یہی پہاڑ یہی منظر ہوتا۔ میں اسی جگہ ہوتا
غرض جو حالت اسوقت موجود ہے بعینہٖ وُہ ہر وقت مجھے اپنے دامن عاطفت
میں لیے ہوئے ہوتی لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؛ تو کیا میری آرزو فضول ہے؟
بیشک بیشک انسان کے قبضۂ قدرت سے یہ باہر ہے! افسوس بیچارہ
انسان کتنا معذور پیدا کیا گیا ہے!! بدھا کے دل میں ان خیالات
کے ساتھ ہی رنج و افسوس پیدا ہو گیا۔ جس نے سارے لطف کو کرکرا کر دیا
ڈانڈی کا پہیہ گھوم رہا تھا۔ سورج کی الوداعی کرنیں اس کے سایہ کو لمبا لمبا
کر رہی تھیں۔ آبادی سے دُور ڈانڈی جانے نہ پائی تھی کہ دیکھا کہ ایک اندھا بڈھا
جو ضعف کے ہاتھوں جانِ شیریں کو فروخت کرنے کے لیے بالکل تیار تھا
لاٹھی ٹیکتا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ سانس ہستی کی دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔
قدم قدم پر ٹھہر جاتا ہے اس لئے کہ تازہ دم کی ضرورت نے مجبُور کر دیا ہے
آہ اس اخیر وقت میں معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا کئی مُصیبتوں کا شکار ہو رہا ہے
یعنی افلاس پیری ضعف نو کمی تکلیف وغیرہ وغیرہ نے آپس میں سمجھوتا کر کے
اس پیر بیکس کی مٹی خراب کرنے کا بد منصوبہ گانٹھ لیا ہے۔ اس مسئلہ پر

سے کہا کہ خسرو کیا وقت ہے۔ آپ نے کہا کہ آدھی رات کی نوبت بج رہی ہے۔ اور یہ کہہ رہی ہے۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو۔ خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو۔

آپ کو ایجاد و اختراع کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے گیت قوالی ستار اور چار راگنیں۔ قول۔ فارسی۔ ترانہ۔ تصانیف وغیرہ وغیرہ ایجاد کیں۔ ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں حضرت نظام الدین محمد قدس سرہ کا انتقال ہوا۔ جب اس کی خبر آپ کو ہوئی تو آپ سیاہ لباس پہنکر چھ ماہ تک مزار مبارک کے پاس بیٹھے رہے۔ آخر ۱۸۔ شوال ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں آپ بھی اپنے مرشد سے جا ملے اور اپنے مرشد کے پائیں مدفون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ آپ کے لوح مزار پر یہ اشعار کندہ ہیں ؎

مرا نامیست خواجہ عظیم دو شین و دو لام و دو قاف و دو میم
اگر نام یابی دریں حرفہا برانیم حق تو مرد فہیم

سید شریف احسن

سلہ مصرعہ ثانی کے دو (ش) دو (ل) دو (ق) دو (م) کے جو عدد ہوتے ہیں وہی سنہ وفات ہے

اسی کے نام پر لکھی اور اس نے ہاتھی کے ہموزن جواہر صلہ میں عنایت کئے۔ چنانچہ آپ خود لکھتے ہیں :۔

شہا گنج بخشا کرم گسترا — معانی شناسا سخن داورا

مرا عمر بگذشت با لاگذشت — ہمہ پیش شاہان والا گذشت

ازاں پس که در شہ ستانی شدم — توانگر ز گنج علائی شدم

چنیں بخششے کز تو جستہ یافتم — در ایام پیشینہ کم یافتم

قطب الدین مبارک شاہ کے بعد خسرو خاں کا زمانہ آیا۔ لیکن آپ نے اس سے کچھ تعلق نہ رکھا۔ تھوڑی ساتھ ماہ کے بعد غازی ملک غیاث الدین تغلق کے خطاب سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ آپ نے اس کی مصاحبت اختیار کی اور تغلق نامہ کو اسی بادشاہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے بعد محمد شاہ کا زمانہ آیا آپ نے کل گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ہر بادشاہ آپکی عزت و توقیر کیا کرتا تھا۔ آپ کے حالات جن جن مصنفوں نے لکھے ہیں۔ ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اخلاق و آداب بہت ہی عمدہ تھے۔ آپ سنی تھے لیکن تعصب مطلق نہ تھا۔ راست باز تھے خوش مزاج بذلہ سنج۔ بُرد بار اور حق شناس بھی تھے۔ تکلف نام کو نہ تھا۔ کسی کی [illegible] نہ کرتے تھے اور جو کچھ انعام ملتا تھا سب خیرات کر دیا کرتے تھے۔ آپ بہ نسبت بادشاہوں کے اپنے مرشد کے یہاں زیادہ رہا کرتے تھے۔ اکثر رات کو ایک ایک دو دو بج جاتے تب بھی آپ اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

چنانچہ ایک روز آپ اپنے مرشد کے یہاں بیٹھے تھے۔ اتفاقاً ایک مہمان بھی تشریف لائے۔ باتیں جو شروع کیں تو دو بجا دیئے۔ آپکے مرشد نے اخلاق کی وجہ سے بیٹھے رہے لیکن جب بہت ہی پریشان ہوگئے تب آپ

تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم نے ایک ایسے فاضل شخص کی مصاحبت اختیار کی۔

آپ پانچ سال تک شہزادے کی مصاحبت میں رہے ۶۸۳ھ مطابق ۱۲۸۴ء کو تیمور مغل نے غیاث الدین کے ملک پر حملہ کیا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ شاہزادہ مارا گیا۔ اس کے مصاحب گرفتار ہو گئے۔ لوگوں نے انکو بھی گرفتار کر لیا۔ اور جہول اور توا آپ کے سر پر رکھ کر قید خانہ تک لے گئے۔ چنانچہ آپنے لکھا ہے :-

من کہ بر سر نمی نہادم گل بار بر سر نہاد گفت اجل

آپ نے دو سال کے بعد اس قید بلا سے رہائی پائی اور دو پُر زور مرثیے سلطان غیاث الدین کو سُنائے جو شاہزادہ کے ماتم میں لکھے گئے تھے۔ جسے سنکر عام طور پر دربار بہت ہی روئے۔ خصوصاً بادشاہ نے سب سے زیادہ گریہ وزاری کی تپ کو بخار آنے لگا اور تیسرے دن اپنے فرزند سے جا ملا۔ افسوس کہ ہمیں ان مرثیوں کا کوئی شعر نہ ملا۔ ورنہ ہم یہاں نقل کرتے۔ اس کے بعد آپ نے امیر علی میر جامدار کی مصاحبت اختیار کی۔ پھر چند دنوں تک معز الدین کیقباد کی مصاحبت میں رہے پھر سلطان جلال الدین کی ملازمت اختیار کی۔ سات یا آٹھ سال کے بعد اس کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ بعد آپ سلطان علاء الدین خلجی کی مصاحبت میں آئے۔ یہ بادشاہ علم سے بے بہرہ تھا۔ شاید حرف شناسی آتی تھی۔ لطف یہ کہ بادشاہ کو اس لیاقت پر غرور بھی تھا اپنے برابر کسی عالم کو نہ سمجھتا تھا چند سال کے بعد اس کا بھی آفتاب اقبال غروب ہو گیا۔ پھر آپ نے شہاب الدین کی مصاحبت اختیار کی تین ماہ تک اس کے یہاں ملازم رہے اور یہ بھی تین ماہ تک اس کے یہاں ملازم رہے اور یہ بھی تین۔ تک بادشاہ رہا۔ بعد ازاں قطب الدین تخت نشین ہوا۔ آپ اس کے یہاں ملازم رہے اور مثنوی نہ سپہر

اپنے والد کے انتقالِ پُر ملال کی خبر سُن کر یہ شعر لکھا ؎

سیف از سرم گذشت دلِ من دو نیم شد　　　دریائے ما رواں شد و دُرِّ یتیم شد

والد کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے نانا عماد الملک سے مدّت تک علم و فضل حاصل کیا اور ساتھ ہی ساتھ شاعری بھی شروع کر دی۔ کچھ دنوں تک تو اپنے بھائی اعز الدین علی شاہ سے صلاح لی اور اس کے بعد شمس الدین خوارزمی کی شاگردی اختیار کی۔ جب آپ علوم و فنون ظاہری میں کامل ہو چکے تب آپکو علومِ باطنی کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس لئے آپ حضرت نظام الدین محمد قدس سرہٗ کے مرید ہوئے اور اُس میں بھی کمال حاصل کیا۔ آپ کے مرشد نے آپ کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں کہ :- ؎

بربنائے آنت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت　　　دستِ ترک اللہ بگیر و ہم بالتمش سپار

چوں منِ مسکیں ترا از ہمیشہ بس بود　　　شیخ من کس مہربان و خالقم آمرزگار

آپ نے اپنے مُرشد کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے ہیں۔ مگر ہم یہاں چند اشعار درج کیا کرتے ہیں۔

خسرو بہ فقر بادشاہے　　　در عالم دل جہاں پناہے

شاہنشہ بے سریر و بے تاج　　　شاہاں بہ خاک پائے محتاج

حاصل کلام میر خسرو کے کمالاتِ ظاہری و باطنی شاعری اور فضیلتِ علمی کا شہرہ جب عالمگیر ہوا تب غیاث الدین کے بڑے بیٹے محمد سلطان نے آپکو اپنی مصاحبت میں رکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا آپ نے بھی بقول ؎

مراد اہل طریقت لباس ظاہر نیست　　　کمر بخدمتِ سلطان بہ بند و صوفی باش

قبول فرمایا ایک دفعہ شاہزادہ محمد سلطان نے آپ کے کچھ اشعار لکھ کر شیخ سعدیؒ کی خدمت میں روانہ کئے۔ شیخ نے آپ کی بہت تعریف لکھی اور یہ بھی لکھا کہ میں

امیر خسرو

خسرو۔ آپ کا نام ابو الحسن تھا۔ آپ لڑکپن میں لفظ خسرو سے یاد کئے جاتے تھے۔ اسی لحاظ سے آپ نے اپنا تخلص خسرو رکھا۔ آپ سنہ ۶۵۲ھ مطابق سنہ ۱۲۵۴ء کو بمقام مومن آباد ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ سنہ پیدائش میں مورخوں کو اختلاف ہے مگر آپ نے خود اس کا فیصلہ اپنی تصنیف قران السعدین میں کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت   بود سنہ ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بر رسی   راست بگویم ہمہ شش بود و سی

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قران السعدین سنہ ۶۸۸ ہجری مطابق سنہ ۱۲۸۹ء کی تصنیف ہے اور اسوقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی اس لئے وہی سنہ صحیح معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

خزانۂ عامرہ و سیر اولیا میں لکھا ہے کہ جس وقت آپ پیدا ہوئے اسوقت آپ کے والد ماجد (سیف الدین) آپ کو ایک پارچہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کی خدمت میں لے گئے انہوں نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ بڑے عارف باللہ ہونگے اور تعجب نہیں کہ خاقانی سے دو چار قدم بڑھ جائیں۔

آپ نے سنہ ۶۵۶ ہجری مطابق سنہ ۱۲۵۸ء تک وطن ہی میں پرورش پائی اور سنہ ۶۶۱ھ مطابق سنہ ۱۲۶۳ء تک دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ افسوس کہ نویں سال سنہ ۶۶۱ھ مطابق سنہ ۱۲۶۳ء کو آپ کے والد ماجد نے دہلی میں انتقال فرمایا۔ آپ نے اس عمر میں اتنا علم حاصل کیا تھا کہ بخوبی شعر کہہ سکتے تھے چنانچہ

میر صاحب:- "میں ابھی آتا ہوں۔ وقار میں لاکھ شکر اس کریم کارساز و بے نیاز کا کرتا ہوں کہ وہ صرف میرا خواب وخیال تھا۔ میں درحقیقت زمانۂ حال میں ہوں۔ اور میں نے اگلے زمانے سے نجات پائی۔ وقار ہکا بکا ہوکے اُنکا مُنہ تکنے لگا۔ اور اس نے کہا کہ "دادا جان کیا سچ مچ آپ کی رائے بدل گئی ہو"۔

میر صاحب:- "ہاں بیٹا واقعی اس خواب نے مجھے بڑا سبق دیا ہے۔ جو جو آسائشیں آج کل ہمیں حاصل ہیں۔ انکی ہمیں قدر نہیں۔ میں نے ان سب کو کھوکر دوبارہ پایا ہے اس لئے اب میں جانتا ہوں کہ یہ کس قدر غنیمت ہیں۔

جب تک یہ مُنہ ہاتھ دھوکے کپڑے بدل کے آئے وقار دوڑتا ہوا باہر نکل میں گیا اور چلاکے کہا "ابا جان! ایک خوشخبری سُناتا ہوں کہ آج سے دادا جان نے عہد کرلیا ہے کہ زمانۂ حال کی مذمت نہ کرینگے"۔

یہ سُنکر سب تعجب کرنے لگے کیونکہ میر صاحب اور وقار میں اس بارہ میں ہمیشہ بحث ہوا کرتی تھی اور وہ پرانے زمانے کی سادہ زندگی کے زبردست طرفدار تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے اور انہوں نے ہنسکے کہا کہ "ہاں میں آج سے معتقد ہوگیا ہوں کہ اپنے بزرگوں کا طرز زندگی اختیار کرنا ہمارے لئے غیر ممکن ہے۔ وہ زمانہ انہیں کے لئے موزون تھا"۔

مس شجاعت علی (از حیدرآباد دکن)

دل آرا۔ "دادا جان! چائے کا سٹ پٹ کیا چیز ہے؟"

میر صاحب پھیکے ہو رہے۔ کچھ جواب نہ دیا۔ جُوں تُوں کر کے چائے پی لی تو ذرہ حواس درست ہوئے۔ پھر وہ باہر گئے۔ دیوانخانہ میں انہوں نے اپنا قلم بہت ڈھونڈا لیکن وہ بھی ندارد۔ آخر کار انہوں نے وقار کو پاس بلا کر پوچھا کہ "بیٹا وقار میرا فونٹین پن کہیں نہیں ملتا ہے کیا تم نے اسکو کہیں دیکھا ہے؟"

وقار۔ "جی نہیں دادا جان! دیکھنا تو کجا۔ میں نے اس کا نام تک کہیں نہیں سُنا ہے"۔

میر صاحب (ٹھنڈی سانس لیکر) "ہاں بیٹا سچ ہے۔ یہ ایک اچنبا ہے۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ خیر جانے بھی دو۔ تم تو سب کے سب زمانے ہو گئے ہو" وہ بیچارے پھر سر تا پا غریق بحر حیرت ہو رہے تھے اور کہتے تھے کہ "یا الٰہی میں نے کونسا گناہ کیا ہے۔ جو اس کی سزا پا رہا ہوں۔ مجھ کو تمام عیش و راحت سے محروم کر کے اس حالتِ پراگندہ میں گرفتار کیا ہے"۔

اسی اثنا میں دفعتاً کسی نے ایسے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا کہ میر صاحب چونک پڑے اور دیکھتے کیا ہیں کہ کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے آرام کرسی پر اپنے قدیم کتبخانہ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے تو انکو سکتہ سا ہو گیا۔ اس کے بعد خوب ہنسے اور آواز دی کہ "چلے آؤ"۔ وقار ہاتھ میں ٹینس کا بلا لئے ہوئے اندر آ گیا اور کہنے لگا کہ "دادا جان کیا آپ سو گئے تھے؟"

میر صاحب۔ "ہاں بیٹا! میری آنکھ لگ گئی تھی اور میں نے ایک عجیب غریب خواب دیکھا ہے"۔

وقار۔ "باہر چل کے کہیئے گا۔ میں بڑی دیر سے آپکا منتظر تھا کہ آپ آئیں تو ٹینس شروع کروں۔ وہاں چائے تیار رکھی ہے اور آپ کا انتظار ہو رہا ہے"۔

کھانوں سے چنا ہوا دیکھا اور پوچھنے لگے کہ آج کھانا میز پر کیوں نہیں منگایا۔ تم کو خوب معلوم ہے کہ مجھ سے فرش پر نہیں بیٹھا جاتا ہے۔ کیونکہ میرے پاؤں میں سخت درد ہے"۔ شہر کے "چمچے کانٹے کیا ہوئے"؟

دل آرا۔ دادا جان یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کانٹے تو جنگلوں میں ہوا کرتے ہیں اور چینی کے چمچے موجود ہیں"۔

میر صاحب جھنجھلا کے رہ گئے۔ سب کے حواس باختہ تھے اور ان سب کو یقین ہوا جاتا تھا کہ وہ دیوانے ہو گئے تھے۔ وہ سکتے کی حالت میں تھے اور اپنے جی میں کہتے تھے کہ "خدایا یہ کیا واردات ہے کہ کوئی میری بات نہیں سمجھتا ہے"۔

کھانے سے فارغ ہو کے انہوں نے سگرٹ اور سگار مانگے۔ وہ بھی جب نہ ملے تو انہوں نے حقہ طلب کیا۔ پھر آرام کرنے کو خوابگاہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی روزمرہ کی چیزوں کا جنکے وہ عادی تھے نام نہ پایا۔ اور انکو بے انتہا تکلیف ہوئی۔ لیکن مہذب اس قدر تھے کہ انہوں نے دم نہ مارا۔ صبح کو جب یہ آئے تو چائے والے کو بھی نہ تھی۔

میر صاحب"۔ آج چائے کیوں نہیں بنائی گئی ہے"۔

خدمتگار۔ دست بستہ گستاخی معاف۔ حضور تو کبھی چائے کا استعمال نہیں کرتے تھے جو خادم تیار کرتا"۔

میر صاحب "۔ تم لوگوں کو کچھ جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ خیر چائے جلد لاؤ"۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے جو دوا کے واسطے رکھی تھی ایک چاندی کے کٹورے میں بنا کر لے آیا۔ اور شکر بھی لایا۔

میر صاحب۔ دودھ کیوں نہیں لایا۔ چائدان میں چائے کیوں نہ دم دی۔ چائے کا بست کس دن کے لئے رکھا ہے"؟

وقار۔ دادا جان یہاں سوائے گھوڑوں رتھوں اور میانوں کے اور کوئی سواری نہیں ہے"۔ اسی وقت سولہ کہار عمدہ وردیاں پہنے ہوئے میانہ کے لئے حاضر ہوئے۔ میر صاحب بہزار دقت اس پر بیٹھ کر روانہ ہوئے اور اسٹیشن کا رستہ ایا۔ وہاں پہنچ کے دیکھتے کیا ہیں کہ اسٹیشن کیا ہوگیا" تو وہ کہنے لگے ہم نے تو ریل ویل کوئی چیز سنی نہیں۔

ایک شخص نے کہا کیا افسوس کی بات ہے کہ میر صاحب دیوانوں کی سی باتیں کر رہے ہیں"۔ دوسرے نے جواب دیا کہ سچ تو ہے کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ یہ ریل خدا جانے کیا بلا ہے۔ اب وہ شاید ستر سے بہتر سے ہوگئے ہیں!"

میر صاحب بیچارے سراسیمہ اور پریشان حال پھر گھر واپس گئے۔ یہ وجع مفاصل کے مارے ہوئے تھے اور ان سے فرش پر بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ کرسیاں او میز انہوں نے طلب کیں تو نوکر چاکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ غصہ کے مارے اُن کا بُرا حال تھا۔ آخر کو انہوں نے کہا "خدا کے لئے کچھ بیٹھنے کو بھی دو گے یا نہیں"۔ وقار نے دوڑ کے ایک مونڈھا لا دیا۔ جب یہ بیٹھے۔ لیکن اُن نرم نرم آرام کرسیوں کی بات کہاں! شام کو شمعیں روشن کی گئیں۔ انہیں کسی طرح برقی روشنی کی یاد نہیں بھولتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وقار آیا اور اس نے کہا کہ "دادی جان آپ کو کھانا کھانے کے لئے بلاتی ہیں"۔

میر صاحب۔ "میاں تم کیوں آئے۔ کھانے کی گھنٹی کیوں نہ بجادی"۔

وقار۔ کھانے کی گھنٹی کیسی ہوتی ہے؟

میر صاحب۔ (حیرت میں) کیسی ہوتی ہے! سیکڑوں مرتبہ تو تم ہی نے بجائی ہوگی"۔

دونوں اندر گئے۔ وہاں فرشی دسترخوان پر پُر تکلف اور لذیذ ہندوستانی

جلدی میں انہوں نے خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن اب دیکھا کہ انتخار ہال کا کہیں پتا نہیں ہے
اسی کی جگہ ایک نفیس اگلے زمانے کی عمارت ہے۔ انہوں نے اسکو مطلق نہیں پہچانا مگر
وقار کو اور چند خدمتگاروں کو دروازہ پر دیکھ کے وہ اندر چلے گئے۔ اور کہنے لگے
کہ "دیکھو بیٹا نہ تو کہیں پوسٹ آفس ہے اور نہ تار گھر جو میں تار دیدوں۔ میری
موٹر کار تم جلدی سے منگوا دو تاکہ میں ریل کے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں"
یہ کہکر وہ جیب میں ہاتھ ڈال کے جیبی گھڑی نکالنا چاہتے تھے جو انہوں نے
پہلی مرتبہ خیال کیا کہ وہ انگریزی سوٹ پہنے ہی نہیں ہیں اور نہ کہیں جیبی گھڑی کا
پتہ ہے۔

میر صاحب۔ لاحول ولا قوۃ واچ بھی غائب ہو گئی اور میں نے یہ کپڑے
خدا جانے کہاں سے نے کے پہن لئے ہیں۔ خیر وقار ذرا جلدی سے
موٹر منگوا لو۔ یہ تم سب کے سب میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟

وقار۔ (دبی ہوئی آواز سے) "دادا جان موٹر کیا چیز ہے؟ یہاں تو نہ واچ
ہے، اور نہ ریل۔ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ یہ کیا چیزیں ہیں"

میر صاحب۔ (چیں بجبیں ہو کر) وقار میں تم پر خفا نہیں ہونا چاہتا
ہوں لیکن تم کو آج ہو کیا گیا ہے۔ "جو میری بات تم سمجھتے ہی نہیں ہو۔ بہرحال
خدا کے لئے کوئی سواری کیوں نہ ہو جلد ان نوکروں سے کہکر منگاؤ۔ کیونکہ میرا
بنا ہوا کام بگڑا جاتا ہے"

وقار۔ "اگر آپ سواری کے واسطے پہلے ہی کہتے تو میں منگوا دیتا (نوکر سے
مخاطب ہو کر) دیکھو میانہ جلد منگاؤ"

میر صاحب۔ "میانہ کیا؟ اس پر تو بیمار سوار ہوتے ہیں۔ ہائے وہی لینڈ گاڑی
اور جوڑی ہی تیار کراؤ۔ میں موٹر سے باز آیا"

پڑتی۔ اب اُنہوں نے شور مچانا شروع کیا تو وقار دوڑتا ہُوا اندر چلا آیا اور گھبرا کے پُوچھا کہ "دادا جان خیر تو ہے آپ کا مزاج کیسا ہے ؟"

میر صاحب "میرا مزاج تو اچھا ہے لیکن نوکر کہاں چلا گیا ہو۔ نہ مجھ کو ٹیلیگراف فارم ملتے ہیں اور نہ اسٹامپ ہی ہیں۔ یہ خط ٹپہ[ف] میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور ایک اشد ضروری تار فی الفور مجھ کو دینا ہے مگر یہاں سے خدا جانے سب چیزیں کہاں غائب ہو گئی ہیں"۔

وقار "دادا جان یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہو۔ اسٹامپ اور ٹیلیگراف فارم کیا چیزیں ہیں" ؟

میر صاحب "سنو وقار یہ وقت تمسخر کا نہیں ہو۔ میرا کام برباد ہوا جاتا ہو۔ اگر میرے بلانے سے کوئی نہیں آتا ہے تو میں خود ٹیلیگراف آفس جاتا ہوں"۔ یہ کہکر وُہ وقار کو حیران و پریشان چھوڑ کر جلدی سے باہر چلے گئے۔ وہاں گئے تو اور ہی تماشا دیکھا۔ نہ وُہ انگریزی وضع کے مکانات تھے اور نہ وُہ عمدہ سڑکیں۔ کچھ عجیب طرح کی دیسی عمارتیں جیسا اُنہوں نے اپنے بچپن میں خال خال دیکھا تھا نظر آئیں بہر حال اُنہوں نے ٹیلیگراف آفس کی طرف رُخ کیا۔ مگر وہاں اسکا نام و نشان نہ پایا۔ اس جگہ پر ایک پُرانی بارہ دری تھی جس کے آگے چند ننھے ننھے بچے کھیل رہے تھے۔ تب تو میر صاحب ذرا گھبرائے کہ یہ ماجرا کیا ہے ! لڑکوں سے پُوچھا کہ پوسٹ اور ٹیلیگراف آفس جو اس جگہ پر تھے وُہ کیا ہوئے ؟ بیشک لڑکوں نے بے تمیزی سے خوب ہی قہقہے لگائے اور کہنے لگے کہ بڑے میاں کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے" ؟ یہ کہکر وُہ ہنستے ہُوئے پھر کھیل میں مشغول ہو گئے۔

بیچارے میر صاحب واپس گئے۔ اب گھر کا منظر کچھ اور ہی پایا۔ جاتے وقت

[ف] دکن میں ڈاک خانہ کو ٹپہ کہتے ہیں۔

میر افتخار علی صاحب بڑے لائق اور ذی علم شخص تھے۔ انگلستان کے تعلیم یافتہ اور بارسٹر تھے۔ وہ ایک نہایت ہی عالیشان کوٹھی میں جس کا نام "افتخار ہال" تھا اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ عمارت سہ منزلہ تھی اور انواع و اقسام کے انگریزی عمدہ فرنیچر سے آراستہ تھی۔ مکان کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا جس میں ٹینس اور بیڈمنٹن کورٹ تھے۔

صاحب موصوف دولتمند آدمی تھے اور بالکل انگریزی طریقہ سے رہتے تھے۔ افتخار ہال نہایت پر تکلف سجا ہوا تھا۔ ہر کمرہ میں برقی روشنی اور برقی پنکھے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جا بجا نامی گرامی مصوروں کی کھینچی ہوئی نفیس رنگین تصویریں قرینہ سے لٹکی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں کے سوا "لفٹ" بھی تھے۔ جن پر بیٹھ کر آدمی نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے پل بھر میں پہنچ جائے اور چڑھنے اترنے کی زحمت سے بچے۔ غرض یہ کہ زمانہ جدید کی کوئی ایسی ایجاد نہ تھی جو وہاں مہیا نہ ہو۔

میر صاحب نے چند خطوط لکھے۔ پھر کچھ غنودگی سی معلوم ہونے لگی تو ایک کتاب لے کے آرام کرسی پر جا بیٹھے۔ اتنے میں ان کو خیال آیا کہ ڈاک کا وقت نکلا جاتا ہے۔ چاہا کہ ٹکٹ لگا کر لفافے نوکر کے حوالہ کریں کہ ڈاک میں ڈال آئے۔ لیکن اب نہ وہ میز تھا اور نہ اسٹامپ کی ڈبیا۔ کمرے کا رنگ ہی کچھ نرالا تھا۔ اس آراستہ کتبخانہ کے عوض میں انہوں نے اپنے تئیں ایک پرانے زمانہ کے دیوانخانہ میں پایا۔ جس میں نہایت عمدہ فرش بچھا ہوا تھا اور ایک طرف قلمدان رکھا ہوا تھا۔ برقی گھنٹی کی جانب گئے تو وہ بھی غائب تھی۔ اب بیچارے بہت حیران ہوئے۔ نوکر کو بلانا شروع کیا۔ مگر صدائے برنخاست۔ انہیں ایک عقدہ میں مار دیا تھا۔ کمرہ میں نہ تو فارم تھے۔ نہ کوئی اور چیز اپنے ٹھکانے

"قدرِ نعمت بعدِ زوال"

وقار۔ دادا جان میں تو اسکا قائل نہیں ہوں کہ پُرانے زمانے کا طرز معاشرت اس زمانہ سے بہتر تھا۔ ہزاروں ایسی چیزیں ہماری راحت کے لئے ایجاد کی گئی ہیں کہ بغیر انکے گزارا نہیں ہو۔ بُرا نہ مانئے گا تو زمانہ گذشتہ کا دلدادہ نہیں ہوں"۔

میر افتخار علی۔ بیٹا وقار یہ تو سب سچ ہے لیکن اگلے زمانے کی بات کہاں! کیسی سادہ زندگی تھی۔ اگلے وقتوں کے اخلاق اُن لوگوں کی مروت۔ وضع کی پابندی۔ آج کل روزمرہ جو جھگڑے بکھیڑے پیش آتے رہتے ہیں ان سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آج ہی صبح کا حال سُنو: میں ایک ضروری کام سے جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں میری موٹر بگڑی۔ خدا نے فضل کیا کہ میرے ایک دوست ادھر سے گذرے جو میں اُنکے ساتھ ہو لیا ورنہ میرا بڑا ہرج ہوتا۔ میں تو بعض وقت اس نئی روشنی سے بہت اُکتا جاتا ہوں۔ انسان کا کام کبھی بند نہیں ہوتا ہے۔ کاش وُہ اگلا زمانہ ہوتا تو عذاب سے نجات ہوتی"۔

وقار۔ دادا جان! میں آپ سے اس خیال میں اتفاق رائے نہیں کرتا۔

کُتب خانہ کے کمرہ میں یہ گفتگو میر صاحب اور انکے پوتے میاں وقار علی میں ہو رہی تھی جو ٹیلیفون کی گھنٹی میز پر بجی۔ اس کمرہ میں چند نہایت عمدہ الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ بہت وسیع اور روشن تھا۔ کُھلی ہوئی چوڑی کھڑکیوں میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آ رہے تھے۔ مشہور شعرا اور مصنفوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے جابجا رکھے ہوئے تھے۔ گھنٹی کی آواز سُنتے ہی میر صاحب میز کے پاس آئے۔ اور وقار اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

میڈم بوسین جس کے حق میں یہ وصیت تھی کہ جو کچھ مندرجہ بالا تقسیم کے بعد بچے وہ اسے مل جاوے ۔ فیاضی میں وصیت کرنے والے کے برابر ثابت ہوئی اور متوفی کے جنازے کے روز اس نے اعلان کیا کہ وہ غرباء پیرس کے واسطے چالیس ہزار پونڈ وقف کرے گی ۔ جنازہ اس دھوم سے اُٹھا کہ سارے پیرس میں یہ مشہور تھا کہ اس شان کا جنازہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ متوفی نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق سارا انتظام خود کر رکھا تھا ۔ لیکن کو اس کے مرنے کے بعد کچھ تکلیف اس اہتمام کے لئے اٹھانی نہیں پڑی ۔ اس نے اپنی محنت کشی اور لیاقت سے اپنی زندگی میں بہت سے بڑے عالی حوصلہ کے ۔ پریذیڈنٹ [illegible] اس سے دوستانہ [illegible] رکھتے تھے ۔ اور اس کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ جیا تو نیک نام جیا اور مر کے بھی نام کر گیا ۔

مسز عبدالقادر

جن پر دوکان کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ بیلون ان بچوں کو جن کے والدین اس دوکان سے سودا لینے آتے تھے۔ مفت دیے جاتے تھے اور اس طرح ہر بچہ اس دوکان کا اشتہار ان بیلونوں کو ہوا میں اڑا اڑا کر دیتا پھرتا تھا۔

آجکل کپڑے کی بڑی بڑی دوکانوں میں گاہکوں کے چائے پانی کا انتظام اور اس کے لئے ایک خاص کمرہ ایک معمولی بات ہے جہاں دوکان کی طرف سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ مگر شاید پیرس میں سب سے پہلے موسیو شوشارد کو ہی یہ سوجھی تھی کہ اپنے ہاں کے خریداروں کو مفت چائے قہوہ وغیرہ پلائے اور اس زمانہ میں اس خاص صیغے کی طرف خلقت کا اس قدر رجوع ہوا تھا کہ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ اس تجویز کی کامیابی تکلیف دہ ثابت ہونے لگی ہے۔

موسیو شوشارد نے بے انتہا روپیہ پیدا کیا اور مرتے وقت نہایت فیاضی سے اسے مفید عام اور خیراتی کاموں میں لگا گیا۔ وہ لاوارث تھا مگر اپنے دوستوں اور ملازموں سے جاتے جاتے ایسا سلوک کر گیا جو عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی مشکل ہو سکتا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ یعنی اٹھارہ لاکھ روپیہ اپنے کارخانے کے ملازموں میں تقسیم ہونے کے لئے اس نے چھوڑا۔ اپنے دوست اور مشہور ملکی مدبر جارج لیگ کو چار لاکھ اسی ہزار پونڈ۔ اس کی بیوی کو چالیس ہزار پونڈ اور اس کے دونوں بیٹوں کو چالیس چالیس ہزار پونڈ دے گیا۔ فیگارو نام ایک اخبار جو پیرس سے نکلتا ہے وہ اسے پسند تھا۔ اس کے ایڈیٹر کے حق میں اسی ہزار پونڈ کی وصیت کی۔ پیرس کے غربا کے لئے آٹھ ہزار پونڈ اور ایسی ہی متعدد اور رقمیں وہاں کے خیراتی کارخانوں کے لئے چھوڑ مرا۔ ایک نیکدل خاتون

پیرس کا ایک دلچسپ کتبہ

موسیو شوشارد پیرس کی تجارتی دنیا میں ایک نہایت نامور شخص تھا جو تھوڑا عرصہ ہوا فوت ہو گیا ہے۔ کپڑے کی دوکانوں میں شاید سب سے بڑی دوکان پیرس میں اسی کی تھی۔ یہ شخص بالکل اپنی قوتِ بازو سے دولتمند بنا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تجارت میں اس کا دماغ خوب لڑتا تھا۔ مگر اس کی طبیعت کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نئے نئے خیال اور نئی نئی ترکیبیں کاروبار کی ترقی کی ایجاد کرتا رہتا تھا پیرس کی عورتوں میں اس کا نام زیادہ تر اس لئے یادگار رہیگا کہ وہ کپڑوں کے ٹکڑوں کی سیل[1] کا بانی تھا۔ سنا ہے کہ جب اس نے پہلے پہل اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ قیمتی ریشموں کے ہزاروں تھانوں کو پھاڑ کر مختلف ناپ کے چھوٹے بڑے پارچے کر دیے جاویں اور وہ یوں بیچے جائیں کہ گویا بچے کھچے ٹکڑے ہیں۔ نہ صرف اور سوداگر اس خبر کو سن کر حیران ہوئے بلکہ خود اس کے ملازم سمجھتے تھے کہ یہ کیسا حکم ہے۔ مگر جس قدر کامیابی اس کی دوکان کو اس تدبیر سے ہوئی اس سے ثابت ہو گیا کہ اس کا خیال بہت دور پہنچا تھا۔ اس کے ہمسروں نے بھی تھوڑی دیر بعد اس کی تقلید شروع کی اور اب فرانس میں یہ رواج بہت عام ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی پسند کیا جانے لگا ہے۔

دوکان کے اشتہار کے لئے ایک اور خوبصورت تجویز اسے سوجھی تھی اور وہ یہ کہ رنگا رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیلون بھر کے اس نے ہوا سے

---

[1] سیل کے معنی فروخت کے ہیں۔ اصطلاح میں فروخت کے اس طریق کو کہتے ہیں جس میں سال تمام کے آخر پر دوکان کی سب چیزیں رعایتی قیمت پر بیچی جاتی ہیں۔

گوارا کرتا۔ اور میدان میں آکر جلتی ہوئی آگ پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور جلتی لکڑی کی حرارت کا اس قدر حصہ بخار بننے میں جذب کر لیتا ہے کہ آخرکار وہ جلانے والی حرارت کے درجہ سے کم ہو جاتی ہے۔ اور ہوا کی آکسیجن آگ کو قائم رکھنے کے لئے لکڑی کے ذرات کے ساتھ نہیں مل سکتی۔ اور لکڑی اپنی اصلی حالت میں قائم رہتی ہے یا لکڑی کا گھر بنا رہتا ہے۔

پانی بیچ میں پڑکر اول ہوا کی آکسیجن کو لکڑی کے ساتھ نہیں ملنے دیتا۔ پھر اپنے قدم جماتا ہے۔ پھر بخار بنکر لکڑی کی حرارت کم کر دیتا ہے اور پھر اگر آکسیجن میدان میں آبھی جاتی ہے تو محض لاشے اور بیکار ثابت ہوتی ہے۔

لیکن یہ لڑائی دم کے دم میں سر نہیں کر لی جاتی۔ بلکہ اگر دونوں طرف طاقت برابر ہوتی ہے تو گھنٹوں جاری رہتی ہے۔ اور دونوں طرف سے داؤگھات ہوتے رہتے ہیں۔ اور نہیں معلوم ہوتا کہ کون فتحیاب ہوگا اور کس کو شکست ملیگی۔ کبھی پانی کی ایک زبردست زد آگ کے شعلوں کے ساتھ ٹکرا کر آسانی سے پہلے ہی حملہ میں انہیں نیم جان کر کے فتح حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن اگر امداد پانی کی کمک وقت پر نہ پہنچے تو حرارت زیادہ ہوکر آگ کے شعلے پہلے سے بھی زیادہ زور کے ساتھ بھڑکنے لگتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی تیل کا کام دے رہا ہے۔ یا پانی میں آگ لگ رہی ہے +

محمد سعید صوفی (از رسالی لینڈ

افریقہ)

مگر یہ ہلکیں آکسیجن اور نائٹروجن کی طرح یوں ہی نہیں ملی ہوئیں۔ بلکہ کیمیاوی طریقے سے اس طرح ملائی گئی ہیں کہ اُن سے ایک رقیق چیز بن گئی ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے مگر گرمی سے ان دونوں گیسوں کا یہ کیمیاوی انفصال اور ارتباط ٹوٹ جاتا ہے اور سیال مادہ ضائع ہو کر آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر جس قدر حرارت سے یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں اُس سے کم درجے کی حرارت سے وہ پانی سے بھاپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے پس اب پانی سے آگ بجھ جانے کا مسئلہ حل ہوا جاتا ہے۔

فرض کرو کہ ایک گھر جل رہا ہے اور آگ بجھانے والے لوگ انجن سے اُس پر پانی چھڑک رہے ہیں۔ اور چونکہ جلتی ہوئی لکڑیوں کی حرارت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ پانی کو فوراً بھاپ بنا دیتی ہے۔ پس اس طرح جو حرارت پانی کو بھاپ بنانے میں خرچ ہوتی ہے وہ خود لکڑی کی حرارت میں سے کم ہو جاتی ہے۔ اور اگر پانی کی مقدار زیادہ ہو تو وہ رفتہ رفتہ جلتی ہوئی لکڑی میں سے اس قدر حرارت جذب کر لیتا ہے کہ آخر کار خود لکڑی کی حرارت جلانے والی حرارت کے درجہ سے کم ہو جاتی ہے۔ اور حرارت کے اس درجے سے کم ہونے ہی ہوا کی آکسیجن لکڑی کے ذرات کے ساتھ ملنی بند ہو جاتی ہے۔ اور آگ بجھ جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کارکنان قضا و قدر جو آگ اور پانی کے ماتحتی میں علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں۔ وہ چیزوں کے ذرات کے باہمی اتصال کے متعلق رہا کرتے ہیں۔ جب آگ جلتی ہے تو وہ ہوا کی آکسیجن کو لکڑی کے ذرات کے ساتھ ملا کر انہیں راکھ اور دھوئیں کی صورت میں ترتیب دیتی ہے یا لکڑی جل کر کوئلا ہو جاتی ہے۔

مگر جب پانی کی رگِ حمیت جوش میں آتی ہے تو وہ آگ کی یہ دراز دستی نہیں

سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ بلکہ وُہ ایک نئی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور نیچر کے کارندے جو آگ کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ لکڑی کے باریک ذرّوں کو دوبارہ ترتیب دیکر اُن کی صورت بدل دیتے ہیں۔ اور لکڑی کا کچھ حصّہ سیاہ مادّہ کی صورت میں زمین پر پڑا رہجاتا ہے۔ اور کچھ حصّہ بڑے بڑے بادل بنکر آسمان کیطرف اُڑجاتا ہے۔

جلنے سے پہلے لکڑی یا اور کوئی شے حرارت کے اُس درجہ تک گرم ہونی چاہئیے۔ جسے "جلانے والی حرارت" کہتے ہیں۔ اور جس کا درجہ بہت اونچا ہوتا ہے مختلف چیزوں کے جلنے کے لئے مختلف درجوں کی حرارت۔ یا گرمی کی مختلف مقدار درکار ہوتی ہے۔

لکڑی یا اور مختلف اشیاء کو جنہیں ہم رات دن برتتے ہیں جلانے کے لئے اوّل ہم اُنہیں جلانے والی حرارت کے درجہ تک گرم کرتے ہیں۔ پھر ہوا کی آکسیجن اُن کے ساتھ ملتی ہے اور وُہ جلنے لگتی ہیں۔

خُدا کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسان ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی بڑا احسان ہے۔ ورنہ اگر کہیں جلانے والی حرارت کا درجہ اُونچا ہونے کے بجائے نیچا ہوتا تو ہوا میں اس کثرت سے آکسیجن موجود ہے کہ وُہ روئے زمین کی تمام جلنے والی چیزوں کے ساتھ مل کر انہیں خاک سیاہ کر دیتی۔

پانی آگ کو کیونکر بجھاتا ہے؟

اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اوّل ہمیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ خود پانی کیا چیز ہے؟ پانی میں بھی نہ دکھائی دینے والی دو گیسیں ہیں۔ یعنی

(۱) آکسیجن۔

(۲) ہائیڈروجن۔

آگ اور پانی

عام خیال تو یہ ہے کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے کیونکہ پانی تر ہے۔ اور آگ اور پانی میں ہمیشہ سے عداوت چلی آتی ہے۔ ان میں نہ کبھی موافقت ہوئی ہے اور نہ ہونی ہے۔ مگر در اصل یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں ہے جیسا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جب آگ اور پانی ملتے ہیں تو کارکنانِ قضا و قدر کیا کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں اول یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آگ کیا چیز ہے اور جب یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو سائنس کے اس مشہور حصہ کا جسے علم کیمیا کہتے ہیں ایک اہم مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو جائیگا۔ جب کسی گھر کو آگ لگ جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ جل رہا ہے مگر کوئی چیز بغیر ہوا کی امداد کے نہیں جل سکتی۔ ہوا کو ہٹا لو تو پھر جس طرح ایک دیا سلائی دکھانے سے لوہے کا شہتیر نہیں جل سکتا۔ اسی طرح ٹیوننس اور رنگزنی کے گھر کو بھی آگ نہیں لگ سکتی۔ جس طرح انسان کے زندہ رہنے کے لئے ہوا درکار ہے اسی طرح آگ کو بھی ہوا کی ضرورت ہے۔

ہوا میں خاص کر دو دکھائی نہ دینے والی گیسیں شامل ہیں۔

(۱) آکسیجن۔

(۲) نائٹروجن۔

آگ جلانے کے لئے صرف آکسیجن کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز جلتی ہے تو ہوا کی آکسیجن جلنے والی چیز کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اور اس چیز کی بجائے دوسرے نئے مرکبات تیار ہو جاتے ہیں۔ جلنے والا گھر راکھ کے تودے اور اڑنے والے دھوئیں کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ مگر اس قلب ماہیت

اتفاق ہے۔ میرے ایک دوست منشی میر احمد علوی بی۔ اے کاکوروی جو مولوی محسن صاحب کاکوروی کے لائق نواسے ہیں۔ وہ پہلے ہی سے منتخبات میر انیس کی ترتیب کا تہیّہ کر چکے ہیں۔ میں آپ کا خط انکو بھیجدوں گا۔ اُمید کہ جناب موصوف اپنی تالیف میں آپکے مشورہ صائب کا لحاظ رکھیں گے۔ میں خود بھی اُنکو تاکید کردونگا۔"

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ منشی میر احمد صاحب کی تالیف کی نوعیت جدا ہے۔ لہذا مَیں اس مضمون کے ذریعے سے خاص طور پر بہ ادب علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں۔ کہ آپ اس کام کو سرانجام فرمانے کا وعدہ فرمائیں۔ چھپوانے کا ذمہ مَیں لونگا۔

مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے دہلوی اور جناب میر رشید صاحب (یادگار جناب میر نفیس مرحوم) کی خدمت بابرکت میں بصد عجز التجا ہے۔ کہ آپ بوجہ احسن اس کام کو سرانجام فرما سکتے ہیں۔ آپ اپنے بے بہا وقت کا کچھ حصّہ تھوڑے عرصے کے لئے اس کام کے واسطے وقف فرماکر۔ ملک و قوم پر احسان فرمائیں۔ بلکہ بعض وجوہ سے یہ آپ کا فرض ہے۔ آپ ضرور اسے ادا فرمائیں۔

اگرچہ یہ کام چنداں مشکل نہیں۔ زندہ دلان پنجاب بھی اس کو سرانجام کر سکتے ہیں (اور ممکن ہے بالآخر انہی کو کرنا پڑے) لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کی تکمیل کا سہرا لکھنؤ کے سر رہے۔ تحریک کی عزت پنجاب کو حاصل ہے +

سید علمدار حسین واسطی

(از پٹیالہ)

اُنہوں نے پھر پوچھا۔ "او حضور! یہ ٹھیلی ہوئی کیا؟" بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اے جناب! یہی اپنی ہوئی ہوتی نہیں کیا؟ اپنی ہوئی" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

پس جب اہلِ لکھنؤ کا یہ حال ہو۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ جن کو وہ عجم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود میر انیس علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے۔ کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اور کوئی اس کی قدر کیا جانیگا اور ہماری زبان کے لطف کو کیا سمجھیگا" لہٰذا واجب آیا۔ کہ میر صاحب کا کلام اور لطفِ زبان بھی خواہان و خیر اندیشانِ اردو کو سمجھایا جائے۔ اور یہ اسی طرح ممکن ہے۔ کہ میر صاحب کے کلام کو بتصحیح و تحشیہ نہایت تکلف صحت اور اہتمام سے چھاپا جائے جس طرح منشی رحمۃ اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور میں مسدس حالی نہایت صحت صفائی تشریح اور حواشی کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس میں تلمیحات کی تشریح نہایت اہتمام اور التزام سے کیگئی ہو۔ چنانچہ مسدس مذکور کا ایک مصرعہ ہے۔ "جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی"۔ علاوہ ٹیگس اور گنگا کی جغرافیائی کیفیت بیان کرنے کے۔ ناظرین کی دلچسپی اور تعارف کے لیے ٹیگس اور گنگا کا نقشہ بھی شامل کتاب کر دیا ہو۔ بہرحال منتخبات انیس' اسی حسن و اہتمام سے چھپنا چاہیے۔

عرصہ ہوا میں نے اپنا یہ خیال علامہ شبلی کی خدمت میں عرض کیا تھا ممدوح نے اس رائے کی پرزور الفاظ میں تائید اور اس خیال کی بیحد تعریف فرمائی تھی۔ بلکہ خود اس کے سرانجام فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مگر غالباً بوجہ کثرتِ مشاغل اس کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

پھر مولوی فضل الحسن حسرت موہانی کی خدمت میں لکھا۔ اُنہوں نے تحریر فرمایا کہ میر انیس مرحوم کے باب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اس سے مجھ کو بھی

ظاہر ہے کہ "تلوار" کا ذاتی نام صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ "تلوار" یا "تیغ" یا "سیف" باقی صفاتی ہیں۔ جب صفاتی ہیں تو اُن کی نوعیت میں بھی کم و بیش فرق ہونا چاہیئے۔ پس فٹ نوٹ کے ذریعے سے یہ بتایا جائے۔ کہ ان سب ناموں کا مسمّٰی یہ ایک تلوار ہے۔ جو ہم ہمیشہ سپاہی کی کمر میں بندھی دیکھتے ہیں یا مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ اختلاف بتایا جائے۔

"تلوار" کے ساتھ اس کے اوصاف "گھاٹ" "کس" "بل" "دم" "خم" "آب" "تاب" "چمک" "دمک" "برق" "شرق" "نوک" "جھوک" "قیمت" "پانی" "منہ" "زبان" "باڑھ" "تیشہ" "اَنی ہوئی" وغیرہ کی جداگانہ تشریح و تعریف کیجئے۔ اس سے نہ صرف میر انیس کی پایہ شناسی میں مدد ملے گی۔ بلکہ ساتھ کے ساتھ ادبی۔ "عروضی" "اخلاقی" "تاریخی" اور "اصطلاحی" معلومات کی ایک نہایت عمدہ فرہنگ تیار ہو جائیگی۔

مجھے اس وقت ایک بات یاد آئی۔ جو بجائے خود لطیفہ ہے۔ کوئی دو برس ہوئے۔ راقم کو ایک لکھنوی ذاکر کی عزتِ میزبانی نصیب ہوئی۔ قابلِ زیارت نوجوان۔ مشہور ذاکر۔ خاندانِ میر صاحب سے تعلق تلمذ بیان فرماتے تھے۔ بے تکلف صحبت تھی۔ میر صاحب کے مرثیوں کے چیدہ چیدہ بند سنانے لگے۔ "پیلا" "سروہی" "کھانڈا" وغیرہ الفاظ جو آئے تو ایک صاحب پوچھ بیٹھے کہ "حضرت"! پیلا اور سروہی اور کھانڈا میں کیا فرق ہوتا ہے؟ تیور بدل کر فرمایا "حضرت! یہ بال کی کھال نکالنا پنجابی قصابوں کی طرح کچھ پنجابیوں ہی کو خوب آتا ہے۔ یہ کوئی لندن (لنڈن) تو ہے نہیں۔ کہ طرحاں طرحاں (طرح طرح) کی تلواریں بنتی ہوں۔ بس یہی ایک تلوار ہے۔ جو آپ ہمیشہ دیکھتے ہیں"۔ ماشاء اللہ!

جہاں فوج حسینی کا ذکر آیا ہے۔ وہاں حُر۔ وہب۔ حبیب ابن مظاہر۔ مسلم بن عوسجہ۔ زہیر قین۔ دیگر انصار امام اور جوانانِ بنی ہاشم کے حالات اپنے اپنے موقعہ پر بطور حاشیہ لکھنے چاہئیں۔

لڑائی کے موقع پر فن سپہگری سے متعلق جو اصطلاحات صرف فرمائی ہیں۔ اُن کی تشریح کی جانی ضروری ہے۔ آلاتِ حرب جو اُس وقت کام آتے تھے۔ اُن میں سے صرف نیزہ اور تلوار باقی ہیں۔ اوروں کا پتہ نہیں۔ آج مارٹن ہنری بندوقوں ڈائنامیٹ اور بمبے گولوں کے ہاتھ میدان ہے۔ "تیر" اور "کمان" "گرز" اور "کمند" وغیرہ کے نام ہی نام رہ گئے ہیں۔ آج کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ "تیر" اور "ناوک" اور "خدنگ" (جنکا میر صاحب کے کلام میں بار بار نام آتا ہے) میں کیا فرق ہوتا ہے۔ "سوفار" "پیکان" "شہری" کس کو کہتے ہیں۔ اِسی طرح "کمان" "چلّہ" "گوشہ" وغیرہ سے ناواقف ہیں۔ پس ان سب اجزائے تیر اور کمان کی جداگانہ تعریف بیان کرنی چاہیے۔ "تیر" "کمند" کی تعریف اور اس کے داؤ پیچ کی تشریح۔

علیٰ ہذا جہاں نیزے کا ذکر آیا ہے تو "بولی" "برچھی" "مجھل" "انی" "سنان" "دانہ" "بند" وغیرہ اجزائے نیزہ کے نام بھی آتے ہیں۔ اور بڑی بے تکلفی اور خوبصورتی سے۔ اور "بند باندھنا" وغیرہ اصطلاحات بھی آئی ہیں۔ جس سے حُسنِ کلام دوچند ہو گیا ہے۔ پس ان اجزائے نیزہ اور فنِ نیزہ بازی سے متعلق اصطلاحات کی تشریح بھی کی جائے۔ کیونکہ بغیر اس کے کلام کی حقیقی اور اضافی خوبیاں ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

"تلوار" کے ذکر میں میر صاحب نے ایک تلوار کے بہت سے نام لئے ہیں۔ مثلاً۔ "تلوار" "شمشیر" "تیغ" "سیف" "پیلا" "کھانڈا" "سروہی" "نیمچہ" وغیرہ۔

جس کے لغات۔ محاورات۔ روزمرہ اور اصطلاحات کی فٹ نوٹس کے ذریعے
تشریح کی گئی ہو۔ اور اس کو احتیاط کے ساتھ نہایت تکلف اور اہتمام سے
چھپوایا جائے۔ اول ایک مبسوط مضمون اغراض و اہمیت شہادت سے متعلق
دیباچے کے طور پر لکھا جائے۔ اور ایک دوسرا مضمون مؤلف کی جانب سے
ایسے ضروری مطالب ظاہر کرے۔ جس سے اصلی مناظر کربلا اور عراق
کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے۔ پھر اصل کلام پر حاشیہ لکھا جائے۔

مثلاً میر صاحب کے کلام میں جا بجا تلمیحاً "احد" "خندق" "خیبر" "صفین"
"نہروانی" "بدر" وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ تو فٹ نوٹ کے ذریعے سے یہ بتانا چاہیے۔
کہ یہ لڑائیاں کب ہوئیں؟ کیوں ہوئیں؟ کس کے ساتھ ہوئیں؟ اور کس سنہ میں؟
اور نیز یہ بھی بتانا چاہیے۔ کہ "احد" یا "خیبر" یا "بدر" کہاں واقع ہے؟ ان تشریحات
سے علاوہ اور دلچسپیوں کے حضرت رسالت صلعم کی حیات مقدس کے حالات
سے بھی ایک گونہ واقفیت اور معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔

اگرچہ علم اسماء الرجال عرب کی خصوصیات میں شمار ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں
کے حصہ کی چیز ہے۔ لیکن آجکل کے لوگ۔ جنرل روگی۔ جنرل لکھارٹ۔
جنرل سنائیسل۔ لارڈ کچنر۔ ہینڈو اور لیکرسنگھ کے حالات پڑھنے والے
نہیں جانتے۔ کہ عمر ابن سعد کون تھا؟ خولی کون؟ شمر کس دسیہ کا نام ہے؟
اور سنان بن انس کس مردود کا؟ اور عنتر و مرحب کن جانوروں کے نام ہیں؟
لہٰذا ان کے علیحدہ علیحدہ پتہ سے کھولنے چاہئیں۔ کہ یہ کون تھے؟ کہاں
کہاں کے رہنے والے تھے؟ خاندان رسالت سے ان بے رحموں کو اس قدر
بغض کیوں تھا؟ کب کب پیدا ہوئے؟ اور کس کس سال واصل جہنم ہوئے؟
کچھ پڑھے لکھے تھے؟ یا محض کندہ ناتراش؟

اُسے شاعری میں اگر کہیں مل سکتا ہے۔ تو وہ میر صاحب کا کلام ہے۔
میں تو کہتا ہوں علامہ شبلی آپ جگ جگ جئیں۔ آپ کی کوششوں کو چار
چاند لگیں۔ کہ آپ نے میر صاحب کے کلام کو اصولی نظر سے ملاحظہ فرمایا۔ "موازنہ
دبیر و انیس" کو میں آپ کی اولیات سے سمجھتا ہوں۔ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں
نے زمانہ حال کے اصولِ تنقید کے موافق میر صاحب کے کلام پر ریویو لکھا۔
اور بعض ایسے نکات کی تشریح فرمائی۔ کہ ہر شخص کا ذہن اُدھر منتقل نہیں ہو سکتا۔
موازنۂ انیس کے بعد۔ مولینا اشہری اور حضرت احسن نے اِدھر توجہ فرمائی
اگرچہ یہ ہر دو تالیفات نقشِ ثانی و ثالث ہیں۔ اور ان سے بہت سے مفید
کو اجمالی حالات میر صاحب کی تعلیم و تربیت کے متعلق معلوم ہو گئے۔ تاہم کلام کے
متعلق جو باتیں لکھنے کے قابل ہیں۔ انکے لکھے جانے کی ضرورت باقی رہے
مثلاً یہ کہ میر صاحب کے مرثیوں کے خصوصیات کیا ہیں؟ اور ہر موقع کی تصویر کھینچنے
میں جو مخصوص استعمال الفاظ۔ اصطلاحات اور محاورات استعمال کئے گئے۔ اس
سے کلام میں کیا خوبی اور شان پیدا ہو گئی ہے۔ فنِ سپہگری سے متعلق اصطلاحات
کی فٹ نوٹ کے ذریعے سے کچھ تشریح و صراحت ضرور ہے۔ جس سے معنیٔ
کلام ہر شخص پر آئینہ ہو جائیں۔ کیونکہ میر انیس علیہ الرحمۃ نے بیسیوں ایسی اصطلاحیں
اور سینکڑوں ایسے محاورے استعمال فرمائے ہیں۔ جو اکثر بلحاظِ محل استعمال [illegible]
ہو گئے ہیں اور بغیر تشریح جن کا لطفِ نظم اور تو اور بیشتر اہلِ لکھنؤ نہیں اُٹھا
سکتے۔ رفعتِ تخیل۔ وسعتِ معلومات۔ شانِ کلام اور اندازۂ کمال۔ عام
طور پر ہونا بالکل ناممکن ہے۔ بس یہی میرے اس مضمون کا موضوع ہے۔
میری رائے ہے کہ میر صاحب کے کلام سے نہایت اعلیٰ اور چوٹی کے مرثیے
منتخب کئے جا کر تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ ایک ایسا رسالہ تیار کیا جائے۔

کی کیفیتیں۔ ظلم و عدل کی تصویریں۔ قساوت و رقتِ قلب۔ بے رحمی و خوفِ
خدا۔ گمراہی و رہنمائی۔ صادق و بے ریا محبت۔ مادی ترقی و روحانی عروج
عشقِ الٰہی کے بہترین نمونے۔ اور محاسنِ اخلاق کے ہو بہو فوٹو موجود ہیں۔

اگر غور و تدبر اور امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو اسی مذہبی شاعری سے
معلوم ہو سکتا ہے کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں فوجوں کے لڑنے
کا کیا ڈھنگ تھا؟ معرکۂ جنگ میں کون کون سے باجے بجتے تھے؟ میدانِ
جنگ میں فوجیں کس طرح صف آرا ہوتی تھیں؟ آلاتِ حرب کیا کیا تھے؟
اسلحہ کیا کیا؟ فوجیں آج کل کی طرح لڑتی تھیں یا کوئی اور طریق تھا؟ سردارانِ
فوج اپنے اپنے لشکریوں کو کس طرح ہٹاتے بڑھاتے تھے؟ اور کس طرح رجز
خوانیاں ہوتی تھیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میر صاحب کی شاعری کی اس صنف میں یہ ایک امتیازی اور مذہبی خصوصیت
ہے۔ کہ ظالم و مظلوم کی تصویریں بالمقابل کھینچ دی گئی ہیں۔ جس سے ہر شخص کو
ظلم و بے رحمی۔ شقاوت و قساوت سے نفرت و تنفر اور کل محاسنِ اخلاق
سے رغبت و محبت ہو سکتی ہے۔ اور یہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ اگر انسان کو
معرفتِ حق کما حقہٗ حاصل ہو جائے۔ تو اسکو سخت و صعب ترین مصیبت اور
انتہائی سے انتہائی صدمہ رنج و غم صراطِ مستقیم سے بھٹکا نہیں سکتا۔ نیز یہ کہ خاصانِ
خدا کسی حالت میں اخلاقِ حسنہ اور شریعتِ حقہ کے خلاف ہرگز کوئی کام نہیں کرتے
صلۂ رحم۔ انسانی ہمدردی۔ اقربا نوازی۔ ایثار علی النفس۔ غرض کل محاسنِ مذہب
و اخلاق کی تکمیل ہر حالت میں انکو مدِ نظر رہتی ہے۔

بہر تقدیر جو باتیں کہ دماغی تربیت اور تہذیبِ اخلاق کے لئے ضروری ہیں
ان کا بیشتر حصہ اس مذہبی شاعری میں موجود ہے۔ اور ایک پوئم کا اعلیٰ نمونہ

لیکن میر مونس۔ میر وحید۔ میر نفیس (غرض کس کس کا نام لیا جائے) کسی کی تصنیف
اٹھا کر دیکھ جائیے۔ ایک سے ایک بڑھ کر گوہر نایاب اور دُرِ خوش آب پائیے گا
اور میر انیس تو وہ معجز نگار بزرگ ہیں جن کی ذات جامع الکمالات پر زبانِ اُردو
جب تک زندہ ہے۔ بجا ناز کر سکتی ہے۔

بہرحال زبانِ اُردو کی جو گراں قدر اور مہتم بالشان خدمت اِس خانوادۂ
سیادت نے کی ہے وہ کسی انجمن سے ہو سکی۔ نہ اخبار سے اور نہ رسالے سے
اور یہ نہیں کہ معمولی گنواری بول چال۔ یا بے محل الفاظ کی بھرتی کر دی ہو۔ بلکہ
یہی وہ زبان ہے۔ جس کو کل اساتذۂ اُردو نے مستند اور ٹکسالی تسلیم کیا ہے۔

دبیر اور انیس کی شاعری سے متعلق اہلِ ملک کی مختلف رائیں ہیں۔
میری نظر میں دونو بزرگ یکساں واجب التعظیم ہیں۔ مگر جو چیز دبیر اور انیس
کی شاعری میں ما بہ الامتیاز ہے۔ کلام انیس کو کلام دبیر سے قطعۃً علیحدہ کرتی
اور ممتاز بناتی ہے۔ وہ لطافتِ زبان ہے۔ جو بجز میر صاحب کے اور کسی کو
نصیب نہیں ہوئی۔ میر انیس کے محاورات اور روزمرہ نہیں۔ آفتابِ فصاحت
کی شعاعیں ہیں کہ صفحۂ قرطاس کو روشن اور عالمِ اُردو کو نورانی کر رہی ہیں۔

مگر تعجب ہے تو اس کا کہ ابنائے وطن نے میر صاحب کو خالص مذہبی شاعر اور
اُن کے کلام کو محض مذہبی شاعری فرض کر کے۔ ان کی تصنیف سے بے اعتنائی
فرمائی۔ اور جن حضرات نے میر صاحب کے کلام کو ملاحظہ بھی فرمایا۔ تو اُسی وقتی ضرورت
اور نیت سے جس سے وہ اکثر تحفۃ العوام کو دیکھتے ہیں۔ میرے نزدیک دونو
گروہوں سے ایک نے بھی وسعتِ نظر سے کام نہیں لیا۔ ورنہ وہ دیکھتے
کہ علاوہ مذہبی شاعری کے میر صاحب کے مرثیوں میں ہزاروں اخلاقی نکتے۔ تاریخی واقعے
جغرافیائی اشارے۔ جنگی کارنامے۔ جذبات کے مرقعے۔ مناظرِ قدرت

سخت افسوس اور تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ خود جناب میر صاحب کے خلف الصدق جناب میر خورشید علی صاحب نفیسؔ مرحوم مغفور نے بھی ادھر کچھ توجہ نہ فرمائی۔ باوجودیکہ ممدوح اس صنف کے بلند مرتبہ شاعر تھے اور اپنے والد مرحوم کے نبض شناس۔ لیکن اس کام کو غیر ضروری سمجھا گئے۔ چنانچہ شمس العلما مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے اپنی ناکامیابی پر نسخۂ آب حیات میں اظہار حسرت و افسوس فرمایا ہے۔

شاید یہی وجوہ ہوں کہ ملک کے بیشتر اہل ذوق میر انیسؔ کی سرزمین شاعری کے حدودِ اربعہ سے ناواقف ہیں۔

یوں تو اردو کی حمایت میں مہ کے رم کاغذ سیاہ کئے جاتے ہیں۔ جلسوں میں پرزور تقریریں ہوتی ہیں۔ گورنمنٹ کی خدمت میں حفاظت و قیام اردو کے لئے میموریل پیش کئے جاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو قائم کی جاتی ہے۔ انتقا و اردو سبھا کی تجویزیں ہوتی ہیں۔ اور اردو کو تمام ملک کی مشترکہ زبان بیان کیا جاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی قابل فخر کوششوں کو۔ ان کے سرمایۂ ناز حاصل کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ جو قلم کے دھنی لاوارث۔ حقیر اردو کو مرس اُردو کو پاکیزہ و پُر لطف اردوئے معلّٰی بنا گئے۔ جو اس چٹیل میدان کو گلزارِ پربہار کر گئے۔ اس تلوار کو سان پر چڑھا گئے۔ اس چشمے کو صاف و شیریں کر گئے۔ اس سکے کو ٹکسالی بنا گئے۔ اور اس بازار میں الفاظ و محاورات کے انبار لگا گئے!!

اس میں کچھ شک نہیں کہ میر انیسؔ علیہ الرحمۃ کا خاندانِ شرافت نشان سات پشت سے علمی خاندان چلا آتا ہے۔ ادب اردو کی اتنی مستقل اور مسلسل خدمت زبانِ اردو کو ایسی پاکیزگی و لطافت روزمرہ اور محاوراتِ اردو کو اتنی حیرت انگیز وسعت کسی مصنف سے نہیں مل سکی۔ جیسی اس خاندان نے دی۔ میر ضاحک

اور ندامت کے ساتھ دیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہم یہی نہیں سمجھے۔ کہ انیس کون تھے؟ کیا تھے؟ اور کیا کام کر گئے؟ کتنی شرمناک بے حسی ہے۔ کہ انیس کا سا آفتاب جہانتاب اردو دنیا سے اٹھ جائے۔ اور کروڑوں کی تعداد میں ہواخواہان اردو موجود ہوں لیکن اس قدر بھی غور نہ کریں۔ کہ انہوں نے اردو کی کیا خدمت کی؟ زبان کو صاف اور فصیح کیا؟ اور اس کو وسعت دیکر ہم پر کیا احسان کر گئے؟ اور ہمارے ذمے ان کے کیا حقوق و خدمات ہیں؟

چشم بد دور یوں تو اس وقت بھی ملک میں سینکڑوں "انیسئے" موجود ہونگے مگر بڑی سے بڑی اڑان بھری۔ تو کسی عقیدت مند و مخلص نے ایک آدھ قطعہ تاریخ وفات لکھکر حق عقیدت و ارادت ادا کر دیا۔ اور ان کے کلام کو جزو دان میں باندھ کر ہوا نہ لگنے دی۔ گویا اسی قدردانی تک ان کا فرض تھا۔ اس سے زیادہ کے لئے وہ مکلف نہیں۔

میر صاحب کی سوانح عمری۔ ان کے حالات زندگی۔ ان کے کلام پر تنقید لکھنا تو ایک اہتمام بالشان کام تھا۔ ان کے معتقدین بلکہ اعزہ اور اقربا تک سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ مرحوم کے کلیات کا ایک صحیح و مستند نسخہ تو تیار کر دیتے۔ اس بے دردی۔ مردہ دلی۔ بے حسی اور بے پروائی کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہاں تک بخل روا رکھا گیا۔ کہ میر صاحب کے جو اصل سے اصل مرثیے پریس تک نہ پہنچے تھے۔ مرحوم کے گھرانے والوں نے آپس میں اس طرح تقسیم کر لیئے جیسے جائداد۔ اور انہیں اس طرح چھپایا جیسے چوری کا مال۔ اکثر متداول اور مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند الحاقی بیان کئے جاتے ہیں۔ رسم الخط اور کتابت کی غلطیاں تو اس قدر ہیں۔ کہ ناقدردانی اور بے توجہی پر غصہ اور افسوس آتا ہے۔

میر انیس اور ہم

شاہِ اقلیمِ سخنوری - رشکِ ہومر و فردوسی - جناب میر ببر علی صاحب انیس لکھنوی اعلی اللہ مقامہٗ دُنیائے اُردو میں وُہ باکمال و معجز نگار شاعر گزرے ہیں کہ اگر یہی بزرگ یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج اُن کے بے مثل کمال کی چار دانگ عالم میں دُھوم مچی ہوتی - اُنکے نام پر کلب قائم ہوتے - لائبریریاں بنائی جاتیں - طلبا کو "انیس اسکالرشپ" کے نام سے وظائف دیئے جاتے اُن کے مسودے - ان کے قلم کی لکھی ہُوئی نایاب تحریریں - ان کے خطوط عجائب خانوں میں تبرکاً محفوظ ہوتے - اُن کے ارفع و اعلیٰ تخیل لطیف و پاکیزہ استعارات - نادر اور اچھوتی تشبیہات - پُرلطف روزمرہ اور دلنشین محاورات - غرض اُن کے مرصع کلام پر مستند معنی سنج اور مسلم الثبوت ادیب - تشریح و تحشیہ لکھ کر دادِ سخن سنجی او نکتہ فہمی دیتے - ان کی قابلِ رشک تصنیفات کے نہایت اہتمام اور تکلف سے انتخابات چھپوا کر - اہلِ ذوق کے پیش کرتے ان کے سوانح لکھے جاتے - غرض انیس کی شہرتِ علم اور بقائے دوام کے لئے انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جاتا - بچے بچے کی زبان پر کُل اس سرکردہ سخنورانِ ملک کا نام ہوتا - اور کلامِ انیس کی گویا پرستش کی جاتی جس سے نہ صرف اس بے مثل قادر الکلام کی علمی دُنیا میں ممتاز یاد تازہ رہتی بلکہ اہلِ مُلک کی علم دوستی - لٹریری دلچسپی - مشاہیر پرستی - اور رُوحانی برتری کا مادی اور محسوس ثبوت ملتا - جو اُن کی ملکی اور قومی ترقی کا راز ہے -

اور ہم نے کیا کیا ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے - جس کا جواب سخت افسوس

زماں سے کہ ایک دوسرے کا محتسب بنے۔ اور بیجا ناز جوئی اور بے ضرورت نکتہ چینی سے دوسرے کی عافیت میں خلل ڈالے۔ نہ خلوص نہ ارادت نہ محبت نہ الفت۔ خواہ مخواہ دخل در معقولات۔ یہ عادت اچھی نہیں۔ کوئی ان حضرات سے پوچھے۔ میاں سب سے اوّل تم ہی کیوں اپنے گھر کے حالات کسی اخبار میں نہیں چھاپ دیتے۔ کہ میں ایسا کپڑا پہنتا ہوں اور یہ کھاتا ہوں یہ پیتا ہوں۔

جب تک ایسی حالت ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ کوئی بد قسمتی سے کسی کے پاس ہی نہ بیٹھے۔ بات بھی نہ کرے۔ اگر کرے تو اس مخمصہ میں نہ پھنسے۔

نہ جایا کرو بزم رنداں میں شیخ!
یہ مندیل اک دن اُتر جائے گی

تمدنی اغراض کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح زبانی کہانیوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھوتوں اور پریتوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان خیالی فوجداروں اور خواہ مخواہوں سے لڑکوں اور لڑکیوں کو ڈرایا جائے اور اُن کے ذہن نشین کیا جائے کہ خیالی فوجدار اور مسٹر خواہ مخواہ اور انکی ذہنیت بھی بھوتوں پریتوں کی طرح خوفناک ہیں۔ انکی سنگت اور انکی صحبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی وہ ایک باضابطہ حکومت سے زیادہ تر حکومت کرتے ہیں اور ایک حکمران سے بڑھ کر دباؤ ڈالتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مناسب بابت حالات نہ کیجئے۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ خواہ مخواہ ایک دوسرے کی زندگی موردِ آلام اور معرض الالمات نہ بنائی جائے۔ زندگی کا زمانہ بہت ہی مختصر اور پہلے ہی سے خاصہ تاریک ہے اور ہندوستان میں پہلے ہی امنگ اور تفریح ہنگی ملتی ہے۔

عمر عزیز قابلِ سوز و گداز نیست — ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

سلطان احمد (از بہاولپور)

چاہتا ہے وہ خواہ مخواہ اس سے کہلایا جائے۔ اور اُسے مجبور کیا جائے۔

کسی کی بیوی کا کچھ نام ہو تمہیں کیا غرض۔

کوئی کچھ تنخواہ پائے تمہارا کیا تعلق۔

کسی کی کچھ آمدنی ہو تمہیں کیا واسطہ۔

کوئی کچھ کھائے کچھ پیئے تم کیوں جانچ لیتے ہو۔

کوئی سوئے کوئی جاگے تمہیں کیا پڑی ہے۔

کوئی اُٹھے کوئی بیٹھے تمہیں کیا مطلب۔

کوئی جائے کوئی آئے تم ہو کون۔

تکمیلِ تمدن اور تکمیلِ آسائش کے واسطے لازمی ہے کہ اُن طریقوں اور اُن روشوں سے قطعی احتراز کیا جائے جو اس کی منزل میں خلوص اور محبت سے رہنا سیکھو اور ایک دوسرے کی امداد کرو۔ ایک دوسرے کی سرپرستی کرو۔ اور ایک دوسرے کے واسطے مخلص ثابت ہو۔ خواہ مخواہ ہر کام میں روڑے نہ اٹکاتے پھرو۔ نہ تو تم کوتوال ہو اور نہ کراما کاتبین انسان ہو خلوص سے کام لو اور خلوص سے کام کرو۔

غلطی اور لغزش سے کوئی شخص خالی نہیں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی راز رکھتا ہے وہ اس کا ایک حق ہے۔ کوئی شخص سوائے خلوص کے اس کے افشا پر کسی کو مجبور نہیں کر سکتا۔

بیشک نکتہ چینی بھی ایک فرض ہے۔ مگر جو خلوص سے ہو اور دوستی کی وجہ سے۔ اور وہ بھی مناسب حد تک اور مناسب طریق سے۔ نہ ایسی طرح کہ دوسرے کا دل دُکھے۔ یا اپنی خوبی اور برتری کا اظہار ہو۔ میل جول اس لئے بنا ہے کہ اس سے لُطفِ ملاقات بڑھے۔ اور ایک دوسرے کو مدد پہنچے۔

ہیں تو بلطف مخلصانہ کچھ اُس کی امداد کیجئے۔ نہ کہ اُلٹی سردردی اور نکتہ چینی۔

ایک دفعہ ایک پادری صاحب سے کسی خواہ مخواہ نے پوچھا کہ آپ کے لڑکے لڑکیاں کتنی ہیں۔

پادری صاحب نے کہا کہ۔

"میں پچھلی مردم شماری میں لکھا چکا ہوں۔ آپ وہاں سے نقل لے سکتے ہیں"

ایک خواہ مخواہ نے کسی سے پوچھا کہ:۔

"آپکی تنخواہ کیا ہے؟"

اس نے کہا کہ:۔

"آپکی بیوی کا کیا نام ہے"۔

اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسٹر خواہ مخواہ کی باتوں اور سوالات کا اثر دوسروں پر کیا پڑتا ہے اور لوگ کیا خیال کرتے ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ

مسٹر خواہ مخواہ اور ذریاتِ خواہ مخواہ کی موجودگی میں کوئی شخص ہندوستان میں آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یا کوئی شخص سازش سے سفر کر سکتا ہے۔ خدا کی پناہ۔ بات بات میں سوال۔ بات بات میں شک۔ بات بات میں تحکم۔ بات بات میں نکتہ چینی۔ احباب بھی اتنا تنگ نہیں کرتے جتنا یہ خواہ مخواہ کرتے ہیں۔ کوئی کام کی بات نہیں۔ کوئی علمی ذکر نہیں۔ کوئی قومی بحث نہیں کوئی تفریحی داستان نہیں۔ ہندی کی چندی نکالتے اور خواہ مخواہ ستاتے ہیں۔ بیشک ہمیں اس بات کی بھی ضرورت ہو کہ ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کریں اور تمدنی ضروریات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے شناسائی حاصل ہو۔ مگر نہ یہ کہ دوسرے کے گھر کی تلاشی لینے بیٹھیں اور جو کچھ وہ کہنا نہیں

"مولوی صاحب اس کوچہ سے روز گذرتے ہیں۔ کوئی بات ہے خبر رکھنا"۔

"منشی جی بھی کیوں جاتے ہیں۔ اتنا روپیہ کہاں سے بٹورا ہے"۔

"عزیزالدین اور نندلال الگ الگ کیوں پھرتے ہیں۔ ذرا خیال رکھنا کوئی بھید ہے"۔

"یہ اتنے لمبے چوڑے خط کہاں لکھے جاتے ہیں۔ یار کوئی راز ہے"۔

"آجکل تو حاجی صاحب خوب نمازیں پڑھتے ہیں۔ خدا خیر کرے"۔

"یہ آجکل کیوں صاحب بہادر کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ کوئی مطلب نکالے گا"

"ان دونوں کا خوب جوڑ ہے گھٹی رہتی ہے لیکن یہ کب تک"۔

"فلانا وہ اس راہ سے گزریں تو مہربانی کر کے انہیں ذرا ٹھہرانا۔ میں کچھ دریافت کرونگا۔ وہ اس بازار میں روز کیوں آتے ہیں"۔

"اب تو خوب لٹھا خاصہ پہنتے ہیں۔ کہاں سے لوٹ آئی ہے"۔

"بڑے نیک جو ہوئے شرابی کبابی ڈاڑھی منڈے"۔

"تماش بین عیاش پانی کی طرح روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ خدا بچائے"۔

"اگرچہ نمازی ہیں مگر ڈاڑھی منڈوں کا کیا اعتبار"۔

"بڑے تعلیم یافتہ ذات تو پوچھو"۔

"بھئی ان کا کیا حق تھا کہ یہ میر مجلس بن بیٹھے"۔

"یہ ہیں ملک کے نوجوان پتلون پوش"۔

یہ نمونہ ہے ہماری تہذیب اور آداب کا۔ یہ نتیجہ ہے ہماری تربیت کی۔ خیر کا نام ہی نہیں۔ جب جتنی ہے بد ہی سوجھتی ہے۔ خواہ کوئی کسی جگہ بیٹھا ہو۔ مسخر خواہ مخواہ چپ نہیں رہتے۔ کون ان سے پوچھے آپ کو اس سے مطلب ہی کیا۔ کسی کی کچھ تنخواہ ہو اور کچھ مواجب۔ کوئی کسی طرح گذارہ کرے۔ آپ اگر ایسے ہی ہمدرد

سے بات کھل آتی ہے۔ اچھا السلام علیکم بشرط زندگی پھر کبھی۔
بھلا پتہ آپ کا کیا ہے۔ خط تو ضرور لکھا کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔

مخاطب۔ خدا خوش رکھے۔ سلام۔

مسٹر خواہ مخواہ اور مخاطب کی جو گفتگو ہوئی اس سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لوگوں کی زندگی اور معاشرت کس گرداب میں چکر کھا رہی ہے اور اس کی بدولت فرحت اور خوشی یا وجہی طمانیت کس قدر مفقود ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص کے واسطے کوتوالی کا منصب لئے ہوئے ہے۔ جب کوئی شخص دوسرے سے ملتا ہے اس کے ذاتیات میں دخل دیکر اس کی زندگی پر حملہ کرتا اور اُسے ایک ناگوار بحث میں الجھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسرار مخفیہ کے پوچھنے سے بھی احتراز نہیں۔ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ بعض راز کسی سے نہ کہے مگر مسٹر خواہ مخواہ یا اس کی ذریات جاتی اور زور دیتی ہے کہ ضرور اس کا اظہار کیا جائے۔ معمولی رنگ میں نہیں بلکہ مجبور کیا جاتا ہے تنگ کیا جاتا ہے۔

کوئی دو شخص سرگوشی کریں مسٹر خواہ مخواہ خواہ مخواہ دخل دیتے اور کسی منصوبہ بازی پر محمول کرتے ہیں۔

کوئی شخص چار روز گھر سے نہ نکلے چاہے بوجہ بیماری۔ چاہے کسی اور وجہ سے مسٹر خواہ مخواہ خواہ مخواہ پوچھتے پھرتے ہیں۔
"یار کل ! پرسوں گھر سے نہیں نکلے۔ بات کیا ہے۔ طبیعت کہ تو نہیں کرتے۔ تم چار دن سے کچھ اداس ہیں۔ وجہ کیا ہے۔ اگر کچھ سُراغ چلے تو مجھے ضرور خبر دینا۔"

خواہ مخواہ۔ ان کا کیا حال ہے؟

مخاطب۔ بفضل خدا اچھا ہے۔

خواہ مخواہ۔ وہ تو دونوں تماش بین ہیں۔ انکا کیرکٹر خراب ہے اور اُن کی شہرت بُری۔

مخاطب۔ میں تو انہیں اچھا جانتا ہوں۔

خواہ مخواہ۔ آپ کی غلطی ہے۔ ابراہیم تو بے نماز ہے اور نند رام شرابی۔ پھر اچھے کیسے ہوئے۔

مخاطب۔ اگر یہ نقص ہوں بھی تو انکی خوبیاں کہاں گئیں۔

خواہ مخواہ۔ ایک بُرائی تمام نیکیوں کو لیجاتی ہے۔

مخاطب۔ میری رائے میں تو ایک نیکی بہت سی برائیوں کو لیجاتی ہے۔

خواہ مخواہ۔ فرمایئے۔ میں تو انگریزی لباس پسند نہیں کرتا۔ آپ کیوں پہنتے ہیں؟

مخاطب۔ میری پسند اور میرا مذاق آپ کی پسند اور مذاق کے تابع نہیں ہے۔

خواہ مخواہ۔ آپ کے والد صاحب کیا کام کرتے تھے۔

مخاطب۔ (ذرا غصہ میں آکر) آپ کو اِس سے کیا!

خواہ مخواہ۔ بہت اچھا خفا نہ ہوں۔ مگر یہ تو فرمایئے۔ آپ کی ذات کیا ہے؟

مخاطب۔ بندۂ خدا۔ ذات وات کا کیا سوال ہے۔ تمہارے پاس تو بیٹھنا بھی ایک ناگہانی مصیبت ہے۔ سفر سقر ہو گیا۔ معاف کیجئے۔

خواہ مخواہ۔ یہ خفگی تو اچھی نہیں میں تو آپ کا رفیق ہوں۔ سفر کاٹنے کی خاطر یہ گفتگو تھی۔ ورنہ میں بیوقوف نہیں۔ مجنوں نہیں۔ بات

بھئے۔ آپ کا مذہب کیا ہے؟۔
مخاطب۔ میرے مذہب سے کیا سروکار۔ کچھ ہو۔
خواہ مخواہ۔ فرقہ بھی ساتھ ہی بتا دیجئے۔ تاکہ پھر نہ پوچھنا پڑے۔
مخاطب۔ میں مذہب نہیں بتاتا اور آپ فرقہ بھی پوچھتے ہیں۔
خواہ مخواہ۔ کہیں آپ لا مذہب تو نہیں ہیں۔ نوجوانوں خصوصاً انگریزی خوانوں میں اس کا بہت کچھ چرچا ہے خدا پناہ میں رکھے۔
مخاطب۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔
خواہ مخواہ۔ ڈاڑھی کا منڈوانا تو اس بات کی دلیل ہو کہ آپ خدا کو نہیں مانتے ہیں۔
مخاطب۔ ڈاڑھی اور خدا سے کیا تعلق ہے۔
خواہ مخواہ۔ خیر یہ تو بتائیے۔ نچ مجرا تو سنتے ہونگے۔
مخاطب۔ (تنگ آکر)۔ ہاں جناب سنتا ہوں۔ پھر فرمائیے!
خواہ مخواہ۔ فرمائیے ولایت میں بھی یہ فرقہ ہے۔
مخاطب۔ مجھے نہیں معلوم۔
خواہ مخواہ۔ یہ بتلاتے نہیں ہو۔ ہم سے ہی پردہ۔ آخر کچھ تو کہو۔
مخاطب۔ میں کچھ نہیں کہونگا۔ آپ خواہ مخواہ سوال پر سوال کئے جاتے ہیں۔ بو پہلی واقفیت کے اس قسم کے سوالات کرنا تہذیب اور اٹیکٹ کے خلاف ہے۔
خواہ مخواہ۔ معاف کریں۔ بھلا کہئے تو سہی کہ سندر رام اور ابراہیم آپکے واقف ہیں؟
مخاطب۔ ہاں دونوں میرے دوست ہیں۔

کرتو بدولت رفتہ رفتہ کیسے بے لگام ہوتے جاتے ہیں۔ چپ ہی نہیں رہتے

خواہ مخواہ - ہاں ہاں فرمایئے تو سہی۔ بات کیا ہے؟ عہدہ تو آپ کا چشم بددور معقول ہے۔ زیور تو خوب بنایا ہوگا اور کچھ جمع بھی کیا ہوگا۔

مخاطب ۔ آپ کیوں ایسی باتیں پوچھتے ہیں!

خواہ مخواہ۔ ٹرین کا وقت کیونکر کٹے۔ اور اس میں عیب ہی کیا ہے۔

مخاطب ۔ اور فائدہ کیا ہے۔

خواہ مخواہ۔ فائدہ کیوں نہیں۔ واقفیت بڑھتی ہے۔ شرم ہی کیا ہے۔ کچھ کہنے سننے کا بھی شوق ہے۔ میں تو پسند نہیں کرتا۔

مخاطب ۔ مجھے ایسا مذاق نہیں۔

خواہ مخواہ ۔ کیوں۔

مخاطب ۔ میں کیا بتاؤں۔

خواہ مخواہ۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر (یہ جابرانہ بے تکلفی ملاحظہ فرمایئے) یہ بتاتے کیوں نہیں معلوم تو شوقین ہوتے ہو۔ ہنس مکھ ہو بے تکلف ہو۔ پھر یہ بات کیا۔

مخاطب ۔ میں معافی مانگتا ہوں۔

خواہ مخواہ۔ معافی کیسی۔ فرمایئے آپ کی تنخواہ کیا ہے۔ اور اوپر سے کیا کچھ آمدن ہو جاتی ہے۔

مخاطب۔ بندۂ خدا! ایسی باتوں سے کیا حاصل۔

خواہ مخواہ۔ حاصل کیوں نہیں۔ عیب کیا جو بتا دیا۔

مخاطب۔ تنخواہ کی کمی و بیشی سے آپ کو کیا تعلق۔

خواہ مخواہ۔ بیشک کوئی تعلق نہیں لیکن بتانا تو چاہیئے۔ اچھا یہ تو

نہ ابتدا ہے نہ اے یار انتہا تیری

مخاطب اور بھی خاموش ہوگیا۔ اسی خیال سے کہ شاید خود بدولت کی زبان رفتگ معترض اب بھی اس کتر بیونت سے رُکے۔ مگر مسٹر خواہ مخواہ کی زبان اور مُنہ کے حاشا و کلا سے

نخل ہستی سے نمودا ہے کثرت تیری
اصل وحدت ہی تری فرع ہی کثرت تیری

اچھا حضرت! بیوی کے ساتھ محبت تو ہوگی۔ سوشیل میچ ملنا اگرچہ مشکل ہے لیکن آپ کی گفتگو سے ٹپکتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں خوش ہیں خدا ہر ایک کو ایسا ہی مرقہ دے۔

غریب مخاطب کی مزید خاموشی کا یہ جواب یا یہ نتیجہ ہوا کہ مسٹر خواہ مخواہ بیرونی دُنیا سے اندرونی دُنیا میں جا گھسے اور ساتھ ہی یہ پیشینگوئی کی کہ آپ ایک متناسب جوڑہ رکھتے ہیں اور بیوی سے آپ کی محبت ہی۔

مخاطب ناچار بولا میں کیا کہوں ایسی باتوں کی کیا ضرورت ہی کوئی اور بات کیجیے۔

مسٹر خواہ مخواہ کوئی ایسی نرم آسامی نہ تھی کہ اس جواب شریفانہ سے ساکت ہو جاتے۔

ہنس کر کیا فرماتے ہیں۔

بھلا یہ تو معلوم ہوگیا کہ آپ کی بیوی سے بہت محبت ہی۔ ساس اور بہو کی بنتی بھی ہے یا نہیں۔ گھروں کے بعض معاملات بہت ہی تکلیف دہ ہیں۔ مگر پھر بھی غریب مخاطب خاموش مُنہ کی طرف تکتا ہے اور سوچتا ہی

لہ انگریزی لفظ۔ یعنی بیوی مناسب جوڑ۔

کچھ سمجھ میں میرے آتا نہیں مسلک تیرا

حضرت کی شکل سبحان اللہ کیسی بھولی بھالی ہے - چہرہ نورانی - صورت روحانی - تقریر ایسی دلاویز - کلام ایسا مسلسل کہ گویا لارڈ مکالے ایک جوش سے سپیچ دے رہے ہیں - کوئی خیال نہیں کر سکتا کہ حضرت کا رشتہ بھی جنڈالی فوجدار سے ملتا ہے اور خود بدولت بھی اس خاندان کی یادگار عظمیٰ ہیں اور وہی خوبو رکھتے ہیں کہ جو اعلیٰ حضرت خدائی فوجدار کے حصہ میں آئی ہو -
کس بے تکلفی سے پوچھتے ہیں -

کیوں حضرت! آپ کے کتنے لڑکے اور کتنی لڑکیاں ہیں - سب کی شادی ہو چکی یا ابھی تک کوئی کنوارا کنواری بھی ہے -

غریب مخاطب حیران ہے کہ یہ کون حضرت ہیں جنہیں اس کے لڑکے لڑکیوں کی منگائی سگائی کی سوجھی ہو - اور یہ اس طرح متانت سے پوچھتے ہیں کہ گویا کچھ انتظام بھی سوچ کر آئے ہیں - مخاطب خاموش ہو کیا جواب دے اس سوچ میں ہے کہ شاید خود بدولت خود ہی خاموش ہوں مگر مسٹر خوامخواہ کے دل میں ایک دفعہ جو آ جائے وہ کیسے نکلے - مخاطب ٹال مٹول کر کے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہے اور حضرت اسی دھن میں لگے ہیں -

ہاں حضرت بتائیے تو ہی آپ کے لڑکے کتنے ہیں اور بیویاں کتنی - آپ تو مسلمان ہیں - دو تو ضرور ہوں گی - کوئی لڑکا نوکر بھی ہو حضرت بھی کچھ کرتا ہے - اوپر سے بھی آخر کچھ نہ کچھ آمدن ہو گی -

یک نشد دو شد - مخاطب بد قسمت پہلے دل ہی دل میں متعلقات کو ہی رو رہا تھا - اب سلسلہ اور بھی بڑھ چلا - مسٹر خوامخواہ کی زبان رکتی [illegible]

لگائے تجھ میں جو قید جہت وہ کافر ہے

باوجود بجاآوری ان خدمات کے یہ پتہ نہیں چلتا کہ خود بدولت کہاں تشریف فرما ہیں اور کس طرح مختلف مجالس اور محافل میں اُنکا دخل قبض ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی انہیں اپنی مجلس سے بیگانہ رکھنا چاہے تو کیا مجال کہ وہ کبھی اس میں کامیاب ہوسکے بقول مسلمانوں کے ہر انسان کے کندھوں پر کراماً کاتبین سوار رہتے ہیں۔ کراماً کاتبین کو تو کسی نے دیکھا نہیں حضرت مسٹر خواہ مخواہ اور انکی ذرّیات ہر مجلس میں موجود ہوتی اور اپنا تصرف جماتی ہے۔ بیچارے کراماً کاتبین تو خاموشی سے گزرتے ہیں۔ کبھی آواز تک نہیں سُنائی دی اور نہ کبھی آہٹ آئی۔ مسٹر خواہ مخواہ کی طلاقت اور خوش گفتاری سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ حضرت کی زبان اتنی لمبی اور اتنی تیز ہے کہ اسکی زد اور اس کی سیفِ طلاقت سے کوئی محفوظ ہی نہیں رہ سکتا اور پھر اس قدر شیریں کہ حلاوتِ کلام حلاوتِ عسل سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ گو اس کی مخفی نیش زنی مگس انگبین سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کی حلاوت ایک خاص مزہ رکھتی ہے۔

جہاں کو وضعِ جہاں پائمال رکھتی ہے
نئی طرح کی یہ شطرنج چال رکھتی ہے

انکی پہچان خاص کوئی نہیں۔ انسان ہیں۔ مہذب ہیں۔ جنٹلمین ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں شستہ کلام شستہ گفتگو شستہ زبان۔ مؤدب آدابِ مجالس سے واقف۔ شبہ ہی نہیں گذرتا کہ خود بدولت اپنے ذمہ ہمت پر یہ خدمات رکھتے ہیں۔ اور انکا طائرِ ضمیر اس قدر پرواز کرسکتا ہے۔ لاکھ غور کرو۔ اُنکی چال سمجھ میں آتی ہی نہیں ؎

دَیر کی راہ بتاتا ہے ز کعبہ کی شیخ

ہر پانچ بھائی باعتبار خصلت سیرت مشغلہ جدا جدا ہیں گو باعتبار نسل ایک ہی شمار ہوتے ہیں۔ اور اُن کے طبائع اور مزاجوں کی قریباً ایک ہی سی اُفتاد ہے۔ لیکن پھر بھی اُن کے خیالات سے پایا جاتا ہے کہ ہر گوشۂ دنیا میں اُن کی جداگانہ حکومت اور جداگانہ تصرفات ہیں۔ ان ہر پانچ بھائیوں کی جدت طبع اور تصرف علم اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان تھوڑی سی کوشش اور دخل در معقولات سے کہاں تک دنیا میں شہرت پا سکتا ہے اور کہاں کہاں اس کی رسائی اور رسوخ ہو سکتا ہے جس طرح سرزمین ہند میں خدائی فوجدار کی فدیات کی دن بدن کثرت ہے۔ اسی طرح اس کے دوسرے بھائیوں مسٹر خواہ مخواہ وغیرہ کی شہرت اور فدیات بھی کم نہیں ہے۔ بازاروں میں کوچوں میں۔ شہروں میں۔ دیہات میں۔ گھروں میں۔ محلوں میں۔ جنگلوں میں۔ ٹرینوں میں۔ یکہ شکرم میں۔ راہ میں۔ سڑک میں۔ باغوں میں جنگل میں۔ خلوت میں۔ جلوت میں۔ پارٹی میں۔ میٹنگ میں مسٹر خواہ مخواہ کی خدمات کا بصدق دل اعتراف کیا جاتا ہے۔

کوئی چاہے نہ چاہے مسٹر خواہ مخواہ کمال عقیدت سے بجا آوری خدمات میں شب و روز خواب میں بیداری میں لگے رہتے ہیں۔ ہر میدان اُنکی جاگیر ہے اور ہر جگہ اُن کا علاقہ۔

ملک وحشت میں ہمارا کیوں نہ ہو جائے عمل
خطِ شمعِ رُخ نے پروانہ دیا جاگیر کا

ان سے کتنا ہی چھپو پیچھا نہیں چھوڑینگے۔ اگر تم اُن سے کبھی ٹرین میں پہلے سوار ہوگے تو یہ بعد میں آ موجود ہونگے۔ اور اگر تم بعد میں آؤ تو یہ حضرت خود بدولت تم سے پہلے موجود ہونگے۔ چاہے کوئی ہوائی جہاز میں ہی سوار ہو کر نکلے انکا غبارہ غبار خاطر کے زور سے آگے ہی ہوگا

مسٹر خواہ مخواہ

ہر نگین دل پہ مسٹر خواہ مخواہ
کندہ ہے طغرا تمہارے نام کا

جون ۱۹۰۱ء کے پرچہ مخزن میں مسٹر خدائی فوجدار برادرِ معظم بالقابہ مسٹر خواہ مخواہ کا ذکرِ خیر ناظرینِ رسالہ پڑھ چکے ہونگے۔ خدائی فوجدار اور مسٹر خواہ مخواہ بالقابہ کا خاندان ہندوستان بھر میں ایک مشہور اور قابلِ تعظیم خاندان گنا جاتا ہے۔ چشمِ بدور خدائی فوجدار پانچ بھائی ہیں ایک سے ایک اعلیٰ اور ایک سے ایک نجیب۔ حسب و نسب کے لحاظ سے اُن کے خاندان سے باعتبارِ وجاہت مغلسانہ متانت زمانہ کوئی خاندان ٹکر نہیں کھا سکتا۔

خطِ عذار یار کا کیا وصف کیجئے
نورِ وضو کا یہ زائچہ خطبہ ہے عید کا

ہر پانچ بھائیوں کا سلسلہ باعتبارِ عمر اور اوصافِ ذاتی کے حسبِ ذیل ہے۔

الف - خدائی فوجدار۔
ب - مسٹر خواہ مخواہ۔
ج - ہوائی مجسٹریٹ۔
د - کھٹ پٹیے۔
ہ - دُکھتی بیمن ۔

سلہ بچاؤ لفظ ہے۔ جناب تیراندازی [illegible] ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر خدائی فوجدار کا بھائی [illegible]

اُن لوگوں کی نسبت جن کی تقریروں سے مجالس قومی کے ہال گونج رہے ہیں اور جن کے کارناموں کے تذکروں سے اخبارات پُر ہیں۔ وُہ اخبار نویس جو ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض اخبار نویسی انجام دیتا ہے اور جس کا مُدعا یہ ہے کہ مُلک میں واقفیتِ عامہ ترقی کرے۔ اہلِ مُلک روشن خیال ہو جائیں اور واقعات عالم پر انکی نظر وسیع ہو۔ مُلک کے سچے بہی خواہوں اور خُدامِ وطن میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ خواہ کسی عام جلسہ میں ایک مرتبہ بھی لب کشا نہوا ہو۔ اور کسی انجمن کے اراکین میں اس کا نام درج نہ ہو۔

غرض غور کرنے سے بے انتہا مثالیں ایسی خدمات کی جمع کیجا سکتی ہیں جو خواہ چھوٹے پیمانے پر ہوں خواہ بڑے پیمانے پر حقیقت میں قومی خدمات ہیں اور قوم کے دِلی شکریہ کا استحقاق رکھتی ہے اور ہر قوم کا جو ترقی کی آرزو مند ہے۔ فرض ہے کہ وُہ سچے خادموں اور مدعیانِ خدمت کی شناخت حاصل کرے۔ اور صادق دوستوں کے دِل بڑھائے اور نرے دعویداروں کو جتا دے کہ وُہ اُن کے فریب میں نہیں آتی۔ اور یہ جان لے کہ انجمن اور چندہ اور سکرٹری اور پریذیڈنٹ۔ اور جلسہ اور وعظ گو نہایت مفید چیزیں ہیں۔ جنکے بغیر متمدن زندگی خصوصًا زمانہ حال میں ممکن نہیں۔ تاہم یہ خدمت قومی کی مختلف صُورتوں میں سے ایک صُورت کی علحدہ علحدہ شکلیں ہیں اور خدمت قومی اس سے بھی اچھی اچھی صُورتیں رکھتی ہے اور وُہ صُورتیں اپنی اپنی دلفریبیاں اور ادائیں رکھتی ہیں +

عبدالقادر

ذخیرۂ لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے کسی غیر ملک یا قوم کے پڑھنے والے کی نظر میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہو سکتی ہو۔ ہماری رائے میں وہ شخص باوجود گوشہ نشین ہونے کے۔ اور باوجود اپنی سادگی وضع کے ایک سچا خادم قوم یا دوسرے لفظوں میں محسن قوم ہے۔ جس کی خدمت کا شکریہ کافی طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک عہدہ دار سرکاری جو اپنا فرض منصبی دیانت۔ محنت اور لیاقت سے ادا کرتا ہے۔ خاصکر اس نیت سے کہ اس کی قوم کی نسبت گورنمنٹ کی رائے اچھی ہو۔ اور آئندہ اس کے ہم قوموں کو زیادہ سہولتیں اور زیادہ ترقیاں ملیں۔ یا اپنے ادائے فرائض میں اپنی قوم کے افراد کو جائز فائدے پہنچانے کی طرف مائل رہتا ہو۔ ملک و قوم کے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔ اور اس کا نام خادمان قوم کی معزز فہرست میں درج ہونا چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ تاجر جو کوئی نیا صیغہ تجارت کا ڈھونڈ نکالتا ہے اور اس سے آپ بھی فائدہ اُٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ ملک کی ایک اعلیٰ خدمت کر رہا ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے ملک میں جا کر اقامت اختیار کرتا ہے۔ اس ارادہ سے کہ وہاں جو اس کے ابنائے وطن جائیں۔ انکی خدمت کرے۔ اور اپنی نیکی اور خوبی سے انہیں فائدہ پہنچائے۔ ملک کی خدمت میں مصروف ہے گو ملک سے باہر ہے اور گو اکثر اہلِ ملک اس کی خدمات سے ناواقف ہیں۔ کئی لوگ ہیں کہ عام جلسوں کے ذریعے سے نہیں۔ بلکہ خانگی طور پر گھر گھر جا کر اپنے ہمسایوں اور دوستوں کو امورِ خانہ داری میں۔ تربیتِ اطفال کے متعلق یا تعلیم کے متعلق مشورہ اور امداد دیتے رہتے ہیں۔ یا اُن میں پڑھنے لکھنے کا شوق پھیلاتے ہیں۔ یا انہیں کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت میں زیادہ خدمت کر رہے ہیں۔ بہت سے

پہنچے۔ یا چندہ جمع کرتا پھرے۔ یہ سب باتیں مفید ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اگر نیک نیتی سے کی جائیں۔ لیکن اگر صرف نمود کے واسطے یا اور ذاتی اغراض کے لئے ہوں۔ تو چنداں مفید نہیں۔ بلکہ بعض اوقات مضر بھی ثابت ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ سب انجمنوں یا سوسائیٹیوں کے قیام کے لوازم ہیں اور اسی ایک صورتِ خدمت کے انواع ہیں جس کا ہمارے ملک میں زیادہ تر رواج ہے۔ اس کے سوا جو صورتیں قومی خدمت کی ہیں۔ جن سے لوگ کم آگاہ ہوتے ہیں۔ گو جو مفید ہونے کے لحاظ سے کسی دوسری قسم خدمت سے کم نہیں۔ اُن کو پہچاننا اور اس قسم کے خادموں کی قدردانی کرنا۔ یہ بھی مُلک اور اہلِ مُلک کا فرض ہے۔ وُہ اصحاب جو خدمت کے خاموش طریقوں میں سے کسی پر کاربند ہیں۔ خود تو اس کی پروا نہیں رکھتے۔ کہ مُلک اُن کی قدردانی کرے یا نہ کرے۔ مگر اُن کی قدردانی سے اور خادمانِ ملک کو ترغیب ہو سکتی ہے۔ کہ وُہ بھی چپ چاپ ایسے طریقوں کو اختیار کریں۔ جن سے نفع تو زیادہ پہنچے اور چرچا کم ہو۔ یہ چرچا اور داد گو ترغیب و تحریص کے لئے ضروری اور فائدہ مند چیزیں ہیں۔ لیکن ان کا حد سے زیادہ رواج ہونا خلوص کو زائل کرتا ہے۔ اور مُلک کو ضرورت ہے ایسے خادموں کی جو اپنا فرض اس لئے ادا کریں کہ وُہ ان کا فرض ہو۔ نہ اِس لئے کہ فلاں جماعت ہم سے خوش ہوگی۔ یا ایک خاص اثر ہم کو حاصل ہو جائیگا۔ یا حکام ہمیں صلہ و انعام دینگے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

جو شخص اپنے کتب خانہ میں بیٹھ کر مدّت العمر میں ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جسکے مطالعہ سے ہزاروں افرادِ قوم مستفید ہوتے ہیں۔ جس سے ملک کے

اشخاص جو نری بڑی قومی خدمت کی طرف بھولے سے بھی رُخ نہیں کرتے تھے اور اپنا شوق جاہ طلبی حکام کی دلبرائی تک ہی محدود رکھتے تھے۔ حکام کی نگاہ اس طرف پھرتی دیکھکر زور شور کے ساتھ خدمتِ قومی کے میدان میں کود پڑے ہیں۔ اور اپنی تمام عادات جو پہلے جاہ طلبی میں استعمال کیجاتی تھیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اب قومی مجالس میں یہ کوئی غیر معمولی نظارہ نہیں کہ ایک دُوسرے کو دھکیل کر آگے کھڑا ہو جائے تاکہ لوگوں کی نگاہیں اُس پر پڑیں۔ شاید کہ حکام میں سے کسی کی نظر کیمیا اثر بھی اُن نگاہوں میں شامل ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قومی جلسے بجائے قوم کے نبض شناسوں کے مشورہ باہمی کے جلسے ہونے کے ایک دنگل ہو گئے ہیں۔ جن میں ہر پہلوان اپنا دم خم دکھاتا ہے اور اپنے داؤں پیچ سے ناظرین کو محظوظ کرتا ہے۔

قوم ایک طرف تو اس مشکل میں ہے۔ کہ وہ اس طریق خدمتِ قومی کے سوا کسی اور طریق سے آگاہ نہیں۔ ایسے لوگ تو بہت کم ہیں جو ان نقائص کو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دیکھ سکیں اور ان کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکیں۔ وہ انہی قومی دنگلوں اور تماشوں کو قومی خدمت سمجھتے ہیں۔ اور انہی پہلوانوں کو قومی خادم۔ یہ سمجھکر بعض تو صرف اندھا دھند اُن کی پیروی کئے جاتے ہیں۔ اور بعض بدظن اور بے دل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کرتے یا کر سکتے۔ کہ اس خرابی کی جو بہلے قومی جلسوں اور ہماری انجمنوں میں راہ پا گئی ہے۔ اصلاح کریں اور انجمنوں کو مفید قومی کاموں کا حقیقی مرکز بنائیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہو گا کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ قومی خدمت کے بیشمار طریقے ہیں۔ ایک یہی کافی نہیں کہ کوئی شخص کسی سوسائٹی کی بنا ڈالے۔ یا اس کا اعزازی عہدہ دار بنجائے۔ یا اس میں لکچر دے۔ یا جابجا قومی جلسوں میں شرکت کے لئے

کسی ہمدردِ قوم نے کہیں ایک مقامی مدرسہ کھول رکھا ہے تو جو دُوسرا دعویدار ہمدردیٔ قوم کا وہاں پیدا ہوگا۔ تو تسے غیصدی یہ امکان ہے کہ وُہ بھی مدرسہ ہی جاری کرنا چاہے گا۔ اور دونوں مدرسوں اور دونوں بانیوں میں رقابت اور جدال کی بنیاد پڑ جائیگا۔ اگر کسی قدر دور اندیش ہُوا اور نئے مدرسہ کے قائم کرنے کی مشکلات اور صعوبتیں اس کے ذہن میں آگئیں تو وُہ پہلے مدرسہ کی کمیٹی میں شامل ہو جائیگا۔ مگر ان دنوں میں "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" کی کیفیت پیدا ہوگی اور عہدہ سکرٹری یا عہدہ پریزیڈنٹ معاملہ متنازعہ فیہ بنجائیگا۔ کمیٹی ایک اکھاڑا ہوگی جس میں آدھے اہل شہر ایک طرف اور آدھے اہل شہر دوسری طرف مدتوں لڑا جھگڑا کرینگے۔ ہماری چھوٹی بڑی انجمنوں اور سوسائیٹیوں میں یہ مواد فاسد موجود ہے اور ابھی وُہ قائم نہیں ہونے پاتیں کہ یہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک زمانہ میں ہم لوگوں کو یہ شکایت ہوتی تھی کہ ہمارے حکام وقت صرف اسی اعزاز کے قدردان ہیں جو وُہ خود ملک کے ممتاز اشخاص کو بخشیں اور اُن عزتوں کی قدر نہیں کرتے جو خادمانِ ملک اپنی قوم سے خدمات قومی کے صلہ میں حاصل کرتے ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے حکام نے اپنی روش کو ذرا بدلا ہے۔ اور وُہ بھی اُن اصحاب کی طرف قدرے متوجہ ہُوئے ہیں جو خدمتِ قومی میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ اس سے اُمید تھی کہ سچے خدمتگزار لوگوں کی ہمت بڑھے گی اور انہیں نظر آئیگا۔ کہ اُن کے لئے قوم کی شکرگزاری یا اپنے خالق کی خوشنودی کے علاوہ دُنیاوی اعزاز اور وجاہت کا صلہ بھی موجود ہے۔ مگر ہماری خوبیٔ قسمت۔ یہ تدبیر بھی اُلٹی ہی پڑتی نظر آتی ہے حکام کی توجہ ہوتے ہی۔ رقابتوں کی آفت اور ترقی کر گئی۔ بہت سے ایسے

لیکن یہ خیال وہاں تحریک عمل کرتا ہے۔ اس خیال کا وجود ہماری سوسائیٹیوں کے بانیوں میں کم پایا جاتا ہے۔ انگلستان میں ایک شخص جب اس خیال سے اُٹھتا ہے کہ اپنی قوم کو نفع پہنچائے۔ تو سب سے پہلے وہ اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتا ہے کہ کون کون سے کام ہیں جو اچھی طرح ہو رہے ہیں اور کون سا کام ہے جس کی طرف ابھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ وُہ دیکھتا ہے کہ بہت سے کام خوش اسلوبی سے ہو رہے ہیں۔ مگر بہت سے ابھی ہونے باقی ہیں۔ اُن میں سے وُہ کوئی ایسی چیز اختیار کرتا ہے جس سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت ہو اور جس میں وُہ اپنی عمر بھر صرف کر دے تو اس کا جی نہ اکتائے۔ اس انتخاب کے بعد وُہ اپنے ہم خیال دوستوں سے مدد مانگتا ہے اور ایک چھوٹی سی جماعت قائم ہو جاتی ہے جو چپکے چپکے کام شروع کر دیتی ہے اور جب تک وُہ ایک درجہ کامیابی کا حاصل نہیں کر لیتی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ پھر یہ نوبت آتی ہے کہ اس خیال کو عام کیا جائے اور پبلک سے مدد چاہی جائے۔ اخبار والے اور دیگر اہل الرائے جن کے ہاتھ میں جمہور کی باگ ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کام صحیح اصول پر شروع ہوا ہے اور اس کا ذمہ لینے والوں نے کچھ کر بھی دکھایا ہے۔ خوشی سے اس سوسائٹی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور وہاں کی فیاض خوش حال اور روشن خیال پبلک امداد پر جھک پڑتی ہے اور سوسائٹی کو مالی اور اخلاقی۔ دونوں طور پر بڑے پیمانے پر مفید اور کامیاب بنا دیتی ہے۔ برعکس اس کے ہندوستان میں "انجمن سازی" ایک خبط کے درجہ تک پہنچی جاتی ہے۔ جسے دیکھو انجمن سازی کو بجائے قوم کے ابھارنے کے اپنے ابھرنے کا زینہ بنانے کی طرف مائل ہے۔ قوت فکر و تخیل میں کچھ ایسا ضعف آیا ہے۔ کہ کوئی نیا کام تجویز کرنے کی بجائے ہر شخص کا یہ میلان ہے کہ وہی چیز اختیار کرے جو پہلے سے موجود ہو۔ فرض کیجیے

مانگے اور اصلی خدمت کے بغیر صلہ کی طلبگار ہو۔ قوم کے مستقبل کے لئے ایک
خطرۂ عظیم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا میلان ہے جو قومی ہستی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا
جاتا ہے۔ اور قوم کے مجموعی کیرکٹر کو ناقص بنا کر اسے روز بروز پستی کی طرف لیجاتا ہے

ہمارے ملک میں قومی خدمت کا خیال ایک جدید خیال ہے۔ اور اس کو عمل میں
لانے کی جو صورتیں مروج ہیں اُن میں سے اکثر مغربی دُنیا کے نمونہ پر مبنی ہیں۔ جو
چیزیں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آئی ہیں اور جنہیں انگریزی
راج کی برکتوں میں شمار کرنا چاہیئے۔ اُن میں خدمتِ قومی کا وُہ طریق ہے۔ جسے
سوسائٹی یا انجمن قائم کرنا کہتے ہیں۔ یعنی کوئی کام جو ایک فردِ واحد سے نہ ہو سکے۔
اس کے اتمام کے لئے چند افراد جو اس کے مفید ہونے کے معترف ہوں اور
ہم خیال ہونے کے سبب مل کر کام کر سکیں۔ جمع ہو جائیں اور جماعت کی برکت
سے وُہ کام سرانجام ہو۔ اس نہایت کارآمد طرزِ عمل سے انگلستان کی حالت پر
بہت مفید اثر پڑا ہے اور اس کی آدھی ترقی اس اجتماعی قوت سے کام لینے
کی بدولت ہو۔ ہمارے انگریز دوستوں نے تو اس دلچسپی کی وجہ سے جو وُہ ہمارے
معاملات سے رکھتے ہیں یہ مفید اور مجرب نسخہ ہمیں بتا دیا۔ لیکن آفرین ہے ہم پر
کہ اس کا ایسا غلط استعمال شروع کیا کہ اس کے فائدے نقصان سے بدل
جاتے ہیں۔ "انجمن سازی" بجائے قومی قوت کے قومی ضعف بنتی جاتی ہے اور اگر
انجمنیں اسی طرح بنتی اور بگڑتی رہیں اور محبت و اتفاق کی جگہ عداوت اور نفاق
کا سامان ہوتی گئیں تو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جو نسخہ قوم کے ضعیف جسم میں قوت
بھرنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ ایک دن وُہی اس کی ہلاکت کا باعث ہو گا۔

ہم بہت سے امور میں انگلستان کی تقلید کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہماری انجمنوں
اور سوسائٹیوں کے قواعد انگریزی سوسائٹیوں کے نمونہ پر ڈھالے جاتے ہیں۔

مخزن

خدمتِ قوم کے طریقے

خدمتِ قوم کے مختلف طریقے ہیں۔ اُن میں بعض مشکل ہیں بعض آسان کچھ دیر طلب ہیں کچھ زود اثر۔ کچھ بار آور ہیں کچھ بے ثمر۔ بعض طریقے ایسے ہیں جن میں شور و غل بہت ہو اور اصلی فائدہ کم۔ بعض میں شور و غل کم ہے اور ان کے نتائج بہت مفید ہیں۔ ہندوستان میں اوّل تو ابھی بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو یہ شوق رکھتے ہیں کہ خادمانِ قوم میں اُن کا شمار ہو اور جو ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہیں جو لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا چاہتے ہیں اور جن کی یہ خواہش ہو کہ محنت تو پڑے کم۔ مشکلات سے جہاں تک ہو سکے بچے رہیں۔ انتظار کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ لیکن یہ چرچا ہو جائے کہ ہم ملک و قوم کے خیر خواہ ہیں۔ کسی ملک میں خدمتِ قومی کا شوق کم ہونا یا سچے خادمانِ قوم کی تعداد محدود ہونا قابلِ افسوس تو ہے۔ مگر خطرناک نہیں۔ کیونکہ قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مفید افرادِ قوم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو کمی قومی خدمت کے شوق کی پہلے محسوس ہوتی تھی۔ اس کی تلافی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن خادمانِ قوم میں ایسی پست ہمت جماعت کا پیدا ہو جانا جو کام کئے بغیر مزدوری

اعلیٰ حضرت بادشاہِ کابل کے مشیر طبی اور لاہور و آگرہ کے سرکاری ڈاکٹری مدرسوں کے اُستاد ڈاکٹر صاحبان کیا فرماتے ہیں •

لاہور میڈیکل کالج کے معلم علم تشریح
جناب ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب فرماتے ہیں کہ

"مخزن حکمت"

عام اردو خوان اشخاص کیلئے ایک نہایت ہی مفید اور علم آموز کتاب ہے اس کتاب میں تمام ضروری امراض کا مفصل بیان ہونے کے علاوہ بدن کی ساخت۔ اعضا کے افعال۔ حفظ صحت۔ مردوں عورتوں اور بچوں کے خاص خاص امراض کا علیحدہ علیحدہ بابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا طرز بیان بہت سادہ اور آسان ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ گھر کا ڈاکٹر اور حکیم بطور ایک کامل طبیب ہر ایک گھر میں موجود رہنا چاہئے۔

اعلیٰحضرت بادشاہ کابل کے مشیر طبی
جناب ڈاکٹر کرنل اللہ جوایا صاحب فرماتے ہیں کہ

"مخزن حکمت"

واقعی اردو زبان میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جس میں ڈاکٹری اور یونانی کی تمام اصطلاحات کو موزون اردو الفاظ میں لکھا ہے اور ہر مرض کے انگریزی عربی اور اسماء و نام اور ڈاکٹری و یونانی علاج مذکور ہیں۔ میں اردو خوان پبلک کو جنہیں میرے خیال میں طب خانگی پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے۔ اور نیز ڈاکٹروں اور حکیموں کو مخزن حکمت کی بڑی زور سے سفارش کرتا ہوں۔ درحقیقت کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہئے۔

آگرہ میڈیکل کالج کے معلم علم الادویہ و علم کیمیا
جناب ڈاکٹر محمد مشاء اللہ صاحب ایل ایم ایس فرماتے ہیں کہ

"مخزن حکمت"

کے اکثر مقامات کو میں نے دیکھا ہے۔ فیملی میڈیسن یعنی علم طب خانگی پر یہ ایک کتاب بے نظیر مفصل اور صحیح کتاب ہے۔ اس میں جابجا بہت سی تصاویر بھی ہیں۔ قابل مصنف نے جس جانفشانی سے اس کتاب کو لکھا ہے اس کے لئے درحقیقت وہ اہل ملک کے کمال شکریہ کے مستحق ہیں میری رائے میں

مخزن حکمت

کا ہر ایک گھرانے میں موجود ہونا نہایت ہی مفید ہے۔

حجم کتاب ایک ہزار تین سو بیس صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت غیر مجلد (للعہ) مجلد (للعہ) ملنے کا پتہ کتب خانہ جناب شمس الاطباء (گمٹی بازار) لاہور

عالیجناب نواب وقار الملک بہادر کے نام نامی کو

زندہ اور ہر وقت یاد رکھنے کے لئے ہم نے

وقار الملک

ٹرکی ٹوپی ابھی حال میں ولایت کے مشہور کارخانہ کرسٹی سے بنوا کر منگوائی ہے۔ اس جدید ٹوپی کی وضع اس قدر فیشن ایبل اور خوشنما ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے **قیمت** مع پھندنا صرف **سے** علاوہ محصولڈاک

محسن الملک پیٹنٹ

یہ اسی طرز کی خوشنما ٹوپی کا نام ہے جو اپنی خوبصورتی کے سبب تمام ملک میں مشہور ہو چکی ہے۔ اور آج ہر فیشن ایبل شخص کے سر پر طرۂ زیب ہے۔ تمام استر چمڑے کا ہے **قیمت**

للعہ علاوہ محصولڈاک۔

فرمائشوں کے ساتھ سر کا ناپ آنا ضروری ہے۔ ہر رنگ کی ٹوپیاں موجود ہیں جس رنگ کی ضرورت ہو مفصل تحریر فرمائیے۔

ٹول کی عمدہ وسلی سلائی قمیصوں کے علاوہ ہر قسم کا مال ہمارے ہاں سے بکفایت مل سکتا ہے۔

عبدالرشید برادرز جنرل مرچنٹ انارکلی۔ لاہور

ربڑ کی مُہر اور مُہر کنی کا مشہور و معروف کارخانہ

راستی موجب رضائے خدا ست　　کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

جناب عالی یوں تو ہندوستان میں ربڑ کی مُہر اور مُہر کنی کے بہت سے کارخانے ہیں مگر یہ کارخانہ عرصہ تیس سال سے نہایت صفائی اور دیانتداری سے کام کرتا ہے اس کارخانے نے بڑے بڑے سرکاری حکاموں کے کام بنا کر سندیں حاصل کی ہیں اور اس کارخانہ میں سب قسم کا کام اور سب بانوں میں یعنی گورمکھی ناگری - ہندی - بنگلہ - فارسی - عربی - انگریزی میں بہت صفائی کے ساتھ بنایا جاتا ہے اور ہر چیز مثلاً چاندی - لوہا - پیتل - پتھر - لکڑی پر کھدائی بہت عمدہ ہوتی ہے - اور ہر قسم کے بلاک بھی بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں اور مونوگرام اور سلطانی طغرائے وغیرہ لوہے کی ڈالی پر بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں - عقیق کی مُہر کی قیمت ایک نام کی اعلیٰ درجہ کی معہ انگشتری چاندی کے (۶؎) اور معمولی درجہ کی معہ انگشتری چاندی کے (للعہ)

ربڑ کی مُہریں بھی نہایت عمدہ تیار ہوتی ہیں

جنکی قیمت اعلیٰ درجہ کی (۶؎) معہ سامان معمولی درجہ کی (عہ) اور روزمرہ تاریخ بدلنے والی ربڑ کی مُہر کی قیمت معہ سامان (عہ) اور وہ مُہر ربڑ جو خود سیاہی لیکر چھپتی ہے - معہ سامان (للعہ) اور ربڑ کی مُہر معہ انگشتری چاندی کے بغیر سامان پنسل (عہ) پنسل والی ربڑ کی مُہر ۱۲ بغیر سامان علاوہ ہمارے کارخانہ میں ہر رنگ کی ربڑ کی مُہر کی سیاہی و انگوٹھا لگانے کے بکس و ربڑ کے حرفوں کے بکس و بلو بلیک سیاہی غرض سب سامان مل سکتا ہے -

المشتہر

احمد بیگ مُہر کن و ربڑ اسٹامپ میکر چاندنی چوک دہلی

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقام خلافت (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ۸/

رسوم دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ۱۲/

منازل السائرہ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن " ۸/

خواب ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن۔ " ۸/

ابو مسلم خراسانی۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ " ۸/

مکتوبات آزاد۔ اردو نثر کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ با تصویر " ۶/

کلام نیرنگ۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن " ۶/

انتخاب مخزن۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ۱۲/

دردِ جانستاں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی، دہلی کی زبان میں ہی کا سچا نقشہ ۸/

دربار نمبر۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ ۶/

مثنویات میر حسن۔ مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کرکے شائع کی گئی ہے ۱۲/

سیر تبت۔ انگریزی کتاب "فرارس ان تبت" کا با محاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱۰/

مرقع خوشخطی۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا جسکو دیکھ کر خط کے تمام نکات آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں علاوہ ازیں ظاہری خوشنمائی کے منشی صاحب موصوف نے اسکے تمام پر نظر رکھی ہے دعوی ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کے سیکھنے کیلئے اسوقت تک میسر نہیں آخیر میں منشی صاحب کی تصویر بھی ہے ۵/

درخواستیں مینیجر مخزن۔ لاہور کے نام آنی چاہییں۔

عاشق ہی جب وہ بدذوق مشکل پسند آیا	بہت مشکل سے قابو میں دل مشکل پسند آیا
ہلا بیٹھا رسوا گرمی سوز محبت نے	پسینہ کس لئے لیلیٰ کو محمل پسند آیا
فراقِ یار میں مژگاں تک آکر تھم گیا آنسو	مسافر کو تماشائے لبِ ساحل پسند آیا
کلیجے سے لگا کر اسکو اپنے ساتھ لایا ہوں	ازل میں آپ کے قابل مجھے جو دل پسند آیا
مرادیں سب بر آئیں ہر تمنا ہو گئی پوری	ہمیں جب مدعائے سعی لا حاصل پسند آیا
مبارک غیر کو جو آسندے رسم دلجوئی	کہ اس بیدرد کو قتل شکستہ دل پسند آیا
دعائیں مانگتا ہوں زیرِ خنجر اپنے جینے کی	خدا جانے مجھے کیا کیا دمِ بسمل پسند آیا

عزیز و اکبر کی خاطر ہمیں منظور ہے احسن
اگر انکو طریقِ غالبِ کامل پسند آیا

(از مولوی سید محمد حسین صاحب شوق [illegible])

پاؤں نجات مرکے شبِ انتظار میں	یہ بھی مگر نہیں ہے مرے اختیار میں
کچھ اور بھی ہے دم ترے خنجر میں دیکھ تو	باقی ابھی ہے جان ترے جاں نثار میں
ابھی تسلیاں ہیں یہ بیتابِ عشق کی	لیتے ہیں چٹکیاں دلِ امیدوار میں
سایہ پڑا ہے کیا مرے بختِ سیاہ کا	ایسی نہ تیرگی تھی شبِ ہجرِ یار میں
دیدوں میں جان بھی تو نہ دو مرحبا کہیں	دل کس حساب میں ہے جگر کس شمار میں
شاید خیالِ یار ہے اسکا کہ صبح تک	جھپکی نہیں ہے آنکھ شبِ انتظار میں
وارفتہ یوں ہوئے ترے مرغِ چمن کبھی	شاید ہے بوئے یار نسیمِ بہار میں
بلبل کو ذبح کرکے کیا باغباں نے قہر	دھبہ لگایا حسنِ عروسِ بہار میں

دیکھو مٹا کے شوق کو پچھتاؤ گے بہت
شیدا نہ اس سا ایک ملے گا ہزار میں

رحم و الطاف ہیں نیکی کے لئے سینہ سپر — کر نہیں سکتا ہے کچھ خنجر کہیں نیکی کا

مگر چھٹے شاہد اقبال بلا سے چھوٹے
چھوڑنا ساتھ نہ اے بخت کہیں نیکی کا

بخت اکبر آبادی۔ از لکھنؤ

تازہ غزلیں

(از حضرت حفیظ جونپوری)

ٹھہر اب کوئی دن میں پرسش مظلوم ہوتی ہے — یہ سمجھا ہوں جب حسرت مری معدوم ہوتی ہے
یہی کہہ کہہ کے میری خاک پر لائے مجھے ہمدم — اُدھر دیکھو کسی کی قبر وہ معلوم ہوتی ہے
وفا کا ذکر جب آتا ہے پہروں ہاتھ ملتے ہیں — وہاں اب یاد تیری لئے دل مرحوم ہوتی ہے
یہی جی چاہتا ہے منہ چھپا کر روئیے پہروں — طبیعت خود بخود ایسی کبھی مغموم ہوتی ہے
وفاداروں سے نفرت ہے تو پھر دیکھیو دا تم — حسینوں میں تو سنتا ہوں یہ رسم معدوم ہوتی ہے
یہاں تو یہ چکر گھر حسن جمشید ہی مانتے ہیں — بہلا آتے ہی کسی کا نام اک مرقوم ہوتی ہے
ہمیں سے ہے یہ مطلع تو خدائی کا خدا حافظ — جدھر سے تم گذرتے ہو اُدھر کی دھوم ہوتی ہے
مری باتوں سے برہم ہو گیا تو بھی تو اے ناصح — نصیحت ہو کسی کی بھی بُری معلوم ہوتی ہے

حفیظ اک عمر اس فن میں پڑا ہے خون دل پینا
بڑی مشکل سے دُنیا میں سخن کی دُھوم ہوتی ہے

(از جناب سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی)

عجب ہیں عالم ایجاد میں شکل پسند آیا — کہ جو آیا نظر کے سامنے وہ دل پسند آیا

زندگی

یہ نظم امریکہ کے مشہور مصنف اور انگریزی کے جادو نگار شاعر لانگ فیلو کی انگریزی نظم "سام آف لائف" کا ترجمہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع لفظی ترجمہ ہو اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔

(علی الدین عجز۔ بدایونی)

کیوں دردناک لفظوں میں کرتے ہو یہ کلام
انساں کی زندگی کا ہے خواب و خیال نام
جس خفتہ بخت سے نہ ہو تفریق اصل و نقل
سمجھو تم اس کی روح کو مردہ ہے لاکلام (۱)

ہے زندگی قدیم گنواؤ نہ اسکو مفت
مرنے کو یہ نہ سمجھو کہ ہے اسکا اختتام
تو خاک سے بنا ہے ملیگا تو خاک میں
تھا جسم کے لئے نہ کہ یہ روح کو پیام (۲)

مقصد ہماری زیست کا یہ ہی فقط نہیں
رنج و خوشی کے ہو رہیں اور کچھ کریں کام
ہر روز بلکہ شغلوں میں ایسے لگے رہیں
جن سے ترقیات زیادہ ہوں مدام (۳)

کرنا بہت ہے کام مگر وقت ہے قلیل
دل ہیں ہمارے گو نہیں خوف و خطر کا نام
تاہم دہل کی طرح دھڑکتے ہیں دم بدم
اور موت کی خبر ہمیں دیتے ہیں صبح و شام (۴)

دنیا کو سمجھو جنگ کا میدان دوستو
اور اس کے عیش جانو ہیں آرام کا مقام
تشبیہ چاہو تم نہ بہائم کے طور پہ
مردوں کی مثل شوق سے خود ہو شریک لام (۵)

آئندہ وقت پر نہ بھروسہ کرو کبھی
گذرے ہوئے زمانہ پہ بھیجا کرو سلام
لیکن خدا کا نام کرو حوصلہ بلند
موجودہ وقت کام میں لاؤ بہ انتظام (۶)

جتلا رہے ہیں ہم کو بزرگوں کے واقعات
ہم بھی بنیں زمانہ میں یکتا و شادکام
او کام وہ کریں کہ جو مرنے کے بعد بھی
قائم رہیں جہان کا جب تک ہے قیام (۷)

تا گر کسی عزیز کا دنیا کے بحر میں
ڈوبے جہاز اور نہایت ہو ستم تمام

ق

یہ معروف ہے قول زردشت کا — زباں اسکی قدرت کا ہے معجزا
اسی سے ہے دُنیا کی نظم و نسق — ہر اک لے رہا ہے اسی سے سبق
تماشائے نیرنگِ دُنیا بھی ہے — یہ قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی ہے
اسی سے سب آثارِ غیبی کھُلے — طلسماتِ اسرارِ غیبی کھُلے
ہیولے کو لباسِ صورت دیا — ہر اک شخص کو درسِ حکمت دیا

قول ارسطو

ارسطو کا یہ قول مشہور ہے — کہ جو شارحِ رازِ مستور ہے
زباں ہے وہ اک آلۂ بے عدیل — عیاں جس سے قدرت کی جرِ ثقیل
ارے نطق ہر حرف و فقرہ ترا — بسائط میں داخل ہے شامل ہُوا
تری آفرینش پہ صانع کو ناز — ترا قول قانونِ حکمت کا راز
کبھی تلخی پندِ ناصح ہے تو — کبھی باہمی صلح کی گفتگو
کبھی تجھ میں دشنام کی لذتیں — ٹپکتی ہیں تجھ سے کبھی حسرتیں
کبھی تیغ بُرّاں کبھی ہے سپر — کبھی نغمہ ریز اور کبھی نوحہ گر
کبھی درس آموزِ عرفاں ہے تو — کبھی باہمی صلح کی گفتگو
کبھی محرمِ افشائے راز و نیاز — کبھی محفل آرائے راز و نیاز
کبھی سازِ مطرب سے تو ہم نوا — کبھی چاشنی گیرِ لحن و غنا
کبھی اپنی جودت سے خود مست ہو — کبھی اپنی مدحت سے خود مست ہو

معانی پرستوں کے ہم داستاں
عزیزِ سخن سنج کے ہمزباں

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

کبھی دل پہ عشاق کے نیشتر | کبھی مرہم زخمہائے جگر

کبھی نالۂ صور کی ہم نوا | کبھی شور محشر کی یہ ہم صدا

انا الحق کا نغمہ کبھی زیر لب | کبھی ہے انا العبد سے مست لب

کبھی جام تلخابہ زہر ہے | کبھی کوزہ مستیٔ قہر ہے

دم غیظ اگر ہو یہ آتش فشاں | قیامت ہو اک الاماں الاماں

ہے فہرستِ آثار دنیا یہی | ہے فرہنگ شرح تمنا یہی

لغت دانِ جملہ علوم جہاں | زباں دان اسرار کروبیاں

مہیا کن پیکر واہمہ | تلفظ سے صورت گر واہمہ

ہوئی محنت چارہ گر رائگاں | بھرا آج تک تو نہ زخم زباں

حکیم الٰہی جو لقمان تھا | بہت اس کی صنعت پہ حیران تھا

یہ قول اُس کا ہے آج تک یادگار | جو ہے مظہرِ صنع پروردگار

ہیں قدرت کے جتنے خزائن نہاں | کلید اُن کی انسان کی ہے زباں

اسی سے مسیحا مسیحا ہوئے | اسی نطق سے مردے زندہ ہوئے

صدا قم کی اس نے سنائی جہاں | وہیں جسم خاکی میں پھر آئی جاں

ذرا غور کر اسکی صنعت پہ تو | ذرا فکر کر اسکی حکمت پہ تو

دکھائی ہے کس نے تجلی طور | یہ تھا قوت ناطقہ کا ظہور

کوئی جا کے موسیٰ سے پوچھے ذرا | خطاب کلیم آپ کو کیوں ملا

کبھی اسکو ذوقِ عبادات ہے | کبھی محوِ کشف و کرامات ہے

جہاں میں یہی مبدا خیر و شر | یہی ہے بہشت اور یہی ہے سقر

اسی میں تو قوت ہے تسخیر کی | بیاں کس سے لذت ہو تقریر کی

یہی نطق ہے وحی رب قدیر | نہیں یاد ما ینطق اے خبیر

ماریاسمین

آہ! کلیجے سے لگا لوں تجھ کو ماریاسمیں — ہیں کسی گیسو کے خم تجھ میں کسی ابرو کی چیں

یہ قیامت کی شکن - اور یہ بلا کے پیچ و خم — آہ! کس کافر ادا کی تو ہے زلفِ عنبریں

ہے ترے حسنِ سیہ سے دل کو اک دیوانگی — قیس میں ہوں - آہ! تو ہے لیلیٰ محمل نشیں

آہ! ظالم، اُف ری! تیری گرمیٔ جانسوزِ حسن — دل کو پھونکے دیتی ہے تیری نگاہِ آتشیں

مجھ کو وہ لذت ہے ملتی آہ! تیرے زہر میں — میں سمجھتا ہوں کہ ہے تیری زباں میں انگبیں

شب کو باہنسی سی دلہن بنکر نکلتا یوں ہے تو — بال کھولے گھر سے نکلے جیسے کوئی مہ جبیں

گرمیوں میں جیسے صندل ہے حسینوں کو پسند — ڈھونڈھتا پھرتا ہے یونہی تو بھی شانِ صندلیں

پیرہن اُٹھا کر آہ! مستی میں وہ لہرانا ترا — جیسے ہو جوبن کی متوالی کوئی نازآفریں

سبزہ زاروں میں ہے شب کو اک عروسِ بے نقاب — دن کو باہنسی میں ہے تو اک شاہدِ پردہ نشیں

او فسوں گر! آہ! ہوں میں کشتۂ دلبری — مجھ کو ڈر ہے تیرے ڈسنے کا مجھے شکوہ نہیں

تجھ سے میرے گیسوؤں والے کی ملتی ہے ادا — میری نظروں میں تو ہے تُو سو حسینوں کا حسیں

او ستمگر! آہ! کب کالا سمجھتا ہوں تجھے
میں تو اپنا گیسوؤں والا سمجھتا ہوں تجھے

طولِ شبہائے جدائی تو ہے - یا زلفِ دراز — تجھ کو ظالم! اپنے قامت کی بلندی پر ہے ناز

اک ادائے عشق بھی مضمر ہے تیرے حسن میں — تو وہ نیرنگِ فسوں ہے آہ! او شوخ طراز

مہوشوں کی شامِ خلوت میں ہے تو زلفِ سیاہ — اور شبِ غم میں ہے تو وہ نالہائے جانگداز

کر دیے گل آہ! کتنے قلبِ سوزاں کے چراغ — تیری آنکھوں نے کئے کیا کیا در فتنہ باز

مرنے والے کیوں نہ جی اٹھیں تیری آواز میں — جن کے نغموں کی ہے ظالم! صدا جاں نواز

جام مے مینا و ساقی وہ بہار عطر بار
چشم عاشق اور جمال روئے یار گلعذار

وہ شعاع آفتاب اور صاف پانی کی چمک — تار زریں مہر کی شفاف پانی کی چمک
آب [illegible] کی روانی اور اس کی آب و تاب — منظر زریں دکھاتی ہے شعاع آفتاب
نالیاں ہیں گر زمرد کی تو پانی سیم خام — جدولیں ہیں سبزۂ دیبا کی روپہلی اپنے کام
تختۂ دیبا پہ ہم بیٹھے [illegible] گلکاری کہیں — سبزہ زار کوہ پر یا صنعت باری کہیں

چار سوئے کوہ تا حد نظر سرسبز ہے
ہے نظر سرسبز چشم دیدہ ور سرسبز ہے

یہ آرا جاتا ہے بادل روئی کا گالا ہے کیا — یہ جو ہے برق تپاں آتش کی پرکالہ ہے کیا
تھی اسی ظلمت اسی ظلمت میں پیدا نور ہے — جلوہ وہ زلف سیہ میں تاب روئے حور ہے
آب تر سے سینۂ کہسار رواں لبریز ہے — آب زر سے گل کی داماں جہان زرخیز ہے
رحمت حق اسکے بندوں کے لئے ہر موجزن — صنع و قدرت جہان کوہ پر پرتو فگن

ہم کہاں اور کوہ کے یہ منظر زیبا کہاں
سبزہ زار کوہ کے خلعت دیبا کہاں

کلفتیں سب مٹ گئیں سب کھل گئے دل کے غبار — گلشن امید میں اک آگئی تازہ بہار
آرزوئے دل میں شان دلکشائی آگئی — عقدۂ دشوار میں مشکل کشائی آگئی
حسرت دل ہو گئے اب تو تمہارے غم غلط — کر دیئے قدرت نگاری نے وہ سارے غم غلط
ہیں یہ سامان [illegible] کہسار کی طفیل — دولت [illegible] احمد علی خاں کے طفیل

ثاقب آقا کے لئے ہر دم دعا کرتے رہو
روز و شب صبح و مسا شکر خدا کرتے رہو

[illegible] ہز ہائی نس [illegible] نواب احمد علی خان بہادر [illegible] والی ریاست [illegible] جناب ثاقب [illegible] بھی [illegible] انکے ہمرکاب سیر کو [illegible] تشریف لے گئے تھے۔ یہ اشعار اس سیر کا نتیجہ ہیں +

مشکبو اسکی ہوائیں مشکبار اسکے چمن — منظر اسکا دلفریب اسکی فضا نایاب ہے
بسکہ تا حدِ نگہ ہے سبزہ و گل کا ہجوم — پہلوئے نظارہ وقفِ بسترِ سنجاب ہے
سینچنے کو نور کے پانی سے اسکی کیاریاں — روز اُبلتا چشمۂ خورشیدِ عالمتاب ہے
خاک میں اکسیر اور پانی میں امرت کا اثر — حبذا کیا خاک ہے اور مرحبا کیا آب ہے
اشتیاق اسکا ہے طوقِ گردنِ اہلِ وطن — اُلفت اسکی سُرمۂ چشمِ اولوالالباب ہے
نعمتیں اس کی ہیں ذوق افزائے کامِ اہلِ ہند — جسکو دیکھو اسکی شیرینی سے لذت یاب ہے
زندہ دل وہ لوگ ہیں رہتے ہیں جو اُس میں سدا — سید احمد خاں کا یہ بخشا ہوا القاب ہے

پہاڑ کا منظر

اے خدا کی قدرتوں کے منظرِ زیبا پہاڑ — اے خدا کی صنعتوں کے خلعتِ زیبا پہاڑ
دیکھکر تیری بلندی میں اُترتی پگڑیاں — تیری رفعت کے مقابل سرنگوں ہے آسمان
تیری ہیبت دیکھکر بس دل پہ چھا جاتا ہے رعب — دل میں ہیبت ناک صورت لیکے آجاتا ہے رعب
تیرا استقلال سے رہنا تعجب خیز ہے — تیرا ہلنا تیری جنبش بھی بلا انگیز ہے

تجھ میں پنہاں ہے خدا کی عظمت و قدرت کا راز
ہے عجب تیرا نشیب اور ہے عجب تیرا فراز

کالے کالے بادلوں کا گھر کے آنا روز و شب — بھر کے دریاؤں کے دریا پانی لانا روز و شب
وہ گھٹاؤں کا اُمڈنا اور بجلی کے شرار — وہ ہواؤں کا خرامِ ناز پھولوں کی بہار
آہِ عاشق جیسے چڑھنا آسمان پر ابر کا — چشمِ عاشق کی طرح رونا جہاں پر ابر کا
وہ درختوں کی قطاریں اور وہ پھولوں کا رنگ — وہ نوشتوں کے دلوں میں مدہوشی کی ترنگ

کلامِ اکبر

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشیں برٹش رول
کہ ہر طرح کے مزے بھی ہیں اور اصول بھی ہے

جو چاہے کھول لے دروازہ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ہے وصل اسکی چول بھی ہے

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے
تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے

عمل نہ شغل میں ہے مٹ کے ہو نہ حشو کے
کہ شیخ سند و بھی ہیں اور قدح نول بھی ہے

عطا ہوئی ہے یہ آپ ہی پکروں کو آزادی
کہ حاکموں میں ہے قال تو ہاں قوال بھی ہے

مثلِ مثل چلی ڈاک رتار کی ہر روش
اگرچہ دل میں نہاں عظمتِ رسول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آزبیلی کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

طرح طرح کے بنا لو لباس رنگا رنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اُون بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

اندھیری رات میں جنگل میں ہے دھیان اگن
کہ جسکو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے

شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہرووں کے لئے
نظر نواز ہے یہ حسین مشغول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اُسکے ڈیم فول بھی ہے

خطۂ پنجاب

انتخاب ہفت کشور خطۂ پنجاب ہے
پانچ دریاؤں سے جس کی سرزمیں سیراب ہے

اسکی سرسبزی و شادابی و رونق پر گواہ
راوی و ستلج بیاس و جہلم و چناب ہے

ہسٹوریکل سوسائٹی

ہمیں معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی ہے کہ پنجاب میں ایک علمی سوسائٹی قائم ہوئی ہے جسکا نام پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی رکھا گیا ہے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ پنجاب اور نواحِ پنجاب کی تاریخ اور اسکی قدیم عمارات کی عالمانہ تحقیقات کیجائے۔ اوقاتِ معینہ پر اس سوسائٹی کے جلسے ہوتے رہینگے اور اُن جلسوں میں تاریخ پنجاب کے مختلف شعبوں پر مضامین پڑھے جائینگے اور اُن مضامین پر مباحثے ہونگے۔ جلسہ کی روئداد کے انتخابات بھی وقتاً فوقتاً شائع کئے جائینگے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء بمقام شملہ ایک جلسہ ہوا جس میں اس سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ آنریبل مسٹر مکلگن صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی اس سوسائٹی کے پہلے پریزیڈنٹ مقرر ہوئے ہیں۔ اور جے۔ پی۔ ٹامسن صاحب بہادر وائس پریزیڈنٹ جناب نواب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر پنجاب کو مقاصدِ مجلس سے دلی ہمدردی ہے اور انہوں نے اس مجلس کا مربی ہونا منظور فرمایا ہے۔ اُمید کیجاتی ہے کہ مقاصدِ مجلس سے ہندوستانی اور یورپین علم دوست صاحبان کو یکساں ہمدردی ہوگی۔ گو روئداد انگریزی میں شائع ہوگی تاہم مضامین اُردو یا پنجابی میں بھی پڑھنے کی اجازت ہوگی۔ پنڈت ہری کشن کول صاحب سپرنٹنڈنٹ مردم شماری پنجاب اس سوسائٹی کے خزانچی مقرر ہوئے ہیں۔ دیگر معززین جو اس سوسائٹی کی ترقی میں کوشاں ہیں حسب ذیل ہیں:۔ آنریبل ملک عمر حیات خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای آنریبل خان ذوالفقار علیخان صاحب۔ راجہ سر ہرنام سنگھ صاحب کے۔ سی۔ آئی۔ ای چندہ ممبری کا پانچ روپیہ سالانہ قرار پایا ہے۔ مسٹر اے۔ سی۔ وولنر صاحب رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے فی الحال سکرٹری کی خدمات اپنے ذمہ لی ہیں۔ جو صاحبان سوسائٹی کی بابت کچھ دریافت کرنا چاہیں وہ صاحب موصوف سے خط و کتابت کریں وہ بذریعہ خط صاحب موصوف اُنکے سوالوں کا جواب دینگے۔ اس سوسائٹی کے مقاصد کے مفید ہونے میں کلام نہیں اور اگر سرپرستوں اور عہدہ داروں کے ممتاز نام اس بات کی کافی ضمانت ہیں کہ یہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی +

کے بعد یہ دونوں شخص پیرس سے پچیس میل پر صحیح سالم اُترے۔ اس کے بعد شارل اکیلا بیلون میں بیٹھا۔ اس مرتبہ پہلے کی بہ نسبت بیلون زیادہ ہلکا ہونے کی وجہ سے بہت سُرعت سے اُڑا۔ شارل نے دیکھا کہ سوار ہونے کے وقت آفتاب جو غروب ہو گیا تھا وہ پھر نظر آنے لگا۔ مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) اور مقیاس الہوا (بارومیٹر) جو اس کے ساتھ تھے دم بدم اُترنے شروع ہوئے۔ چنانچہ اوّل ۲۱ ف درجہ پر آ رہا اور ثانی ۰۰۰۰۰ ڈگری تک اُتر گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تقریباً ۹ ہزار سو فٹ بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ تخمیناً ۲۰ منٹ کے بعد ۲ میل کے فاصلہ پر شارل صحیح سالم زمین پر اُترا۔

شارل کے اس تجربہ نے لوگوں کو بیلون کی جانب اور بھی زیادہ متوجہ کر دیا اور بہتیرے شخصوں کو بیلون میں بیٹھ کر عالم سماوی کی سیر کرنے کا شوق چرایا چنانچہ ۱۷۸۴ء میں شارل کے علاوہ پچاس سے زیادہ آدمیوں نے بیلون میں سوار ہو کر ہوا میں اُڑنے کی ہوس نکالی۔ جن میں ایک فرنچ لیڈی میڈم تھیبلے بھی تھی جو بمقام لیون بیلون کے ذریعہ ۱۳ ہزار ۵ سو فٹ بلند اُڑ کر صحیح سالم اُتر آئی۔ غالباً یہی پہلی عورت ہے جس نے یہ قابلِ تعریف جرأت دکھا کر جنس اناث کے لئے اس جرأت کی بنیاد قائم کر دی۔

سید شہاب الدین مہدی

نہیں کہ یہ آدمی کو بھی لے اُڑیں پس اس خیال سے اُس نے اور روزیر و دو شخصوں نے
غبارہ میں بیٹھکر اُڑنے کی جرات کی اور ایک غیر محفوظ بیلون میں سوار ہوکر تقریباً
تین ہزار فٹ بلند اُڑکر پیرس کے قریب صحیح سالم زمین پر اُترے۔ پھر کیا تھا اِنکی
اس کارروائی نے تمام یورپ میں ہلچل ڈالدی اور لوگ بیلون کو ایک کارآمد چیز
خیال کرنے لگے اور اس سے مفید کام لینے کا خیال شروع ہوگیا۔ چنانچہ اسی سال
کانون اوّل[1] میں شارلز جو اپنی عمر میں ۶۶ مرتبہ غبارہ میں سفر کرنیکی وجہ سے پہلا
مسافر ہوا مشہور ہے غبارہ میں بیٹھکر اُڑنیکا قصد کیا۔ اس وقت تک جتنے غبارے
اُڑائے گئے تھے وہ سب دُخانی تھے۔ اور اوّل اوّل یہ خیال کیا جاتا تھا۔
کہ دھواں اپنی طاقت سے غبارہ کو لے اُڑتا ہے۔ لیکن بعد میں یہ خیال غلط نکلا
اور غبارہ کے اُڑنے کی وجہ اُس کی اندرونی گرم گرم ہوا کی خفت ثابت ہوئی
لیکن شارل کو ہیڈروجن کی ایجاد اور اس کی خفت وغیرہ خاصیتوں کا علم ہوچکا
تھا اس لئے مانٹگالفر کے غبارہ کی طرح آگ جلاکر ہوا کو ہلکا کردینے کی مطلق
ضرورت نہیں رہی تھی۔ جو اس سے پہلے رائج اور نہایت پُرخطر طریقہ تھا۔ اُسنے
ریشمی کپڑے کا ایک غبارہ بنایا۔ غبارے میں کاغذ نہ ہونے سے وہ زیادہ بھاری
ہوجاتا تھا اور بیٹھکر اُڑنے کے لئے وہ جس قدر ہلکا ہو اسی قدر مفید تھا اسلئے
مسامات بند کرنے کے لئے اُس نے ریشم کو السی کے تیل اور تارپین
تیل میں پکاکر اس پر پالش کردی جس سے کپڑے کے مسامات بند ہوگئے اور
گیس کے خارج ہونے کا مطلق اندیشہ نہیں رہا۔ غبارہ سے ایک کشتی لٹکائی
گئی تھی جس میں شارل اور اس کا دوست رابرٹ اور بقول بعض [illegible] بیٹھے
ہوئے تھے۔ جوں ہی غبارہ میں گیس بھر گئی وہ فوراً کشتی اور ان دونوں سمیت
ہوا میں بلند ہونا شروع ہوا۔ (دیکھو فقرہ ۵) اور بہت بلند ہوکر تھوڑے عرصہ

[1] دسمبر کا رومی نام ہے۔

اس کے نیچے ایک سوراخ رکھکر اس کے منہ پر روغنی مادوں کا ایک شعلہ رکھدیا۔ جس سے تھیلے کے اندر دھواں بھر گیا اور آخر وہ تھیلا خود بخود زمین سے بلند ہوکر دس منٹ ہوا میں اڑتا رہا۔ اور جب دھواں خارج ہو گیا تو رفتہ رفتہ اترتا اترتا زمین پر بیٹھ گیا۔ یہی سب سے پہلا غبارہ یا بیلون تھا جس کا وزن ۴۹۰ اونس تھا۔ ۵ جون ۱۷۸۳ء کو اڑایا گیا اور تقریباً ایک میل بلند ہوکر ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر گرا۔

اس واقعہ کی بہت جلد یورپ میں شہرت ہو گئی خصوصاً اہل پیرس کو اس کی جانب بہت توجہ ہوئی اور ایم فاکس ڈی سینٹ عالم علم حیوانات نے پھر دوبارہ تجربہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کا کل خرچ اپنے ذمہ لیا۔ پس جوزف مانٹگلفر نے ریشمی کپڑے کا ایک اور غبارہ بنایا جس کا قطر ۱۲ فٹ تھا۔ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے ۲۷ اگست سنہ مذکور کو پھر دوبارہ غبارہ اڑایا گیا۔ جو پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک کھیت میں گرا۔ دیہاتیوں کے لئے یہ بالکل انوکھی چیز تھی جس کو دیکھکر وہ سخت متحیر اور خوف زدہ ہوئے اور اسکو پھاڑ ڈالا۔

مانٹگلفر نے ستمبر سنہ مذکور کو بمقام ورسلز بادشاہ اور ملکہ کے روبرو ایک اور غبارہ اڑایا جو نہایت خوشنما تھا یہ غبارہ پندرہ سو فٹ بلند ہوکر آٹھ منٹ میں زمین پر اترا۔ ان تجربات سے اکثر لوگوں کے خیالات بیلون کی جانب منعطف ہوگئے اور اسی کے قریب بہت سارے غبارے اکثر لوگوں نے اڑائے۔ اسی سال سب سے پہلے لندن میں بھی غبارہ کا تجربہ کیا گیا۔

اس وقت تک کسی شخص نے غبارے میں بیٹھکر اڑنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ سب سے پہلے بلانشارڈ کو جسے سب سے پہلا پرواز کنندہ کہا جاتا ہے۔ خیال پیدا ہوا کہ یہ غبارے جس قدر طاقت سے اڑتے ہیں اس پر نظر کرتے عجب

سنہ ۱۶۷۰ء میں فرانسس لانا نے ایک ایسی مشین بنائی جو خود بخود ہوا میں اڑ سکتی تھی
یہ مشین دراصل ایک چھوٹی کشتی تھی جس کے بیچ میں ایک دراز مستول اور بادبان
اور چاروں گوشوں پر پچیس پچیس فٹ قطر کے چار مجوف گولے لگائے گئے تھے
جن میں گرم گرم ہوا بھری ہوئی تھی۔ یہ گولے اس قدر رقیق تھے کہ انکا حجم یا ضخامت
صرف $\frac{1}{225}$ انچ تھی اس لئے وہ ہوا کے دباؤ کی تاب نہ لا سکے اور فوراً پھٹ گئے۔

اسی طرح سترھویں صدی عیسوی کے ختم اور تقریباً اٹھارھویں نصف صدی
تک کئی ایک شخصوں نے جنہیں فلسفہ میکانیکل میں کما حقہ مہارت نہیں تھی اسی خیال
میں بہتیری کوششیں کیں لیکن کسی کو خاطرخواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر سنہ ۱۷۶۶ء
میں جب پروفیسر کیاونڈش نے ہیڈروجن گیس دریافت کی جو معمولی ہوا سے تخمیناً
۱۴ گنی ہلکی ہے تو گویا ہوا میں اڑنے کی کنجی ہاتھ لگ گئی۔

سنہ ۱۷۶۷ء میں مسٹر بلاک نے بمقام ایڈنبرگ ملاندہ کے روبرو یہ تجربہ کر دکھایا۔
کہ جب کسی کمو کھلے خالی گولے میں یہ گیس بھر دیجاتی ہے تو وہ خود بخود ہوا میں اڑنے
لگتا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی سنہ ۱۷۸۱ء میں کاولو نے بہتیرے تجربات کئے لیکن صابون
کے بلبلوں سے زیادہ سنگین چیز نہیں اڑا سکا۔ قصبہ انونے کے باشندے
پیٹر مانٹگلفر کاغذ ساز کے دو لڑکے اسٹیفان اور جوزف مانٹگلفر نے بادلوں کو ہوا
میں اڑتا دیکھکر یہ خیال کیا کہ اگر کسی ہلکے تھیلے میں انہی بادلوں کی خاصیت کی ہوا
بھر دیجائے تو یقیناً وہ بھی ہوا میں اڑ سکے گا۔ لیکن اس وقت تک انہیں ہیڈروجن
کی مطلق خبر نہ تھی اور قطعی طور پر صرف یہی معلوم تھا کہ ہر وقت آگ جلانے سے
دھواں ہوا میں اڑ جاتا ہے پس انہوں نے اپنے خیال کی تکمیل کے لئے دھوئیں
سے کام لینے کا مصمم ارادہ کر کے ۱۰۵ فٹ محیط کا ایک تھیلا بنا کر اس پر کاغذ منڈھا

ڈوب جانے کا سبب یا اُن کے اس فعل کے انکار کا باعث نہیں بن سکتی۔

حکیم ارخیتاس نے سنہ عیسوی سے چار سو سال قبل لکڑی کا ایک کبوتر بنایا تھا جو چند لحظے ہوا میں اُڑتا رہتا تھا۔

سوٹیونوس کا بیان ہے کہ قیصر روم نیرون کے عہد میں سیمون نامی ساحر نے مصنوعی پر لگا کر ایک مکان سے اڑ کر دوسرے مکان پر پہنچنے کی کوشش میں اپنی جان دی۔

روجر بیکن متوفی سنہ ۱۲۹۲ء یا سنہ ۱۲۹۴ء کسی ایسے آلہ کی ایجاد کو ممکن بتاتا تھا جو مصنوعی بازوؤں سے پرندہ کی طرح اُڑے اور اُڑا سکے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ڈانتی جو اعلیٰ درجہ کا ریاضی دان گذرا ہے مصنوعی بازوؤں کے وسیلہ سے جنہیں جسم سے باندھ لیا تھا بمقام پیروجیا جھیل ٹراسیمینی پر ہوا میں کسیقدر بلند اُڑا تھا۔

سنہ ۱۶۱۷ء میں مسٹر فلیڈ نے بزنگمن کے گرامر سکول میں "ہوا میں اڑنے" پر ایک لکچر دیا جس میں اس کے متعلق بعض اصول بیان کئے تھے۔ اس سے گیارہ سال بعد جب مسٹر فلیڈ نے اپنا لکچر شائع کر دیا تو اسکو دیکھکر ایک شخص کو ہوا میں اُڑنے کا خیال پیدا ہوا، اور پر لگا کر اُڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا اور زمین پر گر کر مر گیا۔

سینٹ آسٹائن کا ایک راہب مسمی البرٹ سیکزنی جس کی نظر سے ارسطاطالیس کی اکثر تصانیف گذری تھیں یہ بیان کرتا تھا کہ آگ رقیق ہوتی اور ہوا پر اُڑتی ہے اگر یہ بخارات کسی کھوکھلے کرے میں بھر دیے جائیں تو وہ بھی ہوا میں اُڑ سکتا ہے لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ایک پرتگالی شخص فرانسس منڈوزا نے جسکا انتقال سنہ ۱۶۲۶ء میں ہوا ہے کچھ تجربات کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اس جلانے والے مادے میں بذاتہ یہ صلاحیت نہیں ہے بلکہ آگ سے ہوا گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی ہے اور اس میں تموج پیدا ہوتا ہے۔

سے ابر کی بلندی سے اونچا پہنچ گیا تھا۔ تاریخ طبری میں لکھا ہی کہ تخت پر کیکاؤس کے ہمراہ اور کئی آدمی تھے لیکن سب کے سب نذرِ اجل ہوئے اور صرف کیکاؤس بخت و اتفاق کی مدد سے جانبر ہوا۔

قدیم قصوں سے خاص ہندوستان میں بھی اگلے زمانہ میں اڑن کھٹولوں کا صرف وجود ہی نہیں پایا جاتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل سواری کا کام دیتے تھے۔ لیکن افسوس ہی کہ یہ ہندوستان کی تاریخ کا بالکل تاریک زمانہ ہے جسکی وجہ سے ہم انکی ہیئتِ کذائی کے متعلق کچھ بھی بحث نہیں کر سکتے۔ تاہم جب یہ مسلم بات ہے کہ قوانینِ قدرت یا نوامیس طبعی کبھی خلل پذیر نہیں ہو سکتے اور ہر زمانہ میں صحیح و صادق ہیں مثلاً پانی و ہوا اس وقت بھی جبکہ وہ پہلے پہل دنیا میں پائے گئے آج ہی کی طرح سیال تھے اور سیالات کی کل خاصیتیں رکھتے تھے اور جس طرح آج ہیں اسی طرح آیندہ زمانہ میں بھی رہیں گے۔ جس طرح ہوا یا پانی میں پھینکا ہوا پتھر آج سطح زمین کی طرف اترتا جاتا ہے پہلے بھی اس کی یہی حالت تھی۔ اگر آج خس و خاشاک اور دوسری ہلکی چیزیں سطح آب پر تیرتی اور دھواں۔ بخارات وغیرہ زمین سے اٹھکر ہوا میں بلند ہوتے ہیں تو پہلے وہ پانی میں ڈوب نہ جاتے اور یہ زمین پر گر نہ پڑتے تھے۔ رہی یہ بات کہ اس زمانہ میں ان قوانین کا علم بھی حاصل تھا یا نہیں۔ اسکی نسبت اگلے زمانہ میں جب حکمائے مصر و یونان ہندیوں کے [illegible] تسلیم کئے گئے ہیں تو اس قسم کے علم کا خواہ مخواہ انکار کرنے کی جواز عقلی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسکے قطعِ نظر کسی نتیجہ طبعی کے ظہور پذیر ہونے کے لئے قانونِ طبعی کا علم کچھ ضروری نہیں۔ بیشمار آدمی پانی میں تیرتے ہیں مگر اس قاعدہ کی انہیں مطلق خبر نہیں۔ سینکڑوں ملاح ایسے ہیں جن کی عمریں جہاز رانی میں صرف ہو گئی ہیں۔ حالانکہ انہیں سیالات کی نسبت قوانینِ طبعی کا کما حقہ علم ہی نہیں ہے اور انکی یہ لاعلمی ان کے

سے پانی یا ہوا میں متضاد تموّج پیدا کر کے ہر طرف پلٹ سکتے اور کبھی اوپر چڑھ سکتے اور کبھی نیچے اُتر سکتے ہیں۔

ہوا میں اُڑنے کا تاریخی بیان | ہوا میں اُڑنے کی اصولی بحث کے بعد ہم اس کے تاریخی پہلو کی جانب متوجہ ہو کر یہ بتاتے ہیں کہ اس کا وجود کب سے پایا جاتا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے کیا کیا کوششیں کی گئیں اور اس میں وقتاً فوقتاً کیا کیا تبدیلیاں کی گئیں۔

مذہبی لحاظ سے تختِ سلیمان کا ہوا پر اُڑنا مشہور ہے جو آزاد خیال جنٹلمینوں کے نزدیک خلافِ عقل اور ایک ڈھکوسلا متصور ہوتا ہے۔ لیکن جس شخص کا دماغ سائنس کی وسیع معلومات کی ضیاء سے منوّر ہو اور خدا تعالیٰ کی قدرت یا نیچر کی نامحدود صناعیوں کے حیرت انگیز کرشمے جو بڑے بڑے عقلمندوں کی عقلوں کو حیران کر دیتے ہیں۔ اُس کے پیشِ نظر ہوں۔ اس کے نزدیک یہ بالکل ممکن اور موافقِ عقل ہے۔

اسی زمانہ کے قریب قریب کا ایک اور واقعہ ہوا میں اُڑنے کا مؤرخینِ فارس وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ یعنی کیکاؤس شاہِ ایران نے ستارہ شماری اور بقول بعض خدا سے مقابلہ کے قصد سے آسمان پر چڑھ جانے کے لئے یہ تجویز کی تھی کہ ایک تخت کے بیچوں بیچ ایک بانسے پر جو تخت میں جما ہوا تھا گوشت لٹکا دیا گیا اور اس کے چار گوشوں پر چار زبردست بھوکے عقاب باندھ دیئے گئے۔ جب عقاب گوشت پر جھپٹے تو ان کے زور سے تخت بھی اُڑتا گیا۔ وہ گوشت کے لئے جس قدر زیادہ گرمِ پرواز ہوتے تخت اسی قدر بلند ہوتا جاتا تھا۔ جب تک اُن عقابوں کے بال و پر نے یاری دی وہ تخت کو لئے جوِ سما میں منڈلاتے رہے اور جب اُن کی قوتِ پرواز سلب ہونی شروع ہوئی تو تخت بھی سرِ نشیب ہونے لگا اور ارضِ آمل کے قریب زمین پر آ رہا۔ فردوسی کے طرزِ بیان سے یہ پایا جاتا ہے کہ کیکاؤس اس ترکیب

چیز کثیف سیال میں تیرتی ہو وُہ لطیف سیال میں ڈوب جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کشتی یا اسٹیمر سمندر کے کھدرے پانی میں انتہائی حد تک بھر دیا جائے تو وُہ کسی دریا کے میٹھے لطیف پانی میں پہنچکر ضرور ڈوب جائیگا۔

پانی کی طرح ہوا کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کرہ زمین کے اطراف تقریباً پچاس میل عمیق ہوا کا سمندر ثابت ہوا ہے۔ اس میں جو ہوا زمین سے متصل ہے وُہ گرد و غبار اور کاربانک ایسڈ گیس وغیرہ کی آمیزش سے کثیف ہے اور جیسے جیسے اوپر بڑھتے جائیں وُہ لطیف ہے۔ پس جو غبارہ سطح زمین سے متصل کثیف ہوا سے ہلکا ہونے کی وجہ اڑ سکتا ہے وُہ تھوڑی دُور اوپر پہنچکر لطیف ہوا کے مساوی الوزن یا اس سے ہلکا ہونے سے اور اوپر نہیں چڑھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بیلون جب مناسب بلندی پر پہنچنے کے بعد لطیف ہوا کے مساوی الوزن ہو کر رُک رُک جاتا ہے تو اور اوپر چڑھنے کے لئے صابورہ[۱] پھینک پھینک کر اسکو ہلکا کرنا اور نیچے اُترنے کے لئے اُس میں بھری ہوئی ہلکی گیس کو خارج کر کرکے اُسکو اپنے مساوی الحجم ہوا سے بھاری کر دینا پڑتا ہے جس کے بغیر وُہ کبھی اوپر یا نیچے چڑھ یا اتر نہیں سکتا۔

پانی یا ہوا کے سمندر میں تیرنے کی ایک اور بھی صورت ہے وُہ یہ کہ تیرنے والی چیز گو اس سیال سے ہلکی نہ ہو۔ لیکن وُہ ہر دم اپنے مساوی سیال کو ہٹاتی یا کاٹتی رہے تو وُہ بھی اس کی سطح پر تیر سکتی ہے مثلاً آدمی وغیرہ جو پانی میں تیرتے اور پرندے جو ہوا میں اُڑتے رہتے ہیں وُہ اپنی قوت ارادی کے ساتھ جو اُس کا جزو اعظم ہے اپنے ہاتھ پیر یا پروں سے اپنے مساوی پانی یا ہوا کو ہٹاتے یا کاٹتے رہنے سے تیر اور اُڑ سکتے ہیں اور اپنے اعضا یا پروں کی مختلف حرکتوں

[۱] وُہ مٹی یا ریت وغیرہ جو صرف اسی غرض سے بیلون میں بھری جاتی ہے۔

کو تیرا سکیگا - یہی وُہ کلیہ ہے جو فنِ جہازرانی کا اصل اصول ہے اور اسی قاعدے کے موافق کشتیوں اور جہازوں میں ہزاروں لاکھوں من وزنی سامان و اسباب اور سینکڑوں ہزاروں آدمی لدے ہوئے سطحِ آب پر تیرتے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ جس طرح پانی پر صادق ہے اسی طرح ہوا پر بھی ٹھیک ٹھیک حاوی ہے۔

آتشبازی کے مذکورہ غبارے میں دھواں بھرنے کے بعد اس کے حجم اور وزن کے موافق کوئی وزن اس سے باندھ دو - تو وُہ اپنے ساتھ اسکو بھی لے اُڑیگا جس طرح پانی پر تیرنے والی چیز جس قدر زیادہ بڑی ہوگی اُسی نسبت سے زیادہ وزنی شے کو تیرا سکیگی - اسی طرح ہوا میں اُڑنے والا غبارہ بھی جس قدر زیادہ بڑا اور اپنی مساوی الحجم ہوا سے جتنا زیادہ ہلکا ہوگا اُسی قدر زیادہ وزن کو اپنے ساتھ اُڑا سکیگا - حتیٰ کہ غبارے کا ڈھانچہ اگر زیادہ بڑا ہو تو ایک یا کئی آدمی کو بھی اُڑا لیجا سکتا ہے - چنانچہ جس بیلون یا غبارہ کا قطر تیس فٹ ہو اور اس میں ۱۴۱۴۲ مکعب فٹ ہیڈروجن گیس بھری جائے وُہ بیلون کے ڈھانچہ کے علاوہ ۱۱ من ۳۴ سیر وزن اُڑا لیجائیگا جو ایک چھوٹی کشتی کے بار سے بہت زیادہ ہے۔

"سیال" مادوں کی اس خاصیت اور اس قاعدۂ کلیہ کے ذکر کے بعد یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان میں تیرنے والی چیزوں کا ہلکا یا بھاری پن جو اُن کے تیرنے یا ڈوبنے کا باعث ہے "سیال" مادوں کی لطافت و کثافت کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتا ہے - جو چیز کسی لطیف سیال میں ڈوب جاتی ہو وُہ اس سے کثیف سیال میں تیرنے لگیگی - اس کو تجربہ کرنا ہو تو بارش کے پانی یا کشید کئے ہوئے لطیف پانی میں کوئی ایسی وزنی شے ڈالدو جو اپنے مساوی الحجم معمولی پانی کے ہموزن یا اُس سے کچھ ہی بھاری ہو اس صورت میں وُہ ڈوبی رہیگی - اب اس پانی میں نمک ڈالتے جاؤ تو پانی کثیف ہوتا جائیگا اور آخر وُہ شے پانی پر تیرنے لگیگی - اسی طرح جو

مُنہ کے قریب ایک شعلہ جلا کر اُس میں دُھواں[1] بھر دیا جائے تو وُہ خود بخود اُوپر کو اُٹھتا اُٹھتا اسقدر بلند ہو جاتا ہے کہ آسمان کا تارا معلوم ہونے لگتا ہے - اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ دُھواں بھرنے کے بعد غبارہ کا ڈھانچہ اپنی مساوی الحجم ہَوا سے ہلکا ہوتا ہے اور یہ اسی قاعدہ کے موافق ہَوا میں اُوپر چڑھنا شروع ہوتا ہے - اور جب دُھواں خارج ہو کر غبارے میں ہَوا بھر جاتی ہے تو پانی بھرے مشکی کی طرح یہ اپنی مساوی الحجم ہَوا سے بھاری ہو جاتا اور اسی لئے نیچے کو اُترنا شروع ہوتا ہے - اسی طرح جو غبارہ ایک مناسب بلندی پر پہنچنے کے بعد اوپر کی لطیف ہَوا کے مساوی الوزن ہو جاتا ہے تو جب تک یہ حالت قائم رہے اوپر یا نیچے ہٹے بغیر ہَوا کے رُخ پر اُفقی حرکت کرتا اور اِدھر اُدھر منڈلاتا رہتا ہے -

یہانتک تو یہ ثابت ہُوا کہ کسی سیّال مادے کی مساوی الحجم ہلکی چیز اسکے بیچ میں ڈوبنے نہیں پاتی بلکہ تیرتی رہتی ہے - لیکن ہر تیرنے والی چیز اپنے حجم اور وزن کے اعتبار سے اسی قاعدہ کے موافق دُوسری شے کو بھی تیرا سکتی ہے - کسی دھات کا ایک رقیق پیالہ ایک ٹب میں پانی بھر کر اسکی سطح پر سیدھا چھوڑ دو - وُہ اپنے مساوی الحجم پانی سے ہلکا ہونے کے باعث تیرتا رہیگا - اب اس پیالہ میں ایک چھوٹا سا پتھر رکھدو - پھر بھی وُہ تیرتا اور پتھر کو بھی تیراتا رہیگا - یہ کیوں؟ اسی لئے کہ وُہ پیالہ پتھر سمیت اپنے مساوی الحجم پانی سے پھر بھی ہلکا ہے - یہ پیالہ جس قدر بڑا اور ہلکا ہوگا اسی قدر بڑے پتھر یا اور کسی وزنی شے کو تیرا سکتا ہے - چنانچہ خود اس ٹب کو جس میں پانی بھر کر یہ تجربات کئے گئے تھے خالی کر کے کسی لبریز حوض میں چھوڑ دو تو وُہ خود پانی کی سطح پر تیرتا رہیگا - اور ایک اچھے خاصے تنومند شخص

[1] دُھواں بھرنا ظاہری لحاظ سے کہا گیا ہے ورنہ اصل میں آگ کے ذریعہ اندر کی ہَوا گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی اور غبارہ اپنے مساوی الحجم ہوا سے ہلکا ہو جاتا ہے -

وُہ ٹھیک اپنی جگہ قائم رہیگی۔ کسی بیرونی شئے کے لئے جو قاعدہ ہو وُہی اس سیّال
کے اجزا کے لئے بھی حاوی ہے یعنی سیّال مادے کے جو اجزا بھاری ہونگے
وُہ نیچے کی جانب اُتریںگے اور جو اجزا ہلکے ہونگے وہ اُوپر کو چڑھینگے۔ چنانچہ ہوا
یا پانی کے جو اجزا حرارت سے گرم ہو جاتے ہیں وُہ سرد اجزا کی نسبت ہلکے ہوتے
ہیں اور اسی لئے جہاں کہیں ایسی صورت پیش آتی ہے۔ وہاں گرم گرم اجزا اوپر
کو چڑھتے جاتے ہیں اور سرد اجزا نیچے کو اُترتے آتے ہیں۔

یہ ایک ایسا مسئلہ قانون طبعی ہے جو بہت سے واضح تجربوں سے ثابت ہوا
ہے۔ چنانچہ ان صاف صاف مثالوں سے یہ قاعدہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے ایک
خالی کپّے یا تنگ مُنہ کے مٹکے کا مُنہ مضبوط بند کرکے گہرے پانی میں ڈبو دو۔
وُہ فوراً اُوپر کو آجائیگا۔ اس میں کوئی سنگین شئے مثلاً ریت۔ لوہ چون۔ یا تودہ پانی بھر
کر پانی کی سطح پر چھوڑ دو تو وُہ جھٹ ڈوب جائیگا۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ پہلی
صورت میں وُہ اپنے مساوی الحجم پانی سے ہلکا تھا۔ کیونکہ اس میں کسی بھاری چیز کے
عوض ہوا بھری ہوئی تھی۔ یہ تو بھاری اور ہلکی ہونے کی صورت تھی۔ اب اسی خالی
مٹکے کا مُنہ کھلا رکھ کر اسکو ترچھا کرکے اُس میں ذرا سا پانی داخل کرو اور پھر پانی میں
چھوڑ کر دیکھو اگر ڈوبنے لگے تو تھوڑا سا پانی اونڈیل دو اور جو اسی طرح اُوپر کو تیرتا
رہے تو اَور پانی داخل کر دو۔ غرض تھوڑی سی اُلٹ پلٹ میں یہ مٹکا اس حالت پر
پہنچ جائیگا کہ پانی میں جہاں چھوڑ دو۔ ٹھیک اُسی حد پر قائم رہے اور اوپر یا نیچے
ذرا بھی ہٹنے بغیر اِدھر اُدھر منڈلاتا پھرے۔

یہ تو پانی کی مثال تھی۔ اب ہوا کو دیکھو تو اُس پر بھی یہی قاعدہ پُورا پُورا صادق
آتا ہے۔ آتشبازی کے کاغذی غباروں کو جو عموماً تقریبوں میں اُڑائے
جاتے ہیں۔ زمین پر رکھدو تو جہاں تھے وہیں پڑے رہینگے۔ اگر کسی غبارے کے

ہَوا۔ پانی کی بھاپ۔ دھواں وغیرہ "سیال" کی جو تعریف ہے وہ ان دونوں پر پُوری پُوری صادق آتی ہے۔ لیکن ان دونوں میں باہم حالت و ہیئت کے علاوہ جو ظاہر ہے دُوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ "مائع" کا حجم دباؤ سے سُکڑ نہیں سکتا اور "گیس" کا سُکڑ سکتا ہے۔ مائع کے اجزا میں باہم کشش اتصال کم ہے اور اسی وجہ سے وہ کسی خارجی طاقت کے سبب سہولت کے ساتھ جُدا ہو جاتے اور مائع زائل ہو جائے تو پھر باہم مل جاتے ہیں۔ مگر گیس کے اجزا میں کشش اتصال مطلق نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن میں میلانِ ابتعاد (ایک دُوسرے سے دُور اور جُدا جُدا رہنے کا میلان) پایا جاتا ہے اور اسی سبب سے وُہ صرف کسی خارجی طاقت یا دباؤ کے باعث باہم متصل رہتے ہیں اور جب دباؤ کم ہو جائے تو فوراً ایک دُوسرے سے جُدا جُدا ہو کر پھیلنے لگتے ہیں۔ اسی خاصیت کو قوتِ تمدد (پھیلنے یا چڑھنے کی قوت) کہتے ہیں۔ غرض اسی لحاظ سے مادہ کی تین حالتیں ثابت ہوئیں۔ جامد۔ مائع۔ گیس۔

کل سیالات (دونوں) کا عام اس سے کہ وُہ مائع ہوں یا گیس یہ خاصہ ہے کہ جو چیز اُن میں گرے اگر وُہ اپنے مساوی الحجم[1] سیال سے بھاری ہو تو اُس میں ڈوب جائے گی۔ جو ہلکی ہو اس کی سطح پر تیرے گی۔ اور اگر ٹھیک مساوی الوزن ہو تو

[1] اس کے یہ معنی ہیں کہ اس چیز کی مقدار کے موافق اس سیال کا بھی ایک حصہ یا ٹکڑا لیا جائے۔ مثلاً کسی چیز کا ایک تول گینہ ہے تو دیکھا جائے کہ وُہ اسی حجم کے پانی کے گینے سے بھاری ہوگا یا ہلکا۔ اس کی دریافت کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی برتن کو رکابی میں رکھکر اس میں لبالب پانی بھر دو کہ ایک قطرہ کی بھی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسے برتن میں وہ گینہ ڈبو دو تو اس سے برتن کا جس قدر پانی رکابی میں گر پڑے وُہ اس کا مساوی الحجم ہوگا۔ اب اس پانی اور اس گینہ کو باہم وزن کرنے سے اس کا اپنے مساوی الحجم پانی سے بھاری یا ہلکا ہونا ثابت ہو جائیگا۔ دُوسرے سیالات کو بھی اسی پر قیاس کرلو۔

یہی معمولی کام بھی اس غیر معمولی حیثیت سے ادا ہوا ہے کہ دیکھنے والوں کو حیران و ششدر
بنا دیا ہے۔ یہی انسان جو اپنے ڈنڈ مونڈھوں کے بل مختصر پیمانوں پر مینڈک کی طرح
ہاتھ پیر مارتا دکھائی دیتا ہے کبھی اپنا سینہ سپر کرکے کشتیوں جہازوں کی طرح
جوش زن دریاؤں سے پار اترتا۔ بڑی بڑی جھیلوں تالابوں کو عبور کرتا سمندروں
میں میلوں تیرتا نظر آتا ہے اور کبھی زیر آب چلنے والے اسٹیمروں کی ایجاد سے
غوطہ زنوں کی طرح منٹوں گھنٹوں نہیں بلکہ کئی کئی روز پانی کے اندر ہی اندر
مسافت طے کرتا گویا در مقصود کی تلاش میں سمندر کی تھاہ کو ٹٹولتا پھرتا معلوم
ہوتا ہے۔ غرضکہ انسان نے اپنی عقل کے پر زور ہتھیار کے ذریعہ دنیا کے
تین ربع غیر مسکون یعنی تری اور طبعی مادوں میں ایک بہت زیادہ مادے
یعنی پانی کو بالکل مسخر اور اپنا پورا پورا مطیع و منقاد بنا لیا ہے جو ہر طرح اسکی مرضی
کے موافق کام دینے کے لئے کافی طور پر رام ہو گیا ہے۔

اس کامیابی سے انسان کو فطرتی و طبعی حرص جوع البقر کی تھا اور وہ ایک
اور کثیر الوجود اور اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری مادہ یعنی ہوا کو مسخر کرکے اس سے
بھی وہی کام لینے پر آمادہ ہوا۔ یا یوں کہو کہ انسان کی جبلی طبیعت اسکی روز افزوں
ترقی کرنے کی قابلیت نے اسکو اس بات پر ابھارا کہ جب دوسرے بری حیوانات
کی طرح خشکی پر چلنے اور مچھلی کی طرح پانی پر تیرنے کی ہوس نکال کر تجربہ کر لیا
ہے تو آؤ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑکر عالم سماوی کی بھی سیر کریں۔ جس طرح
ریل اور جہاز کے ذریعہ خشکی اور تری کی طنابیں کھینچ کر مشرق و مغرب کو متصل کر دیا
تھا اسی طرح کسی مستقل ہوائی سواری کے ذریعہ جنوب ۱؎ و شمال کو باہم قریب کر دینے
کا خیال شروع ہو گیا۔

۱؎ جنوب قطب شمالی کی تحقیق میں سمندر کے منجمد رہنے سے لاکھوں روپیہ صرف ہو سکتے ہیں باوجود

ہوا میں اُڑنا

"انجمن معتمدیہ حیدرآباد دکن کی تحریک پر مولوی سید شہاب الدین صاحب ممبر انجمن نے ایک رسالہ ہوا میں اُڑنے پر لکھا تھا - آجکل چونکہ یورپ میں جا بجا ہوا میں اُڑنے کے تجربے ہو رہے ہیں اور ہندوستان میں بھی نئے غبارے پہنچنے والے ہیں - جن پر پہلوں سے زیادہ تحقیق کے ساتھ پرواز کا نمونہ دکھایا جائیگا اس لئے ہوا میں اُڑنے کا اصولی اور تاریخی بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا اور ہم اُس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

یہ کون نہیں جانتا کہ پانی میں تیرنا اور ہوا میں اُڑنا مچھلی اور پرندوں سے مخصوص ہے لیکن آدمی میں خدا تعالیٰ نے عقل کا جو بیش قیمت جوہر اور اُس کی فطرت میں جو نامحدود قابلیت ودیعت رکھی ہے - اس کے وسیلہ سے جس طرح اُس نے بہت سے بظاہر ناممکن کاموں کو ممکن کر دکھلایا اور بر وقت دکھا سکتا ہے - اسی طرح وہ بغیر پر کے پانی میں تیرنے اور ہوا میں اُڑنے میں کامیاب ثابت ہوا اور ہو سکتا ہے -
پانی میں تیرنا انسان سے اتنے قدیم زمانہ اور اسقدر کثرت سے صادر ہوتا رہا ہے کہ وہ کوئی اچنبھے کی بات ہی نہیں رہی ہے - چنانچہ بلا واسطۂ آلات صرف اپنے ڈنڈ اور مونڈھوں کے بل سطح آب پر تیرنا اور تہ آب غوطہ لگانا ایک معمولی کرتب ہو گیا ہے - اسی طرح بواسطۂ آلات و اوزار یعنی کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سطح آب پر خشکی سے بھی کہیں زیادہ سہولت و آسانی کے ساتھ سمندروں کو ناپتے پھرنا ایک معمولی کام سمجھا جاتا ہے - لیکن جہاں یہ کرتب اپنی کثرت وقوع سے معمولی بات ہو گیا ہے - وہیں یہ قابل غور ہے کہ بعض بعض صورتوں میں انسان نے

اور اپنے عہد کے موافق حسب سابق برابر چندہ روپے ماہوار دیتا رہا۔ اس سال کامل امید ہے کہ
انکی تنخواہ میں ترقی ہوگی جس سے اس محلے کے خیراتی سرمایہ کو مزید فائدہ پہنچیگا۔ پچھلے
سال کے اخراجات مجمل طور پر یہ ہیں۔ ایک بڑے صاحب کا انتقال ہوا جو عرصے سے
اس محلے میں رہتے تھے اور جو تا زیست دو پیسے ماہوار چندہ دیتے رہے چنانچہ
انکی تجہیز و تکفین جلسے کی طرف سے ہوئی۔ محلے کی دو کتخدا لڑکیوں کی شادی کی گئی۔
یہ بے ماں باپ کی بچیاں تھیں اور اپنی نانی کے ساتھ رہکر بڑی مشکل سے گزارا کرتی
تھیں۔ مجلس کیطرف سے انکی نانی کو پانچ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ محلے کے پانچ لڑکوں
کو تین تین روپے ماہوار وظیفہ بغرض تعلیم دیا جاتا ہے۔ دیگر اخراجات مختصراً یہ ہیں۔
مسجد کے ملا کی تنخواہ میں اضافہ۔ مسجد کا رکھ رکھاؤ وغیرہ اور محلے کے سقے کی
ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے پنچوں نے اسکی خدمت کے صلہ میں چار روپے
ماہوار منظور کئے۔ نیز مفلسی کی بنا پر تحقیقات کے بعد پانچ روپے ایک شخص مسمی اکبر خاں
تارکش کے لئے منظور ہوئے۔ یہ شخص اگرچہ اس محلے کا رہنے والا نہیں مگر اس کی بیوی
کی مصیبت کا حال سنکر والد مرحوم کے دل میں اس جلسے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ دیگر
یہ کہ اس سال مجلس کو خدا کے فضل و کرم سے زیادہ آمدنی کی امید ہے اس لئے
میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اس محلے کے ہر لڑکے لڑکی پر آپ کی کثرت رائے سے تعلیم لازمی
کر دیجائے اور وہ اصحاب جو خود تعلیم کی زیر باری نہیں برداشت کر سکتے اُن کے
بچوں کے تعلیمی اخراجات جلسہ اپنے ذمے لے"۔ اس تجویز کی اگرچہ دس پندرہ آدمیوں
نے مخالفت کی۔ مگر کثرت رائے سے منظور ہوگئی اور ہاشم نے کہا کہ میں یہ کارروائی
اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ یارب جس طرح تونے اپنے خیراتی معاملات کو سرانجام
دینے کی توفیق ہم کو عطا فرمائی ہے اسی طرح سب ہندو مسلمان بھائیوں کو یہ توفیق عطا کر کہ وہ نہ
صرف خیراتی بلکہ اپنے قومی انتظام میں خود ایک دوسرے کی مدد کرکے اپنے مقاصد کو پہنچیں آمین

(از لندن) (رؤف)

بعد سب نے متفق الرائے ہو کر اپنے میں سے پانچ آدمی منتخب کر کے مرزا صاحب
کو اُن کا صدر بنایا اور ہاشم کے سپرد روپے کا حساب کتاب اور دیگر ضروری کام
کیا۔ برخاست ہونے سے پہلے مرزا صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم سب
متفق ہو کر چوکیدار کو یہ ہدایت دیتے ہیں کہ کسی فقیر۔ فقیرنی یا بھیک مانگنے
والے لڑکا لڑکی کو اس پھاٹک کے اندر نہ گھسنے دے اور اس مجلس کا بڑا جلسہ
ہر سال کے سال ہوا کرے لیکن اگر پنچ چاہیں تو بیچ میں منعقد کر لیں۔ جب
اس تجویز کو بھی سب نے قبول کر لیا تو جلسہ ختم ہوا۔

پانچ برس بعد

ہاشم نے پانچویں سال کی کارروائی اس طرح بیان کی۔ حضرات! ماہ گذشتہ
میں اس تحریک کے بانی اور ہمارے والد مرحوم کے انتقال پر جو اظہار ہمدردی
آپ سب اہل محلہ نے ہم سے کیا ہے اس کا ہم تہ دل سے مشکور ہوں۔ حقیقت
جب تک یہ محلہ قائم ہے انکا نام اس سے وابستہ رہیگا۔ اللہ تعالیٰ انکو غریق
رحمت کرے۔ اب میں سالانہ کارروائی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنی چاہتا
ہوں۔ سال گذشتہ کی کل آمدنی ساٹھ روپے ماہوار کے حساب سے سات
سو بیس روپے ہوتے ہیں۔ معمولی آمدنی میں پندرہ روپے اضافہ ہونے کی
وجہ یہ ہے کہ مجلس قائم ہونے کے ایک ہی سال بعد اس محلے کے ایک طالب علم
نے امداد کی درخواست کی تاکہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے آپ کے پنچوں نے
تحقیقات کے بعد اس شرط پر وظیفہ منظور کیا کہ ختم تعلیم پر اپنی آمدنی
کا ایک حصہ پندرہ فیصدی کے حساب سے پانچ سال تک اس جلسے کو دیا کرے
چنانچہ طالب علم مذکور پار سال رڑکی سے کامیاب ہو کر سو روپیہ ماہوار کا ملازم ہو گیا۔

دیں سیر اور کوڑیوں کو ملا کر کل نقدی تیس روپے چار آنے ہوتے ہیں۔ پچھلے مہینے میں کل فقیر فقیرنیاں مع بچوں کے ستر کے قریب اس محلے میں داخل ہوئے۔ مہینے کے شروعات میں تو بہت آئے مگر جب کسی کو کچھ ہاتھ نہ لگا تو انہوں نے غالباً دوسروں سے جا کر کہدیا کہ اس محلے میں کنجوسوں کی بستی ہے (قہقہہ) کیونکہ آخر تاریخوں میں ان بھیک منگوں کی آمد میں بہت کمی ہوگئی۔ اب جس طرح آپ کی مرضی ہو اس سرمائے کو تقسیم کیا جائے" اس پر کئی آدمی ہم آواز ہوکر بولے کہ ہم سب کام آپ کی مرضی پر چھوڑتے ہیں" مرزا صاحب کہنے لگے کہ "میری مرضی یہ ہے کہ آپ اپنے میں سے چار پانچ آدمی پنچوں کے طور پر مقرر کر دیجئے اور اس کی تقسیم انکے فیصلے پر چھوڑ دیجائے۔ اُنکا فرض یہ ہو کہ پہلے اپنے محلے کے مستحقین کی پوری طرح امداد کریں اور پھر دیگر مساکین کی لیکن ہر حالت میں اُن کا فیصلہ آپ کی رائے کے مطابق ہو۔ دوسری بات یہ کہ اب ہماری خیرات فقیروں کی آمد پر منحصر رہنی نہیں چاہئے۔ بلکہ آپ سب صاحبان اپنی اپنی حیثیت کے موافق ماہواری رقم مقرر کر دیں اور اپنے میں سے ایک شخص مقرر کرکے اس کے پاس جمع کرادیں۔ اور وہ اس کا باقاعدہ حساب رکھے"۔ اس کے ساتھ ہی اپنے بیٹے ہاشم کو کاغذ پنسل دیکر کہا کہ جا کر سب اصحاب کے نام کے آگے جو رقم وہ دینی منظور کریں وہ لکھ لو" پھر حضرات کی طرف مخاطب ہوکر "صاحبو! یہ کسی پر جبر نہیں ہے۔ جتنی جس کی توفیق ہو اور ماہواری نکال سکے اتنا لکھے۔ یہاں وہ معاملہ نہیں ہے کہ ڈپٹی کمشنر کی نظر میں چڑھنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں لکھدی جائیں۔ اس پر سب ہنس پڑے۔ غرض کسی نے ایک آنہ اور کسی نے دو آنے چار آنے ماہوار دینا منظور کیا۔ مرزا صاحب نے خود پانچ روپے لکھے۔ اس طرح کرکے ماہواری چندے کی رقم کل پنتالیس روپے ہوئے۔ اس کے

مرضی کے مطابق چلنے کو تیار ہیں (پھر حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں بھائی میں جھوٹ تو نہیں کہتا"؟ اس پر دو چار آوازیں آئیں نہیں بالکل سچ کہتے ہو۔ اس پر مرزا صاحب بولے کہ "میں آپ سب صاحبوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ آج ہی سے اپنے اپنے گھر میں ہدایت کر دینگے اور اس ماہ کی آخری تاریخ کو میں اپنے آدمی کو بھیجونگا۔ آپ جو کچھ جمع ہو اُسکو عنایت فرماویں اور اسی وقت اُس دن بھی میرے غریب خانے تک قدم رنجہ فرمائیں"۔ اس جلسے کے بعد مہمان رخصت ہوئے اور اُس کے دوسرے دن سے مرزا صاحب نے پھاٹک پر چوکیدار مقرر کر دیا۔ مہینہ بھر کی مدت آنکھ بند کرنے میں گذر گئی۔ اور تیسویں تاریخ عظیم اللہ نے سویرے ہی اُٹھکر ہر گھر کی پونجی لاکر دیوانخانے میں جمع کرنی شروع کر دی۔ شام کو محلے والے بھی ایک ایک کر کے آنے لگے اور جب تقریباً سب جمع ہو گئے تو مرزا صاحب نے آواز بلند کہا کہ سب صاحب اس دالان میں آکر اپنے محلے کی ماہواری خیرات کا ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سوکھے ٹکڑوں کی ڈھیری چنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف آٹے کا انبار لگا ہوا ہے۔ برابر ہی چاولوں کی ایک ڈھیری ہے اور پرلی طرف پیسوں کی ڈھیری کے برابر کوڑیوں کا ڈھیر لگا ہے اور بیچ میں کچھ دوانیاں چونیاں اور روپے پڑے ہیں۔ یہ سماں دیکھکر سب کی باچھیں کھل گئیں اور مرزا صاحب کی تعریف کرنے لگے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے مہینے کی کارروائی بیان کی۔

"حضرات! آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجھ کو یہ عرض کرنا ہے کہ اس محلے میں کل ایک سو پچاس مکان ہیں اور یہ جو کچھ آپ کے سامنے موجود ہے اس میں ہر گھر کا تھوڑا بہت حصہ شامل ہے۔ خالص آٹا تین من دس سیر جمع ہوا ہے۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے ڈیڑھ من۔ چاول اور دال غیرہ

مجکو حیرت ہوئی کہ کل ہی کا ذکر ہے کہ میرے ہاں کی ماما فقیر کو آٹا دینے گئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بیہوشی سی پڑی ہوئی پائی گئی اور تانبے کا کٹورا غائب ہوگیا۔ خیر اس عجیب نوعہ کا تو قصہ بہت طولانی ہے مگر آپ مثال کے طور پر اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ لوگ جنکو آپ فقیر تصور کرتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر بلکہ تقریباً سب چوٹّے اور بدمعاش ہوتے ہیں اور ایسوں کی خیرات سے پرورش کرنی گویا دیدہ و دانستہ چوری اور بدمعاشی کی امداد کرنی ہے۔ لہٰذا کم از کم اپنے محلے کو اس الزام سے بری کرنے کی خاطر میری یہ تجویز ہے کہ اگر آپ اصحاب کی مرضی ہو تو اول تو پھاٹک پر ایک چوکیدار رکھا جائے اور اس مہینے میں اُس کا علاوہ رکھوالی کے یہ کام ہو کہ جو فقیر یا فقیرنی اس محلے میں داخل ہو اسکی بجائے کاغذ پر پنسل سے ایک لکیر کاڑھ لے تاکہ مہینے کے ختم پر فقیروں کی تعداد معلوم ہوسکے اور دوسری بات یہ ہے کہ حاضرین میں سے ہر ایک شخص اپنے گھر میں جاکر ہدایت کردے کہ جو فقیر یا فقیرنی آن کر دروازے پر سوال کرے اور گھر میں سے اُسکو کچھ دینا منظور ہو تو اسکو دینے کی بجائے اُس کے نام کا علیحدہ رکھدیا جائے۔ مثلاً میرے گھر میں سے عموماً فقیروں کو آٹا ملتا ہے تو میں گھر میں جاکر۔ کہدوں کہ ہر فقیر کے نام کا آٹا ایک علیحدہ کول میں ڈال دیا جائے اور مہینے کے اختتام پر میں ایک دفعہ پھر آپ صاحبان کو تکلیف دونگا تاکہ تمام گھروں کی جمع کو آپکی رائے کے مطابق اہلِ غربا و مساکین میں تقسیم کردیا جائے۔ مجھ کو جو کچھ عرض کرنا تھا وہ کردیا۔ اب آپ لوگ اپنی رائے کا اظہار فرماویں۔"

اِس تقریر کا حاضرین پر بہت اثر ہوا اور کئی آدمیوں نے ہم آواز ہوکر کہا کہ "مرزا صاحب ہم کو آپ کی رائے سے پورا اتفاق ہے" اور ایک شخص کھڑا ہوکر کہنے لگا کہ "مرزا صاحب! آپ ہمارے بزرگ ہیں اور میر محلہ ہیں اور ہم سب آپ کی

کھانے سے فارغ ہو گئے تو مرزا صاحب نے مسند پر بیٹھے ہی بیٹھے یوں سلسلۂ تقریر شروع کیا "حضرات! آج جس مقصد کے لئے میں نے آپکو تکلیف دی ہے وہ نہایت اہم ہے اور اگرچہ مجھ میں اتنی لیاقت نہیں کہ اس کے حصول کے لئے احسن تدابیر سوچ سکوں لیکن اپنی قابلیت کے مطابق ایک تجویز میرے خیال میں آئی ہے جو آپ صاحبوں کے سامنے پیش کرونگا۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آجکل مسلمان نہایت پستی کی حالت میں ہیں اور اس کی چند در چند وجوہات ہیں چنانچہ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم کو خیرات دینی نہیں آتی۔ اول تو ایسے لوگ بہت معدودے چند مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں جنکو خیرات کی پوری توفیق ہو اور جو ہیں وہ اِس بے پروائی کے ساتھ دیتے ہیں کہ اُس کا زیادہ تر حصہ اُن لوگوں کے پاس جاتا ہے جو بالکل مستحق نہیں اور اس طرح خیرات کا اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ حضرات! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ جو ایک پیسہ کسی ہٹے کٹے فقیر کو دیتے ہیں اور وہ جا کر اُس پیسے کی افیم یا بھنگ خریدتا ہے وہ بھی خیرات ہے یا وہ جو وہی پیسہ کسی بھوکے اپاہج کے پیٹ میں روٹی ڈالتا ہے یا کسی یتیم لڑکے کی تعلیم میں خرچ ہوتا ہے۔ آپ متفق ہو کر یہی کہیں گے کہ اصل خیرات وہی ہے جس سے بھوکے کا پیٹ بھرے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہم یہ سب کچھ جان بوجھکر دیتے وقت اسکا مطلق خیال نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیروں کی تعداد دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ علاوہ بریں ہماری پردہ نشین عورتیں اگرچہ یہ چاہتی ہیں کہ خیرات مستحق کو پہنچے مگر اُن کے پاس کوئی ذرائع نہیں جس سے سائل کا استحقاق معلوم کر سکیں اس لئے ہر ایک پھیری والے فقیر کو وہ اپنی حیثیت کے موافق کچھ نہ کچھ ضرور دیدیتی ہیں۔ چنانچہ مجھ کو یقین کامل ہے کہ ہمارے اس محلے میں سے کوئی فقیر خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ لیکن اگر ان فقیروں کی کرتوت آپ لوگوں کے آگے بیان کروں تو

بیٹا کچھ دیکھو تو اس کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ اپنے والد کو آنے دو۔ ان سے
تذکرہ کرونگی۔ تیسرے پہر کو مرزا باقر علی بیگ جب کچہری کے کام سے فارغ ہو کر
گھر آئے تو بیوی نے اپنی ماما کی کہانی انکے آگے بیان کی۔ اُنکے دل پر بھی
اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور کہنے لگے کہ تم سچ کہتی ہو کہ ان مستحق بیکس منگتوں کا
کچھ نہ کچھ علاج ہونا چاہیے۔ گو سرکار اس میں مجبور ہے۔ اصل میں ہمارا کام ہے کہ اچھا
خیرات کا انتظام کریں۔ دیکھو میں کوئی تدبیر سوچونگا۔ اس گفتگو کے بعد گھر میں سب
اپنے اپنے دھندوں سے لگ گئے۔ شام کو جب ظہورن گھر جانے لگی تو زینت بیگم
نے اسکو اپنے پاس بلایا اور پانچ روپے اس کے ہاتھ پر رکھکر کہا کہ یہ تمہارے بیٹے
کی دوائی ٹھنڈائی کے لئے ہیں۔ ظہورن نے اپنی بیکسی اور زینت بیگم کی سچی ہمدردی
کا خیال کرکے اُنکو نہایت تامل کے ساتھ منظور کیا۔ مگر چونکہ اس قسم کا یہ پہلا موقع
تھا اس کی پیشانی پر پسینا جھلک آیا۔ دوسرے دن صبح ہی اُٹھکر مرزا باقر علی بیگ
بیوی سے کہنے لگے کہ میرے خیال میں ایک تجویز آئی ہے انشاءاللہ وہ
ضرور کارگر ثابت ہوگی۔ اس کے لئے میں ابھی سے انتظام کرتا ہوں۔ چنانچہ
باہر جاکر اُنہوں نے اپنے ملازم سے کہا علیم اللہ! پہلے تو چاندنی چوک جاکر
حلوے باورچی سے کہو کہ ایک دیگ سالنے کی اور ایک میٹھے کی تیار کرکے
دوا خانے میں پہنچا دے اور اس کے بعد اپنے محلے میں اول گھر سے لیکر
آخر تک کہ آؤ کہ گھر کے مرد آج شام کا کھانا مرزا جی کے ہاں تناول کریں۔ علیم اللہ
نے اپنے آقا کا حکم بجا لانے میں ذرا تاخیر نہ کی۔ چنانچہ مغرب کی اذان سے پہلے پہلے
دونوں دیگیں تیار ہوکر آگئیں اور محلے والے نماز پڑھکر دوا خانے میں پہنچنے
شروع ہوئے۔ اس محلے میں کوئی ڈیڑھ سو گھروں کے قریب تھے اس لئے مہمانوں
کی کل جمعیت ایک سو تیس یا چالیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ جب یہ سب لوگ کھانے

تھا۔ اس کی صورت دیکھکر میرے دل میں دھکا بیٹھ گیا اور میرے ہاتھ سے کرشنا چھٹ گیا۔ اس کے بعد مجھ کو خبر نہیں رہی کہ کیا ہوا" ظہورن کی مصیبتوں کا قصہ رئیسہ بیگم اور نصیرو نہایت غور سے سنتی رہیں اور جب وُہ خاوند کی اور بیٹے کی بیماری کے حال پر پہنچی تو ان دونوں ماں بیٹیوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے اور اپنی ماما کا دل رکھنے کے لئے رئیسہ بیگم کہنے لگیں کہ جتنی میرے مقدور میں ہے اتنی امداد کرنے میں مجھ کو ذرا گریز نہیں۔ مگر ان حرام خور فقیروں کا ضرور کچھ نہ کچھ انسداد ہونا چاہئے۔ دیکھو ہاشم کے والد گھر میں آئیں تو میں ان سے کہونگی کہ کوئی گھنٹہ بھر دوپہرے پہلے ہاشم کتابیں ہاتھ میں لئے گھر میں داخل ہوا اور اپنی بہن نصیرو سے پوچھنے لگا کہ آج ڈیوڑھی میں آٹا سا کیوں بکھرا پڑا ہے۔ نصیرو نے سارا قصہ اسکے آگے دہرایا جسکو سنکر ظہورن پر بہت ترس آیا اور کہنے لگا کہ کہیں وہی فقیر تو نہیں جو صبح کو مدرسے جاتے ہوئے مجھ کو ملا تھا اور میں نے اسکو دھتا بتائی تھی؟ پھر ظہورن کو پاس بلا کر اس نے حلیہ دریافت کیا۔ اس نے اس کی آنکھ ناک کا نقشہ بیان کیا تو ہاشم کو یقین کامل ہو گیا کہ وُہ وہی فقیر تھا اور کہنے لگا کہ تم خاطر جمع رکھو۔ اب کے اگر کہیں بازار میں وُہ مجھکو مل گیا تو فوراً کوتوالی میں لے جاؤنگا" اس پر رئیسہ بیگم بولیں کہ بیٹا اس ایک کے گرفتار ہونے سے کیا ہوگا اس جیسے تو سینکڑوں پڑے پھرتے ہیں۔ سرکار کیوں نہیں انکی بندش کرتی۔ ڈھنڈھورا پٹوا دے۔ کہ کوئی اچھا بھلا آدمی بھیک نہ مانگے" اس پر ہاشم نے کہا "اماں جان! سرکار کی بھی تو ایک مشکل ہے۔ وُہ تو بہتیرا چاہتی ہے کہ ایسی خیرات جس پر بدمعاش اور پاجی پلتے پھولتے ہیں بند کر دے۔ مگر وُہ لوگوں کی جہالت کو کیا کرے۔ اگر آج ہی ایسا حکم صادر ہو تو کل آپ سن لینگی۔ لوگ سرکار پر تہمت لگائینگے کہ خیرات بند کرنا چاہتی ہے۔ بتایئے اس کا کیا علاج؟" رئیسہ بیگم بولیں

دیر گذر گئی اور ماما ڈیوڑھی میں سے واپس نہ پھری تو رئیسہ بیگم نے خفگی کے لہجے میں نصیبو کی ددا کو آواز دیکر کہا کہ اے بی وزیر خانم ذرا ڈیوڑھی میں تو جا کر دیکھو تمہاری ظہورن پر کیا آفت ٹوٹی۔ فقیر کو آٹا دینے گئی تھی وہیں کی وہیں چپکی رہ گئیں۔ وزیر خانم ڈیوڑھی میں جا کر کیا دیکھتی ہیں کہ آٹا زمین پر بکھرا پڑا ہے کٹورے کا کہیں پتہ نہیں اور بی ظہورن زمین پر ایک غشی کے عالم میں پڑی ہیں۔ یہ سماں دیکھکر تو وزیر خانم کے حواس باختہ ہو گئے اور پچھلے پیروں دوڑی دوڑی اندر گئی اور کہنے لگی "اے ہے بیوی غضب ہو گیا۔ آپ چلکر ڈیوڑھی میں دیکھئے"۔ ددا نے کواڑ بند کر کے رئیسہ بیگم خود گئیں اور ماما کا یہ حال دیکھکر ددا سے کہا کہ تم عطار کی دوکان پر جا کر لخلخہ لاؤ اور اس سے کہو کہ مرزا صاحب کے حساب میں لکھے عطار نے پوچھا کہ آج سویرے سویرے مرزا جی کے گھر میں کس کو لخلخے کی ضرورت پڑی۔ ددا نے جو حال تھا وہ بیان کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ آج جب دوکان کھولنے آ رہا تھا تو ایک فقیر مجھ کو ادھر آتا ملا تھا۔ کہیں وہی نہ ہو؟ چونکہ زیادہ گفتگو کا وقت نہ تھا اس لئے وزیر خانم جلدی سے لخلخہ لیکر گھر آئی اور اس کے اثر سے ظہورن کو ذرا ہوش آیا اور وزیر خانم کی مدد سے اٹھکر ڈیوڑھی میں سے اندر آئی۔ جب اس کی طبیعت اچھی طرح سنبھل گئی تو رئیسہ بیگم بولیں کہ "بی ظہورن تم نے تو ہم لوگوں کو ڈرا دیا۔ یہ تو بتاؤ کہ تم پر کیا گذری جو اس طرح غش کھا کر گر پڑیں" اس پر ظہورن نے اول سے لیکر آخر تک اپنی ساری رام کہانی سنا کر کہا کہ "بیوی جس دن سے اس موئے نے میری کنپٹی پر گھونسا مارا جب سے مجھ کو غشی کا مرض ہو گیا ہے اور آج جس فقیر کو آپ کے حکم سے آٹا دینے گئی تھی اس کی شکل ہو بہو اسی فقیر کی سی تھی جو میرے گھر میں گھس آیا

وقت آئیگی۔ جب تک میں اچھا ہوں تم گھر بیٹی رہو اور اصغر کو بھیج کر بازار سے گوٹا
اور ٹوپیاں منگوا لیا کرو۔ خاوند کی مرضی دیکھ کر ظہورن نے وہاں کا بیٹھنے کا خیال
ترک کر دیا لیکن تیسرے چوتھے دن خفقان نے ہو آیا کرتی۔ مگر جب اصغر کو بھی
بخار آنا شروع ہوا تو ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ اگر بیٹے کے پاس بیٹھتی ہے تو
گوٹا رہتا ہے اور رات کو فاقے سے سونا پڑتا ہے اور جو گوٹا کرتی ہے تو ممتا
چین نہیں لینے دیتی۔ دوسرے قرآن کا ایک آنا اصغر کی دوا شفا کی میں صرف
ہونے لگا۔ جب دونوں ماں بیٹیوں پر دو وقت کے فاقے گذرنے لگے
تو ایک دن ظہورن سے بالکل ضبط نہ ہو سکا اور اپنے بیمار اصغر کو چھاتی سے
لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جب خوب دل کا بخار نکال چکی تو قرآن سے
کہا کہ بیٹی تو بھائی کی خبرداری کر۔ میں کسی کی ماماگیری کرونگی یا چکی پیسونگی مگر تم
دونوں کے لئے کہیں نہ کہیں سے روٹی کا ٹکڑا لاؤنگی۔ چنانچہ یہ فیصلہ
کرکے ہمسائی کے ہاں جو وزیر خانم آیا کرتی تھیں۔ اُنکے پاس گئی۔ اُس نے
کہا کہ بوا تم ابھی چلی چلو۔ ایک بڑے اچھے گھرانے میں رکھوا دونگی۔ ڈیڑھ
روپیہ ماہوار اور دونوں وقت کی روٹی۔

تیسرا منظر

مرزا باقر علی بیگ کی بیوی رقیہ بیگم اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے
لگی بیٹھی۔ نئی ماما کی راہ دیکھ رہی تھیں کہ ظہر کو آنے کی جگہ دیر آئے تو سمجھانی
میں پرچے کر بھیجوں۔ خدا جانے بیوا ان کی کس طرح طبیعت ہے۔ کئی روز سے
اُن لوگوں کے ہاں کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ نصیرہ ماں کے برابر ہی
بیٹھی اپنے دھانی دوپٹے میں بیچ کی بُوٹیاں ٹانک رہی تھی۔ جب خانی

اکبر خاں پہلے کے موافق مزے سے چلے آ رہے تھے کہ پیچھے سے کئی آوازیں انکے کانوں میں آئیں "ہٹو! بچو!! گھوڑا نکل گیا ہے!!!" اُنہوں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک بے لگام گھوڑا دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ تو اُس کے راستے میں سے ایک طرف کو ہو گئے مگر سامنے ایک چماری کی لڑکی کھیل رہی تھی اُنہوں نے چیخ کر کہا "اری ہٹ جا! ہٹ جا!!" مگر وہ کچھ ایسی بوکھلا سی گئی کہ اُلٹی گھوڑے کی طرف کو بھاگنے لگی۔ اُن سے نہ رہا گیا اور دوڑ کر اسکو گود میں اُٹھا لیا۔ اتنے میں گھوڑا بھی وہاں تک پہنچ گیا اور ابھی لڑکی گود ہی میں تھی کہ اُس کی ہیبت میں گھٹنوں کے بل زمین پر گرے۔ لڑکی کے تو چوٹ نہ آئی مگر ان کے داہنے گھٹنے میں ایک نوکدار کھپل جیسی کو توڑ کر اندر گھس گئی اور پھر ان سے اُٹھا نہ گیا۔ اُسی وقت دس پندرہ آدمی اِن کے گرد جمع ہو گئے اور ڈولی منگوا کر خانصاحب کو شفاخانے بھجوا دیا۔ اسی تکلیف کی حالت میں انہوں نے ایک شخص سے کہا کہ "خدا کے واسطے آپ جا کر میرے گھر میں خبر کر دیں"۔ چنانچہ اُس بھلے مانس نے پتہ پوچھ یہ خبر وحشت اثر ان کے بیوی بچوں کو جا سُنائی۔ اس پر دونوں ماں بیٹیاں سر جوڑ کر رونے لگیں اور ظہورن نے ایک دفعہ پھر گڑگڑا کر خدا سے دُعا مانگی کہ "اے ربّ العالمین میرا تیرے سوا کوئی والی وارث نہیں تو اپنی رحمت سے انکو شفا عطا کر اور انکی کمائی میں برکت دے! یا اللہ تو بڑا کریم و کارساز ہے مجھ عاجز بندی کے بھی دن پھیر دے"۔ اس کے بعد دوسرے دن صبح ہی اُٹھ کر سر پر برقع ڈال اور اصغر کا ہاتھ پکڑ ہسپتال گئی اور اپنی جوان بیٹی کو ہمسائی کے سپرد کر گئی۔ وہاں پہنچ کر میاں سے کہا کہ "میں تمہاری خدمت کے لئے یہاں پہنچ آئی ہوں" مگر خانصاحب نے سمجھایا کہ یہاں کے لوگ میری اچھی طرح خبرداری کرتے ہیں۔ تم اگر یہاں رہیں تو اپنا خرچ کرنا پڑیگا اور گھر کا سارا اسباب بیچنے پر

بالمعاملہ ملتفت کیا کرتے۔ مگر وہاں کون بیٹھا تھا جو اُس کی مدد کو آتا۔ محلے
کے سارے مرد میلے میں گئے ہوئے تھے۔ یہ واویلا سنکر دو ایک عورتیں گھروں
میں سے نکل کر آئیں اور جتنی اُنکے امکان میں تھی اُتنی تسلی و تشفی کی۔ رات
گئے اکبر خاں قدم شریف سے تبرک لیکر آئے تو گھر میں گھستے ہی بیوی کو کمال
پریشان دیکھا اور جب سارا قصہ سُن چکے تو ایک آہ سرد کھینچی اور کہنے لگے
کہ تمہاری قسمت نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی تباہی کا سامنا
ہوتا ہے۔ خیر ہر حال میں اُسکا شکر ہے کہ اُس نے تمہاری جان تو بچا لی ورنہ
اُس بدمعاش بھیک منگے نے مار ڈالنے میں کیا کسر چھوڑی تھی۔ ہاں!
یہ تو بتاؤ کہ مخزن کے پاؤں میں کے چوڑیاں ہیں۔ یا وُہ سب کی سب پٹاری
میں چھوڑ گئی تھی؟ بیوی بولی "یہی تو غضب ہوا! وُہ تو کہہ رہی تھی کہ اماں میں بھی
چوڑیاں پاؤں میں ڈالے جاتی ہوں مگر مجھ مُردار نے کہا کہ بیٹی چوڑیاں پہن کر کیا
کرے گی۔ فقط بالیاں کان میں ڈال لے" اِس پر خانصاحب بولے کہ "اچھا بس
صبر کرو۔ خدا کو جو منظور تھا وُہ ہوا۔ اب واویلا مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔
اگر کوتوالی تک بات پہنچی تو اور لینے کے دینے پڑ جائینگے"۔ اِس حادثے
کے دوسرے دن مخزن کو خبر معلوم ہوئی اور اُس نے روتے روتے اپنی آنکھیں
سُجا لیں کیونکہ وُہ خوب جانتی تھی کہ اب ساری عمر میں ویسی چوڑیاں نصیب ہونگی
اور اُسی وقت خالہ کے گھر سے اپنے ہاں آگئی تاکہ اُن کا غم بھلائے۔ کاش
کہ اکبر خاں کی مصیبتوں کا یہیں خاتمہ ہوتا مگر نہیں: فلک کو ستم رسیدوں پر
ظلم کرنے کا کچھ ایسا چسکا پڑا ہوا ہے کہ زخمی دلوں پر شمشیر کر نشتر زنی کرتا ہے۔
اس واقعہ کا غم و الم ان گرفتاران بلا کے دل پر سے ابھی پورے طور پر محو نہ ہونے
پایا تھا کہ ایک اور جگر کا لگا جس نے رہی سہی آس بھی توڑ دی۔ ایک دن شام کو

بیٹھے بیٹھے اِس کے دِل میں خود بخود خیال آیا کہ مَیں گھر میں اکیلی ہوں اور دونوں
طرف کے مکان خالی پڑے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چور چکار آنکر گھر کا سارا
صفایا کر جائے۔ مَیں تو چیخوں گی بھی تو کوئی آواز نہ سُنیگا مگر پھر اپنے تئیں خود
ہی بیوقوف ٹھہرانے لگی کہ "بھلا اگر چور کو چوری ہی کرنی ہے تو کسی ایسے گھر جائیگا۔
جہاں سے کچھ مال ہاتھ آئے۔ ہم جیسے غریبوں کو ستا کر کیا لیگا اور یہ سوچ کر
چپکی بیٹھی روٹی ڈالے گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک فقیر نے آن کر صدا لگائی اور اپنے
ساتھ کی لڑکی کو مٹی کا پیالہ دیکر اندر بھیجا۔ ڈیوڑھی پر ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا ہُوا
تھا جس میں کئی جگہ بڑے بڑے چھید تھے لڑکی تو اندر بھیک لینے گئی اور
فقیر نے پردے کے پیچھے سے چھیدوں میں جھانکنا شروع کیا۔ انگنائی میں
ایک بان کی چارپائی بچھی ہوئی تھی اور دوسری کھڑی تھی اور دالان میں گوٹے
کے کارخانے کے برابر ایک چھوٹی سی پٹاری رکھی تھی جس پر نئی قلعی ہُوئی تھی
اس کو دیکھکر فقیر کا دِل للچا گیا اور جب لڑکی پیالے میں آدھی چپاتی لیکر باہر
آئی تو اُس سے پُوچھا کہ "اری اندر کوئی مرد بھی ہے یا نہیں؟" اُس نے جواب دیا
"نہیں بس ایک عورت بیٹھی ہے"۔ اس پر فقیر نے اُسکو تو وہیں چھوڑا اور خود پردہ
اُٹھا کر دڑانہ دالان میں گھُسا چلا گیا۔ ظہورن کی جو ایک دفعہ ہی اس موسنڈے
مشٹنڈے فقیر پر نظر پڑی تو اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا "ارے تو کون؟"
اور تو اچھوڑا انگنائی میں آئی اس پر فقیر نے جھپٹ کر اس کی کنپٹی پر اس زور سے
ایک مُکا مارا کہ یہ چکر کھا کر آدھی زمین پر اور آدھی چارپائی پر گری اور فقیر پٹاری
جھولی میں ڈال وہاں سے چلتا بنا۔ کوئی پَون گھنٹہ کے بعد ظہورن کو ہوش آیا۔
تو کیا دیکھتی ہے کہ پٹاری غائب۔ اس پر اُس نے اپنا سر پیٹ لیا کہ "ہائے
میری بچی کے پاؤں کی چوڑیاں اس میں رکھی تھیں۔ ارے لوگو کوئی تو اس فقیر کو

دُوسرے کارخانے میں جانے سے آنے ڈیڑھ آنے کے فائدے کا خیال اس لئے
لاچار اُنہوں نے اصغر کو بنّی کے کام پر بٹھا دیا اور وہ کارخانے سے دن بھر
میں ایک آنہ روز لانے لگا مگر جب اس طرح بھی گھر کا گزارہ چلتا معلوم نہ ہوا تو بیوی نے
گوٹا بُننا شروع کر دیا اور خانصاحب بیوی کے لئے بازار سے ٹوپیاں کاڑھنے کو
لا دیتے جب جا کر اُنکے گھر میں شام کو آٹھ آنے کی صورت نظر آتی - وہ یوں
کہ پانچ آنے تو خانصاحب خود مزدوری کر کے لاتے - بیوی دو دن میں ایک گوٹا کے
اٹھاتی جس کی مزدوری دو آنے ہوتے ہیں اور اصغر کے اُستاد فقط ایک آنہ روز
دیتے تھے اور جو اُن سے کہا کہ پیسے کر دو تو بولے کہ کوئی اور کارخانہ دار
ایک آنہ بھی نہیں دیگا - رہی مخزن وہ بیچاری دن بھر میں مار مار کر کے دو کوڑی
ٹوپیاں کاڑھتی جب ٹکے کوڑی کے حساب سے ایک آنہ شام کو آتا - خانصاحب
کو اس نفسا نفسی کے زمانے میں آنی ہی آمد غنیمت معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ جانتے
تھے کہ اور کاریگر بیچاروں پر دو دو وقت کے فاقے گزرتے ہیں اور وہ منہ
سے بھاپ تک نہیں نکالتے - دوسرے اب تک خدا نے انکو کسی کا قرضدار
نہیں کیا تھا اور فراخی کے زمانے میں بیوی نے جمع کر کے جو مخزن کے لئے
چاندی کا گہنا بنوا لیا تھا - اُس پر انکا بہت سہارا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی ایسا
ویسا وقت آن پڑا تو فاقے نہ مریں گے مگر یہ خبر نہ تھی کہ ابھی تو فقط مصیبتوں کا
آغاز تھا - اس مکان میں آئے ہوئے انکو ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا
تھا کہ ایک روز شام کو جھٹپٹے کے وقت ظہورن اپنے حجرے سے باورچی خانے
میں بیٹھی - توے پر روٹی ڈال رہی تھی - مخزن بیبیوں کے کہنے اپنی خالہ کے
ہاں مہمان گئی ہوئی تھی اور خانصاحب بارہ وفاتوں کا پنکھا دکھلانے اصغر کو
قدم شریف لے گئے تھے - اس لئے ظہورن گھر میں بالکل اکیلی تھی - پیشتر سے پر

دیکر اصغر سے کہا کہ "چلو بیٹا اب ذرا محلی والوں کی طرف چلیں" وہاں جا کر جب خوب اچھی طرح کئی گلیوں میں چھان بین کر چکے تو ایک مکان اُنکی پسند آیا اور اُنہوں نے دو روپیہ ماہوار پر مکان دار سے فیصلہ بھی کر لیا۔ اس گھر میں کوئی مشکل سے تین چار پائیوں کی سمائی ہوگی اور فقط ایک دالان دو کوٹھریاں اور ہاورچیخانہ تھا جس کی وسعت ایک کوٹھی کے برابر تھی۔ وہاں سے جب واپس گھر آئے تو بیوی سے کہنے لگے کہ "میں نے مکان لے لیا ہے۔ اب کوئی مبارک دن دیکھکر وہاں چلے چلینگے" بیوی نے کہا کہ "اگلی جمعرات ہی کو کیوں نہ چلے چلو۔ دن بھی اچھا ہے اور یہ مہینا بھی پورا ہو جائیگا"۔ قصہ مختصر خانصاحب مقررہ تاریخ کو اپنے قدیم گھر کو جہاں اُنکی جوانی کا بہت سا حصہ گذرا تھا۔ خیرباد کر اور اپنے بال بچوں کو ساتھ لے دُوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ چلتے وقت فخرن نے ایک آخری حسرت بھری نظر اپنی بیری پر ڈالی مگر آنسوؤں کو ضبط کر کے فوراً ماں کے ساتھ ڈولی میں سوار ہو گئی۔ اکبر خاں نے بدلنے کو مکان تو بدل دیا مگر تقدیر کا لکھا نہ بدل سکے۔ اُنکا ستارہ کچھ ایسی گردش میں آیا ہوا تھا کہ جو سوچتے تھے وہ اُلٹی پڑتی تھی۔ مکان یوں بدلا کہ کرایہ میں دو روپے کی بچت ہوگی۔ اس آمدنی کے ناک کان ڈھکنے میں مدد دیگی۔ مگر بازار میں ایسا مندا ہونا شروع ہوا کہ اُلٹی کی مزدوری کی بجائے مشکل سے چھ آنے اور پانچ آنے کما کر گھر لاتے تھے اور اس آمدنی کے برتنے پر لڑکی کے لئے کوئی چیز بنانی تو کجا روٹی کپڑے کا گزارہ چلنا محال تھا۔ دونوں بچوں کا خرچ ماشاءاللہ دو آدمیوں کا تھا۔ بی فخرن خالی کے چاند سولھویں برس میں لگ چکی تھیں۔ میاں اصغر خدا کے فضل سے آٹھویں برس میں تھے۔ باپ کی خواہش تو یہ تھی کہ میں اپنے لڑکے کو مدرسے میں بٹھاؤں کیونکہ آجکل کسی کام میں کچھ نہیں دھرا۔ مگر اتنی بساط کہاں کہ مدرسے کی فیس ادا کریں

تھے انہوں نے ایک دفعہ ہی اللہ ہو کا نعرہ لگا کر سنگ مرمر کے فرش پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنا شروع کیا تو خوف کے مارے اسکی چیخ نکل گئی۔ اس پر خانصاحب جھٹ بھاڑ میں اسکو نکال کر باہر لائے اور اس طرح سمجھانے لگے کہ "بیٹا اس طرح نہیں ڈرا کرتے۔ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ان پر اللہ میاں نے چودہ طبق روشن کر رکھے ہیں۔ جب یہ خدا کا نور دیکھتے ہیں تو اسکی تاب نہیں لا سکتے اور انکا حال غیر ہو جاتا ہے" اس پر اصغر نے اپنے بچپن کی سادگی کے لہجے میں پوچھا کہ "ابا کیا اللہ میاں کے نور سے ان کے سر میں دکھ ہوتا ہے"؟ اسی اثنا میں چار پانچ اور آدمی وہاں آن کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک بولا بڑے صاحب بچے فقیروں کی رمز کیا جانیں۔ انکو اس عمر میں ایسی باتیں سکھانی نہیں چاہئیں۔ اس پر ایک اَور صاحب بولے "دیکھئے نا لڑکے کے دل میں سہم بیٹھ گیا" اکبر خاں اس پر کچھ خفیف سے ہو گئے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر وہاں سے دروازے کی طرف بڑھے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اکثر قلفی کی برف والے اپنا اپنا ہنڈا لیکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک اکبر خاں کو جانتا تھا اور جب انکو اپنے بیٹے کی انگلی پکڑے سیڑھیوں پر سے اُترتا دیکھا تو آواز دی "اجی خانصاحب خانصاحب"!! اکبر خاں نے مڑ کر دیکھا تو برف والے کو پہچان کر اس کے پاس گئے اور کہنے لگے "کہو بھئی مولا بخش اچھے تو ہو"؟ وہ بولا "خانصاحب آپکی عنایت ہے۔ آج میں نے آٹھ دس قلفیاں کھرچن کی جمائی تھیں۔ اُن میں سے دو رکھی ہیں۔ آپ کھرچن کے شوقین ہیں اس لئے میں نے آواز دے لی کہئے تو نکالوں" اس پر خانصاحب خود بھی وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور اصغر کو بھی اپنے پاس بٹھا اُس کے ہاتھ میں اپنا رومال دیدیا کہ برف کی قلفی کو آسانی سے پکڑ سکے۔ جب دونوں باپ بیٹے اپنی اپنی قلفیاں ختم کر چکے تو خانصاحب نے دوانی برف والے کو

رکھا تھا اور وہ راہ دیکھ رہا تھا کہ کب ابا آئیں اور کب اُنکے ساتھ میں جامع مسجد جاؤں
لے چلتے وقت خانصاحب نے کہا کہ "بیٹا اصغر تم کو اس شرط پر لے چلتا ہوں
کہ نماز پڑھکر میرے ساتھ مچھلی والوں تک چلنا ہوگا تھک نہ جانا اس پر وہ
بولا "نہیں ابا میں نہیں تھکنے کا"۔ غرض کوئی پونے بارہ بجے کے قریب یہ دونوں
باپ بیٹے اپنے گھر سے جامع مسجد کی طرف سدھارے اور راستے میں خانصاحب
کو جو کچھ خیال آیا تو انہوں نے ایک یکہ والے کو ٹھہرا کر پوچھا جمعہ مسجد تک ڈیڑھ
سواری کا کیا لیگا۔ اُس نے کہا میاںجی دو آنے کے پیسے دیدینا اس پر
خانصاحب بولے "چھ پیسے دونگا چلنا ہے تو موڑ لے" غرض یکہ والا چھ
ہی پیسوں پر راضی ہوگیا اور یہ دونوں اُس میں بیٹھ تھوڑی دیر بعد جامع مسجد
جا اُترے۔ نماز میں ابھی آدھ گھنٹے کی دیر تھی۔ اُنہوں نے حوض پر جاکر خود
وضو کیا اور لڑکے کو کرایا۔ پھر باہر کے دالان میں ایک صف میں جاکر بیٹھ گئے
اور سنتیں پڑھنے کے بعد جیب میں سے تسبیح نکال کر درود شریف پڑھنے لگے
جب نماز وغیرہ سے فارغ ہوئے اور خطبہ بھی سن سنا چکے تو اصغر کی انگلی پکڑ
کر کہنے لگے کہ "چلو بیٹا تم کو مولانا ہدایت رسول کی زیارت کرالاؤں۔ وُہ بڑے
پہنچے ہوئے درویش ہیں" اور اُسکو دالان کے کونے کی طرف لے گئے
جہاں بہت سے آدمیوں کا مجمع تھا اور بیچ میں ایک سن رسیدہ بزرگ آنکھیں
نیچی کئے یادِ خدا میں مشغول تھے اور اُنکے گرد حلقہ باندھے اُن کے مرید دوزانو
بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض کے منہ پر چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ بعض عالم بیخودی میں
جھوم رہے تھے اور اللہ ہو کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ اصغر چپکا کھڑا
ان رازدارانِ حقیقت کی ظاہری کیفیت اس تعجب و حیرت کی نگاہ سے دیکھتا
رہا جو کمسنی کا اقتضا ہے۔ مگر جب اس کے برابر ہی جو مرید صاحب بیٹھے ہوئے

کوئی اپنا پرایا سنیگا تو کیا کہیگا ؟ لوگ تو ایک ذرا سی بات کا جھگڑا بنا دیتے ہیں۔ کل ہی اللہ دی کی ماں کہہ رہی تھیں کہ اس پیڑ پر تو جن رہتا معلوم ہوتا ہے اگر وہ تجھ کو روتا دیکھ لیتا تو سچ مچ اُنکے ہاتھ ایک بات لگ جائے اور سارے محلے میں کہتی پھریں کہ اکبر خاں کی بیٹی کے سر پر تو سید صاحب کا عمل ہے۔ بیری کی جڑ میں بیٹھکر رویا کرتی ہے۔ اس لئے بیٹی تم اپنے دل کو ذرا سنبھالو۔ مجھے تمہارا بیری کے واسطے رونا اچھا نہیں معلوم ہوتا لوگ سچ کہتے ہیں کہ گھر میں بیری کا پیڑ ہونا نحوست کی نشانی ہے۔ جب سے یہ اُگا ہے سوائے تباہی کے کوئی آرام کی شکل ہی نظر نہ آئی۔ اُنکے کام کا مندا ہوا سو الگ اور گھر سے ہر چیز کی برکت اُڑی سمجھو"۔ مخزن النسا بیچاری سے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ اپنی آنکھیں پونچھ آنسوؤں سے اُن دالان میں آگئی اور اپنا دھیان بٹانے کی خاطر بھالی کاکتر لے کر بیٹھی۔ شام کو جب اکبر خاں گھر آئے تو بیٹی کو خلاف معمول فسردہ پاکر بیوی سے پوچھنے لگے کہ آج مخزن چپ چپ کیوں ہے ؟ اس پر بیوی نے سارا حال کہہ سنایا۔ بیٹی کے رنج کا قصہ سنکر اُنکو بھی بہت صدمہ ہوا۔ مگر اُسکی تشفی کرنیکے لئے کہنے لگے کہ "بیٹی اللہ کے کارخانے میں کس کو دخل ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے کرتا ہے۔ کیا خبر ہے کہ اس مکان سے اُٹھنے میں اُسکی کوئی مصلحت ہو اور آئندہ کے لئے ہمارے حق میں کوئی بہتری کی صورت نظر آئے"۔ باپ کے مُنہ سے یہ تسلی آمیز کلمے سنکر مخزن کے دل کو بھی تقویت ہوئی معلوم ہوئی اور اُسنے اپنے دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ آئندہ جو کچھ پڑے گی اُس کو صبر شکر کے ساتھ جھیلوں گی۔ یہ دن تو یوں گذر گیا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ اکبر خاں نے یہ سوچا کہ آج کارخانے تو جانا نہیں۔ چلو مکان ہی تلاش کریں۔ اس لئے سویرے سے حجام کی دوکان پر گئے اور خط بنوا کر حمام میں غسل کیا۔ گھر واپس آتے کیا دیکھتے ہیں کہ میاں اصغر کو ماں نے نہلا دھلا کر پہلے ہی سے اُجلا انگرکھا پہنا

اِس مکان کے چار روپے کرایہ دوں - مکاندار کے پاس گئے تھے اور اُس سے ساری حقیقت کہی کہ اس اس طرح کا معاملہ ہے : لالہ ولایت سے کام بنوا کر منگواتا ہے - بزار میں تار کی مانگ نہیں اِس لئے جب تک یہ مندا ہے تم کرایہ کچھ ہلکا کر دو - دیکھو ہم اِتنی مدت سے اس میں رہتے چلے آئے ہیں اور تمہارا کرایہ ہر مہینے کی اوّل تاریخ کو پہنچتا رہا ہے - اس لئے تم کو کچھ نہ کچھ تو رعایت کرنی ضرور چاہئے اس پر وہ بولا کہ خانصاحب ! یہ بھی آپ کی خاطر ہے کہ میں چار روپے پر چپکا ہوں اور جب سے ہوس ٹکس لگا ہے اپنی گرہ سے دے رہا ہوں - یہی سوچکر کہ آپ بھلے مانس ہیں کرایہ تاریخ پر پہنچا دیتے ہیں - دُوسرے اِتنی مدت سے رہتے چلے آئے ہیں - ورنہ آج اگر آپ اُٹھیں تو کل ہی یہ مکان چھ روپے ماہوار کو جاتا ہے - خانصاحب مجھ میں اِتنا دام نہیں کہ اپنی گرہ سے خرچ کئے جاؤں - سو بیٹی ! تمہارے باپ یہ جواب سُنکر چپکے چلے آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ میں اور سستے سے مکان کی تلاش میں ہوں - تم مخزن سے نہ کہنا - کہ میں نے تم سے اِسلئے کہدیا کہ بیٹی تم کو اوّل خبر ہوئی آخر خبر ہوئی پھر چپکے رہنے سے کیا فائدہ - یہ ضرور ہے کہ بیری چھٹنے کا تم کو رنج ہوگا مگر اللہ رکھے تم خود ہوشیار ہو سب باتیں جانتی ہو تم کو چاہئے کہ دل پر اس کا خیال نہ لاؤ مخزن اوّل تو چپکی بیٹھی اپنی ماں کی نصیحت سُنا کی - مگر جب بیری کے چھٹنے کا ذکر آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے - اُسوقت تو کچھ نہ بولی لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنی بیری کے پاس جاکر بے اختیار رونے لگی - اگرچہ بہتیرا ضبط کرنا چاہا مگر اُس کے دل پر کچھ ایسا صدمہ بیٹھا تھا کہ آنسوؤں کا دریا اُمڈا چلا آرہا تھا - یہانتک کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی اس پر ماں نے غصہ ہو کر سمجھایا کہ بیٹی تیری عقل تو نہیں جاتی رہی ; کوئی بھی ایک ذرا سے درخت کے لئے اس طرح آنسو بہایا کرتا ہے

رہتے تھے سو اب یہ سوچ کر کہ ہماری حیثیت اس مکان میں رہنے کے قابل نہیں رہی
اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جتنے جلدی ہو سکیگا اسکو چھوڑ کر کسی اور سستے کرائے
کے گھر میں جا کر رہینگے۔ مگر انہوں نے اس کا اظہار بیٹی کے آگے کرنا مناسب نہیں
جانا کیونکہ مخزن اسی گھر میں پیدا ہوئی پلی بڑھی۔ اب جو اس کے سامنے اُٹھنے
کا نام لیا جائیگا تو اُس کے دل کو بے حد رنج پہنچیگا۔ دُوسرے اس کو اوّل
ہی سے درختوں اور کیاری کا شوق تھا اور کوئی تین برس کا ذکر ہے کہ ایک
بیر کی گٹھلی انگنائی میں بو دی تھی جس کا اب ایک خاصہ بڑا درخت ہو گیا تھا اور
روز صبح اُٹھکر اپنی بیری کی جڑ میں پانی دیا کرتی تھی کہ جلدی جلدی بڑھے اگر
کوئی یہ کہتا کہ بیری کے لئے فلاں چیز اچھی ہے تو اپنا پیسہ پیسہ جوڑ کے اپنے بھائی
کے ہاتھ وہی چیز منگواتی اور اس کی جڑ میں ڈال دیتی۔ کئی دن کا ذکر ہے کہ
کسی نے بتایا اگر بکرے کا خون بیری کی جڑ میں ڈالا جائے تو بہت جلدی پھل
آتا ہے۔ مخزن نے اسی دن اپنے بھائی اصغر کو قصائی کی دکان پر دو پیسے
دیکر کہلا بھیجا کہ کھیلنے سے دُوسرے روز ایک آبخورے میں بکرے کا خون لیتا
آئے۔ غرض اسی طرح اللہ آمین کر کے اس نے تین برس میں اس ننھے سے پودے
کو اتنا بڑا کیا تھا اور اب اس دُنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف لڑکی کے دل
کو یہ خوشی لگی ہوئی تھی کہ میری بیری اگلے برس پھل لائیگی۔ اسی لئے باپ نے
اپنی بیوی کے کان میں تو یہ بات ڈالدی کہ ہم کو بہت جلد یہاں سے اُٹھنا
پڑیگا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ ابھی مخزن کو اس کا حال نہ معلوم ہو ورنہ اسکو
سخت صدمہ پہنچیگا۔ لیکن باوجود اس کے ماں نے دوسرے روز مخزن کو پاس
بلا کر یوں تمہید اُٹھائی کہ بیٹی! تمہارے باپ کے کام کا تو مندا ہو اور کہیں اور
جگہ سے آمدنی کی صورت نہیں۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میرے پاس اتنا نہیں کہ

آج میرے پاس اتنا کام نہیں آیا جو سب کاریگروں کو بانٹتا مگر میں نے تمہارے لئے کچھ تار رہنے دیا ہے۔ ہمارے لالہ جی کہتے ہیں کہ اب ہم تیلا مال ولایت سے منگایا کرینگے اور خانصاحب تم جانتے ہو کہ آجکل بازار میں پہلے ہی مندا ہو رہا ہے۔ دوسرے لالہ کے سر میں ولایت کا سودا سما گیا ہے۔ سو مزدوری بھی دھیلی میں پاؤ لے کی رہ جائیگی۔ یہ سُنکر اکبر خاں کے دل پر اگرچہ ایک صدمہ پہنچا مگر اُنہوں نے زبان سے ایک حرف نہ نکالا اور خاموشی کے ساتھ جو تار اُنکے حصے کا رکھا ہوا تھا اُسکو جنتری میں سے نکالنے لگے اور تیسرے پہر تک ختم کرکے کارخاندار کے حوالے کیا اُس نے مزدوری کے آٹھ آنے کے پیسے اُنکے ہاتھ پر رکھدیئے۔ خانصاحب نے انہیں کو غنیمت جانا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ آج جو سویرے سے گھر آئے تو بیوی نے سبب پوچھا اور اُنہوں نے ساری حقیقت سُنائی وہ بیچاری بھی افسردہ ہوگئی مگر خاوند کا دل رکھنے کیلئے کہنے لگی کہ "یہ بھی کوئی دنوں کی بات ہے۔ جب چلتی ہو جائیگی تو پھر وہی مزدوری ملنے لگیگی" اور اُسی دن رات کو عشا کی نماز کے بعد خُدا کے آگے ماتھا رگڑ رگڑ کر دعا مانگی کہ "یا الٰہی اپنے حبیب کے صدقے سے میرے بچوں پر رحم کر اور اِن کے باپ کے کام میں برکت دے" مگر دوسرے دن بھی خانصاحب کو سوائے اٹھنی کے کام کے اور زیادہ نہ ملا۔ کچھ عرصے تک تو اُنہوں نے اسی اُمید پر گذاری کہ اگر گرمیوں میں نہیں تو جاڑے میں شاید چلتی ہو جائے اور کچھ بہتری کی صورت دکھائی دے مگر جب جاڑا بھی گذر گیا اور اُنکی مزدوری میں بجائے اضافے کے اور کمی ہوتی نظر آنے لگی تو ازحد تشویش دامنگیر ہوئی اتنے تک تو خیر جس طرح گذارہ ہو سکا اس طرح کر دیا مگر آگے کو بالکل ناممکن ہو گیا۔ اِس لئے اخراجات کے کم کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اول تو گھر کے اخراجات ہی کونسے ایسے شاہانہ تھے۔ ایک فقط مکان کا کرایہ سمجھو کہ تارکش ہو کر چار روپے ماہوار کے گھر میں

خیال ہرگز دل سے نہ بھلایا اور ہمیشہ گھر کا خرچ کفایت شعاری سے اٹھاتی رہی۔ جب موقع
ہوتا وقت بے وقت کے لئے روپیہ پیسہ الگ ڈال رکھتی تاکہ ضرورت ہو تو کسی کے آگے
ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ دو چار ہی برس کے اندر اس سلیقہ اور عقلمندی کا یہ نتیجہ نکلا
کہ گھر میں اس کے پاس تیس روپے کی جمع ہو گئی چنانچہ ایک دن خاوند سے کہنے لگی کہ
تھوڑے دنوں میں لڑکی جوان ہو جائیگی۔ میں نے اس کے جہیز کے لئے اوّل ہی
سے پیسہ پیسہ کر کے جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اب میرے پاس تیس روپے ہو گئے ہیں تم
انکی کچھ تو چاندی کی چوڑیاں اور کچھ بالیاں بنوا دو کہ بچی کے پاس کچھ نہ کچھ تو ہو جائے۔"
اکبر خاں نے اپنی بیوی کے کہنے کے موافق بیٹی کے لئے چاندی کی دو چار چیزیں
بنوا دیں اور اسی طرح ایک ایک کر کے تانبے کے برتن بھی خرید لئے۔ جہیز کے جوڑوں
پر ظہورن نے پیسہ یہ سوچکر خرچ نہ کیا کہ میرے جو دو چار جوڑے رکھے ہیں وہی لڑکی
کے کام آئینگے۔ مختصر یہ کہ اس طرح محنت اور دُور اندیشی کے ساتھ ان دونوں میاں
بیوی نے مل کر اپنی خانگی حالت کو حیثیت کے مطابق ایک اعلیٰ پیمانہ پر کر لیا تھا۔ مگر یہ
اُس زمانے کا ذکر ہے جب انکے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ آئندہ ہر چیز کلوں کے
ذریعہ سے بننے لگیگی۔ اس اثنا میں جو اس بیچارے گھرانے پر آفتیں ٹوٹیں اور
مصیبتیں نازل ہوئیں اُن کا بیان کرنا مشکل ہے مگر آفرین اس بیوی پر کہ باوجود زمانہ کی
ناسازگاری اور لکھے کی بدنصیبی کے اس مصیبت زدہ بیوی نے خاوند کی تابعداری اور
محبت میں فرق نہ آنے دیا اور ہر حالت میں قناعت کے ساتھ گذار دی۔ انکی گردش
کا آغاز یوں ہوا کہ ایک دن صبح ہی صبح اکبر خاں نماز وغیرہ سے فارغ ہو اپنے
معمول کے موافق کارخانے گئے وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ سوائے پانچ چھ کاریگروں
کے اور سب کے ٹھئے خالی پڑے ہیں۔ انکو یہ خلاف دستور بات دیکھ کر بہت
تعجب ہوا۔ مگر کارخانہ دار نے بہت جلد یہ کہہ کر ان کا تردد رفع کر دیا کہ خانصاحب!

رہنے کے بعد غش کھا کر دھڑ سے گر پڑی۔ شاہ صاحب بھی ماما کو دیکھکر کچھ اوسان خطا
سے ہو گئے تھے اِس لئے اُنہوں نے آٹے کو تو زمین پر بکھرا ہوا چھوڑا مگر جلدی سے تانبے
کا کٹورا اپنی جھولی میں ڈال وہاں سے چمپت ہُوئے۔

دُوسرا منظر

جب سے ہندوستان میں کلوں کی بنی ہوئی چیزیں آنی شروع ہُوئی ہیں ہر ایک
پیشہ والے کو ایک تو ابی کا سامنا ہے۔ زری گوٹے کا کام کچھ کچھ بچا ہُوا تھا مگر اب
اُسکے متعلق بھی ہر ایک چیز ولایت سے بنی بنائی آتی ہے۔ کندلہ کشوں کا الگ دِوالہ
نکلا ہُوا ہے۔ دیکھئے جنکی معاش فقط تار دبکنے پر منحصر تھی اُنکو روٹیوں کے لالے پڑ گئے
بیچارے تارکش ہیں کہ اُنکی مزدوریاں آدھی سے بھی کم رہ گئی ہیں۔ اکبر خاں کو دیکھو!
دس بارہ برس ہُوئے کہ تارکشی کرکے ہنستے کھیلتے دن بھر میں روپیہ کی مزدوری کر لیتے
تھے اور اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ نہایت بے فکری سے اوقات بسر کی
کرتے تھے۔ اس زمانے میں اپنی حیثیت کے موافق کپڑا بھی اُجلا پہنتے تھے۔
مکان بھی خاصا فراخ تھا اُس پر خوبی یہ کہ کسی کے ایک کوڑی کے قرضدار نہ تھے۔
ہر ایک سے ہاتھ ملا کر بات کرتے تھے اور جہاں تک اُنکے مقدور میں تھا اپنے
یار دوستوں کے ساتھ روپے پیسے سے سلوک کرنے میں بھی دریغ نہ کرتے تھے۔
خدا کے فضل سے بیوی بھی نیک ملی تھی۔ اگرچہ غریبوں کی بیٹی تھی اور سوائے قرآن شریف
کی دو چار سورتیں پڑھنے کے اور کسی قسم کی تعلیم سے آشنا نہ تھی۔ مگر سگھڑاپا اُسکی
طبیعت میں اوّل ہی سے موجود تھا۔ دُوسرے اپنے گھر کی تنگی دیکھے ہُوئے تھی
اور اب جو خوش قسمتی سے چاہنے والا اور بیشتا خوش حال خاوند ملا تھا تو گویا اسکے
لئے دُنیا کی ساری نعمتیں مہیا تھیں لیکن اِس نیک بیوی نے عاقبت اندیشی کا

بڑبڑاتے ہوئے اُس سے اگلے مکان پر جا کر سوال کیا تو اندر سے ایک مردانی
آواز آئی کہ آگے بڑھو! یہاں کچھ نہیں دھرا۔ اِس پر اور بھی جز بز ہوئے اور
تیسرے گھر کی ڈیوڑھی پر صدا لگائی تو اوّل تو کچھ جواب نہ آیا۔ دوسری صدا پر کسی نے
زنانی آواز میں کہا کہ شاہ جی! اِسوقت برکت ہے۔ اِس پر تو شاہ جی کو یقین کامل
ہوگیا کہ آج اوّل ہی اوّل جو اُس ترکی ٹوپی والے سے سوال کر بیٹھا تھا۔ اِس لئے
سارا دن منحوس جائیگا۔ اور دل ہی دل میں اُس طالب علم پر خرافات بکنے لگے۔ مگر
جب گلی کا یہ رُخ چھوڑ کر دوسری طرف سوال کیا تو کسی بیوی نے ڈیوڑھی کے
پردے میں سے ہاتھ باہر نکال کر دو باسی چپاتیاں جس میں سات کی کچی ہُولی چنے
کی دال رکھی تھی کچکول میں رکھدیں۔ اب فقیر صاحب کے دل کو ذرا سہارا ہوا اور وہ
صدا لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اِس طرح کہیں سے چاول اور کہیں سے روٹیوں
کا خاصا ڈھیر اُن کی جھولی میں ہوگیا۔ جب تقریباً سب گھروں پر سوال کر چکے تو سب
سے آخر کی ڈیوڑھی پر جا کر کھڑے ہوئے۔ چونکہ ساری گلی میں یہی ایک سب سے
بڑا مکان تھا۔ اِس لئے اُنکو یہ امید بندھی کہ یہاں سے کچھ نقدی ہاتھ لگیگی لہذا
شاہ صاحب نے کھنکار کر نہایت موثر الفاظ میں صدا لگائی کہ قلندر شاہ کا اِس
گلی میں آج پہلا پھیرا ہے۔ اللہ کو کچھ بہتری منظور ہے۔ بھجوا دے اِس وقت
(وقت) جو حاضر ہے۔ اِلّا اللہ! سخی کی کمائی میں فقیر کا بھی ساجھا ہے۔ بھیج!
بھیج بھیج!!! اِلّا اللہ! تھوڑی دیر تک تو کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ مگر اس کے بعد
ایک عورت جس کے چہرے سے پایا جاتا تھا کہ ابھی پوری طرح ماما گیری کی عادی
نہیں ہوئی ہے۔ کٹورے میں آٹا لئے فقیر کے دینے کو باہر ڈیوڑھی میں آئی لیکن
اِس سے پہلے کہ وہ کچکول میں آٹا ڈالے فقیر کی اور ماما کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آٹے
کا کٹورا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا اور خود بھی ایک لمحہ ساکت کھڑے

ٹہل پہل کریگا" تو اس نے جواب دیا کہ "شاہ صاحب! تم جوان آدمی ہو۔ تمہارا
بدن کسرتی معلوم ہوتا ہے۔ ہر طرح پر تندرست ہو پھر کچھ کام کر کے کیوں نہیں روٹی
کماتے جو اس مفت خوری پر کمر باندھ رکھی ہے۔ میاں کہیں نوکری کرو۔ اور
یہ بھیک مانگنی چھوڑو۔ ہمارے ہاں تم جیسے ہٹے کٹے سائل کو دینا روا نہیں"
اس پر تو فقیر صاحب کا مارے غصہ کے چہرہ لال ہوگیا اور کہنے لگے کہ "بابا!
ہم نے تجھ کو سخی داتا جانکر سوال کیا تو ہم کو حرام خور بتاتا ہے۔ ہم کو دنیا کی نوکری
کی خواہش نہیں۔ ہم اپنے مولا کے نوکر ہیں۔ وہ ہم کو سخی بندوں کے ہاتھوں
اپنے خزانۂ غیب سے دلواتا ہے۔ اگر دنیا میں تجھ جیسے مائی باپ ہونے لگیں تو
ہم درویش لوگ تو بھوکوں مرجائیں۔ بابا! چلا جا اپنا رستہ لے! فقیر کا دل
نہ دُکھا! منہ سے کوئی بددعا نکل جائیگی۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ!! غرض وہ نوجوان تو قدم
بڑھا کے آگے چلا گیا کہ فقیر کے منہ نہ لگے اور شاہ صاحب اِلَّا اللّٰہ کے نعرے
مارتے پیچھے رہ گئے اور اپنے دل میں سوچنے لگے کہ آج پہلا ہی سوال رد ہوا۔
خدا خیر کرے کہیں سارا دن خالی نہ جائے وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ دھر
سے ایک اور سخی داتا کو تاڑا جو اُنکی طرف چلا آرہا تھا۔ یہ شخص وضع قطع سے کوئی
سوداگر معلوم ہوتا تھا اور ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا لئے اپنی دوکان کھولنے جارہا
تھا کہ اتنے میں شاہ جی نے سامنے آکر دعا دی "خدا سوداگر صاحب کو سلامت
رکھے۔ کاروبار بنا رہے۔ بابا! فقیر کا سوال پورا کرتا جا۔ اللہ ایک کے چوگنے دے"
اس پر سوداگر صاحب نے ایک پیسہ اپنے انگرکھے کی جیب سے نکال کر فقیر کے
حوالے کیا اور شاہ صاحب خوشی خوشی دعائیں دیتے کسی ایسی ہی اسامی کی تلاش
میں آگے بڑھے۔ مگر پھر جو اُنکو کچھ خیال آیا تو ایک گلی میں مڑ گئے اور اول ہی گھر
سے اپنی صدا لگانی شروع کی۔ وہاں سے کچھ جواب نہ ملا تو اپنے منہ ہی منہ میں

آ ماندوی آنا شاہجی! ٹھنڈائی تیار ہے۔ اُنکے دو چار گھونٹ لے لو۔ اس پر وہ بولے میاں یہیں لے آؤ۔ ابھی واسطے سُلفہ بھرتا ہوں۔ غرض جب یہ دونوں شاہ صاحب ٹھنڈائی پی پلا کر فارغ ہوئے اور حقے کا اچھی طرح دم لگا چکے تو قلندر شاہ نے جھولی گلے میں ڈالی اور کچکول ہاتھ میں لیکر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ تو صبح کی ٹھنڈی ہوا اور اُس پر بھنگ کا نشہ ان دونوں نے ملکر شاہ جی کے دماغ پر ایسا اثر کیا کہ سامنے راستے اپنے آپ خرافات بکتے چلے جاتے تھے۔ اور جو کوئی پنہاری یا راہگیر کسان ملتا اُسکو خواہ مخواہ گالیاں سُناتے۔ وہ بیچارا یہ سمجھتا کہ فقیر کی موج ہے۔ ان کی گالیوں ہی میں اللہ میاں نے دعاؤں کا اثر دیا ہے اور اس لئے سُنکر چپکا چلا جاتا۔ مگر جب شاہ صاحب شہر کے اندر داخل ہوئے تو انکو ہوش آیا کہ یہاں گالیوں کی چال چلنے والی نہیں۔ کیونکہ اگر کسی گبھرو دل کے سامنے ایک آدھ ناپاک لفظ بھی زبان سے نکلا تو وہ دو ایک چپت رسید کر بیٹھیگا اس لئے اب اُنہوں نے اِلّا اللہ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے فراش خانے کی کھڑکی میں گھستے ہی ان کی نظر ایک نوجوان طالب علم پر پڑی جو کتابیں ہاتھ میں لئے اپنے مدرسے کی طرف چلا جا رہا تھا چونکہ اس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی امیر گھرانے کا لڑکا ہے اس لئے شاہ صاحب نے اس کی طرف قدم بڑھایا کہ شاید ایک آدھ پیسے کا بھلا ہو جائے۔ اگرچہ اُس کی شیروانی اچکن اور ترکی ٹوپی سے ان کے دل میں یہ خیال ضرور گذرا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ دھکا بتائے مگر ہمت کر کے سوال کر ہی بیٹھے کہ بابا! فقیر کو سویرے سویرے کچھ دلوا دے۔ جا! تیرا بھلا ہو جائیگا۔ اللہ تجھ کو صاحب نصیب اور صاحب علم کریگا۔ اول تو اس نے یہ کہکر ٹالنا چاہا کہ اسوقت معاف کرو۔ مگر جب فقیر صاحب نہ ٹلے اور لگے وہی بڑ ہانکنے کہ بچہ! فقیر کی موج ہے اس وقت دلوا دے جو کچھ حاضر ہے۔ سویرے ہی نانہ کر۔ اللہ تجھ کو

ایک اَور فقیر جنکے گلے میں ایک جوگیا کفنی پڑی ہے حقّے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دو چار گھونٹ لیکر نیلے تہ بند والے شاہ صاحب نے اپنے ہم مشرب کے آگے حقّہ سرکایا اور کہنے لگے "کہو میاں قلندر شاہ! آج کہاں کی پھیری رہیگی۔ جمعرات ہے میں تو چاندنی چوک میں دوکانوں کا چکّر لگاؤنگا۔ بھائی ڈیوڑھیوں پر صدا لگانے سے یوں گھبراتا ہوں کہ روٹی کے سُوکھے ٹکڑوں کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اور ان کے کوڑے کرنے میں اپنے کو کچھ بچت نہیں ہوتی" اس پر قلندر شاہ بولے "شاہ جی! جمعرات کے دن تو میں گھروں کی پھیری لگاتا ہوں۔ پنجابیوں کی گلی میں بہت سی سخی مائیاں ہیں۔ بس میری صدا لگانے کی دیر ہے کہ گرم گرم چپاتیوں پر کچھ سالن ترکاری رکھکر بھجوا دیتی ہیں اور کئی گھروں سے ایک ایک پیسہ مل جاتا ہے سو تم جانتے ہو اس سے اپنی افیم اور ٹھنڈائی کا خرچ چلتا ہے" یہ گفتگو ختم کر کے قلندر شاہ نے حقّے کا ایک اَور دم لگایا مگر چونکہ تمباکو جل چکا تھا انکو کچھ مزا نہ آیا اس لئے چلم لیجا کر ڈھیل میں اُلٹ دی۔ اس پر دُوسرے شاہ صاحب بولے "میں نے کہا پہلے تھوڑی سی سبزی گھونٹ لو۔ پھر چلم بھی بھر لینا"۔ قلندر شاہ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اُنہوں نے کونڈی سونٹا سنبھال جو چبوترے سے ایک طرف کو رکھا ہوا تھا۔ کنوئیں کا رُخ کیا۔ یہ کنواں قبروں سے کچھ بہت فاصلہ پر نہیں ہے۔ اس کی مینڈھ پر ایک درخت کا دوشاخا سا گڑا ہوا ہے۔ جس کی گھرنی پر سن کی بٹی ہوئی رسّی پڑی رہتی ہے۔ اس کے ارد گرد پانی گرنے کی وجہ سے لمبی لمبی گھاس اُگ آئی ہے اور ایک طرف کو ایک حوض سا بنا ہوا ہے۔ جس میں مویشیوں کے لئے پانی بھرا رہتا ہے۔ قلندر شاہ نے کنوئیں پر جاکر ڈول میں پانی کھینچا اور کنارے پر بیٹھکر بھنگ گھوٹنے لگے۔ جب اپنے دل کے موافق اس کو خوب حل کر چکے تو دُوسرے فقیر صاحب کو

ایک ماما کا غش

پہلا منظر

صبح کا سہانا وقت تھا۔ اگرچہ افق مشرق پر قرص آفتاب کا ابھی تھوڑا سا حصہ نمودار ہوا تھا لیکن فراخ میدانوں اور سرسبز مرغزاروں کو اس کی دھیمی روشنی نے شب تاریک کا سیاہ برقع اتار کر ایک نورانی جامہ پہنا دیا تھا۔ ہر طرف ایک پر فضا عالم چھایا ہوا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھیتوں کے نونہالوں کو زمین بوس کر رہے تھے۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا جاتا تھا۔ دھوپ میں چمک اور تیزی بڑھتی جاتی تھی۔ اب اس کی شعاعیں ان کھنڈرات پر منعکس ہو رہی تھیں جن کی قدامت کا ثبوت ہر پتھر کی کہنگی سے ظاہر ہے۔ زمانے کے تغیر نے ان عالیشان محلات کو جہاں کبھی زندوں کے لئے عیش و عشرت کے سامان مہیا تھے۔ مُردوں کی آرامگاہ بنا دیا ہے۔ دو چار قبریں جو نئی معلوم ہوتی ہیں اُن کی سفیدی زبان حال سے کہ رہی ہے کہ یہ بے لکھے پتھر جنکو آج کسی بے نام ونشان کے سنگ مزار ہونے کا فخر حاصل ہے کبھی میری طرح آب و تاب رکھتے ہونگے۔ ان قبروں کے پاس ہی ایک مٹی کا چبوترہ ہے جس پر نیم کے درخت نے چھاؤں کر رکھی ہے۔ اس کی جڑ سے کچھ فاصلہ پر ایک راکھ سے بھرا کڑاہ دھرا ہے اور اس میں تھپواں اُپلے کی چنگاری سے تھوڑا تھوڑا دھواں نکل رہا ہے۔ جو نیم کے پتوں تک جاتے جاتے غائب ہو جاتا ہے۔ کڑاہ کے پاس ہی ایک حقہ دھرا ہے جس کے نیچے پر بان کی بندش ہے اور بوریئے کے ٹکڑے پر خیلاتہ بند باندھے ایک شاہ صاحب بیٹھے حقہ کا دم لگا رہے ہیں۔ اور ان کے برابر

خاص وجوہ ہیں اور اس کا فائدہ جو کچھ بھی ہو زیادہ تر اُس کی ذات کیواسطے مخصوص ہو۔

اگر اس ملک میں کوئی شخص یہ اندازہ لگائے کہ اُس نے خالصًا ایثاری رنگ میں اپنی زندگی میں کتنے مفلوک دوستوں کی خدمت کی ہے تو اُسے پتہ لگیگا کہ ایسی خدمات کی تعداد بہت ہی محدود ہو۔

اگر اس ملک میں قومی ایثار کی زندہ مثالیں تلاش کیجائیں تو شاید فی ہزار ایک آدمی ملیگی اور استیثاری تخمینہ اگر لگایا جائے تو فی صدی پچیس ہوگا اسکا موجب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایثاری قوت بالکل ماند اور کمزور پڑگئی ہے اور دلوں سے اس کا احساس اُٹھ گیا ہے۔ بعض اوقات لوگ خیرات سے مراد ایثار لیا کرتے ہیں۔ میری رائے میں اول تو اس کا اکثر حصہ نمائش پر ہوتا ہو اور دوسرے یہ کہ یہ ایثار بجائے خود اسوقت کسی ضابطہ کے ماتحت نہیں ہے۔ جس سے اس کی ہستی عمومًا غیر مفید ہو رہی ہے۔ استیثار اور ایثار کا سوال ایک بحث طلب سوال ہے۔ یہاں کی قومیں اسپر غور کریں +

سلطان احمد (بہاولپور)

بعض لوگوں کی عادت ہو کہ دوسروں کے چمن پر چپکے سے حملہ کرتے ہیں۔ اس طرح کہ بظاہر کسی سے معمولی سرسری ملاقات میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کسی شخصوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور کسی کا نام گفتگو میں آجاتا ہے اسکو نام پر ایک ہلکا سا دھبہ لگاتے جاتے ہیں۔ اس کی نسبت کچھ شک پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ نہیں تو کسی کا نام لیکر ایک خاص انداز سے چپ ہو جاتے ہیں۔ یہ مطلب ہو سکتے ہیں "اس سے کچھ سنا ہی۔ ہم کو تو یقین نہیں ہیکہ ......" اتنا کہکر پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ اور سر ہلاتے ہیں۔ شانوں کو جنبش دیتے ہیں اور ان حرکات سے چپ چاپ اپنے ناتمام فقرے میں بُرے سے بُرے معنی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنا نہ صرف صدر درجہ کی بے پروائی بلکہ شرارت ہو۔ کہنے والے کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آسکتی۔ جو ایک دفعہ منہ سے نکلتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے تیر کمان سے جاتے ہیں۔ ممکن ہو کہ کتنے برسوں بعد کہنے والے کو معلوم ہو۔ کہ اس ایک سرسری فقرے سے ایک زندگی ناخوش ہو گئی۔ یا کسی گھر بھر کی عافیت و آرام میں ہمیشہ کے لئے خلل آگیا۔ سینٹ جیمس کا مقولہ ہو کہ "اگر تم میں سے کوئی شخص ذہبی معلوم ہوتا ہو مگر اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا۔ اسکا مذہب بے معنی اور باطل ہو"

(ترجمہ)

ثابت ہو رہی ہیں۔ مذہبی رنگت بھی پھیکی پڑ گئی اور مادی صورت بھی مسخ ہو گئی تو اسکا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا کچھ خیال میں لایا جا سکتا ہے کہ دونوں پہلو متروک ہو چکے۔

اس وقت مذہبی رنگ میں بھی جو کچھ ایثاری ہستی پائی جاتی ہے۔ اسکی حالت بھی چنداں پائدار نہیں ہے۔ فرقوں کی باہمی دشمنیاں اور آئے دن کے مناقشے ایسی ہستی کی وقعت اور وسعت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس ایثار کی آخر کار قیمت کیا کچھ پڑنے والی ہے۔ دوسری طرف سے مادی ایثار فرقوں اور قوموں کی کاوش اور موجودہ شکر رنجی کا ایک کمر شکن نظارہ ہے۔ کیا ان حالات میں یہ کسی حالت میں بھی کہا جا سکتا ہو کہ ایشیائی قوموں میں صحیح معنوں میں کوئی ایثاری قوت کام کر رہی ہے۔ صحیح نتیجہ پر پہنچ کر اس کا یہی جواب ہو کہ اس وقت ہم میں کوئی ایثاری قوت صحیح پیمانہ پر کام نہیں کرتی اور ہم تین سے فیصدی پچیس بھی اس قوت کی ضرورت اور ہستی سے واقف نہیں ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اسکا وہمی احساس ہی کمزور پڑ گیا ہے۔ کیا ہوا اگر کروڑوں مخلوق میں دو چار روحیں کام کر رہی ہوں۔ کروڑوں میں جب تک ہزاروں کی تعداد نہ ہو تب تک ایثاری قوت کے وجود کا اعتراف نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور غلطی عام طور پر دیکھی جاتی ہے۔ لوگ مذہبی یا تمدنی رنگ میں ذاتی یا نفسانی ایثار سے جماعتی یا قومی اور ملکی ایثار مراد لینے کے عادی ہیں۔ مثلاً ایک عابد اور ایک تپشیا کرنے والا جب یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی عبادت اور اسکی تپشیا قوم یا ملک کے واسطے بہ ہیئت مجموعی کوئی اثر رکھتی ہے تو وہ درحقیقت ایک غلطی کی پیروی کر رہا ہے۔ یہ ایک جذباتی ایثار ہے جس کی

کے اور سب قسمیں کمزوری کی حالت میں ہیں۔ جذباتی ایثار سے محبت اور دوستانہ ایثار مراد ہے۔ سو یہ ایک خاص صورت ہے۔ اس کا وجود ہر حالت میں پایا جاتا ہے۔ شخصی۔ خاندانی۔ جماعتی۔ ملکی اور قومی ایثار کی مثالیں یا تو سرے سے پائی ہی کم جاتی ہیں اور یا اُن میں کچھ نہ کچھ خود غرضانہ مواد بھرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ایثاروں میں صداقت بہت کم ملتی ہے۔ چند ہی روز کے بعد انکی حقیقت کھل جاتی ہے اور اختلافِ خیالات کی صورت میں پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

ایشیائی ملکوں میں بجائے قومی اور ملکی ایثار کے مذہبی ایثار کی مثالیں کثرت سے ملینگی اور تسلیم کرنا پڑیگا کہ مغرب میں انکا عشرِ عشیر بھی نہیں لیکن اب اُن میں بھی ایک قسم کی کمزوری پیدا ہوچکی ہے جس سے اُن کی وقعت میں فرق آگیا ہے۔ ایشیائی ملکوں میں دراصل مذہبی ایثار ایک حد تک قومی رنگ میں بھی تھا۔ کیونکہ یہاں کی قومیت مذہب میں ملی جلی رہتی ہے اور مذہب کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ خلاف اس کے مغربی ممالک میں اب مذہبی ایثار اور قومی ایثار میں فرق کیا جاتا ہے اور اب قومی ایثار مذہبی ایثار پر غالب ہوتا جاتا ہے اور مذہب تقریباً قومی رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ نتیجہ دونوں طریقِ عمل کا ایک ہی ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ مذہبی رنگت روحانیت رکھتی ہے اور قومی رنگت میں مادیات کی آمیزش زیادہ ہے۔ بیشک وہ دن بہت شرمناک ہوگا کہ جب ایشیائی ایثاروں سے مذہبی یا روحانی لہروں کی ہستی معدوم ہو جائیگی۔ کیونکہ مذہبی یا روحانی جذبات ایشیائی قوموں کا دراصل جدی ورثہ ہیں۔ لیکن روحانی جذبات کی عدم تکمیل۔ کمزوری اور دوسری جانب سے مادیات کی کمی دونوں مل کر ایشیائی حصّوں میں سخت انقلاب کا باعث

جب اپنی موجودہ حالت کا صدق سے جائزہ لیا جائے۔

جب اس مرحلہ پر انسان پہنچتا ہے تو اس کا ضمیر اس مرکز پر کسے لیجاتا ہے کہ ایک گرے ہوئے شخص کی ضرور امداد کرنی چاہئے - اور گرے ہوئے شخص کی اسوقت امداد ہوتی ہے کہ جب اپنی جان لڑا دیجائے اور اپنے مطالب پر پانی پھیر دیا جائے۔

جب کوئی قوم اس نقطہ پر پہنچتی ہے تو وہ ایثاری دائرہ میں آجاتی ہے۔ وراسکی ناکامیاں رفتہ رفتہ کامیابیوں سے تبدیل ہونے لگتی ہیں۔

ایثار کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) شخصی ایثار

(ب) خاندانی ایثار۔

(ج) جماعتی ایثار۔

(د) قومی ایثار۔

(ہ) ملکی ایثار۔

(و) جذباتی ایثار۔

(ز) خودغرضانہ ایثار

(ح) مذہبی ایثار۔

یہ سب قسمیں بجائے خود اپنے اپنے موقعہ پر مفید اور ضروری ہیں۔ سوائے اس کے کہ خودغرضانہ ایثار ایک حد تک اپنی تہ میں ایک کمزوری لئے ہوئے ہے۔ اس سے تو ہم کسی حالت میں بھی انکار نہیں کرسکتے کہ ہماری قوموں اور ہمارے ملک میں کسی نہ کسی حد تک سب قسم کے ایثار پائے جاتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ سوائے خودغرضانہ ایثار یا جذباتی ایثار

کرنے میں جو کسی قوم کے ادبار کا باعث ہوتے ہیں۔ ایثاری قوتوں کی کمی کا بالخصوص ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر تنزل کا اصلی فوٹو لیا جائے تو یہ کہنا ہی پڑے گا کہ اس قوم کے تنزل کا اصلی موجب ایثار کی کمی تھی۔ ایثار کے نہ ہونے سے دُنیا کی جماعتوں میں کسی مرض یا کسی عارضہ کا دور ہوتا ہے۔

(الف) خود غرضی کا۔

(ب) خود مطلبی کا۔

(ج) خود پسندی کا۔

یہ تینوں عارضے اس قسم کے ہیں کہ اُن کے ہوتے کوئی تدبیر اور کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا اور نہ کسی قوم کی حالت میں کوئی نیک تبدیلی ہوتی ہے۔

جن جن قوموں میں ایثاری مواد کا زور ہے اور لوگ اس کی ضرورتوں سے آگاہ ہیں۔ اُن میں بھی اگرچہ یہ عارضے شخصی حد تک ہوتے ہیں لیکن قومی رنگ میں اُنکی کوئی حقیقت اور اُن کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ بیشک یہ بھی نہایت ضروری بات ہے کہ شخصی رنگ میں بھی ایثار کی سخت ضرورت ہو اور قومی ایثار کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے۔ لیکن جب تک قومی ایثار نہ ہو تب تک شخصی ایثار کی مطلقاً قدر و منزلت نہیں ہوتی علوم و فنون اور دولتمندی یا حرفت سے بھی قوموں کی ترقی اور خوش حالی متصور ہے۔ لیکن ان چیزوں کے ساتھ جب تک قومی ایثار نہ ہو۔ اُن کی کوئی وقعت نہیں اور نہ اُن کا کوئی عملی اثر ہوتا ہے۔ قومی ایثار کب ہوتا ہے جب شخصی ایثار مجموعی حیثیت سے پایا جاتا ہو۔

یہ حالت کب نصیب ہوتی ہے۔

جب جائز خود غرضی کے سوائے اور سب خود غرضیاں ترک کردی جائیں۔

یہ ترک کیونکر ہوں۔

کام یا کوئی خدمت بروقت ہو سکے۔ ایک مفلوک الحال یا ایک غریب آدمی ہی اس کا خواہاں نہیں رہتا بلکہ ایک دولتمند اور صاحب اقبال بھی اس کا محتاج رہتا ہے اور سچ پوچھو تو دولتمند اور با اقبال لوگ اس کے نسبتاً زیادہ تر خواہشمند رہتے ہیں۔

ایثار کیا ہے؟ کسی کے کام آنا۔ کسی کی خدمت کرنا۔ کسی کی بہتری اور آسائش کے واسطے جان جوکھوں میں ڈالنا۔ یہ بھی ایک قسم کا لین دین ہے جو ایثار چاہتا ہے وہ لیتا ہے اور جو ایثار کرتا ہے وہ دیتا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ ثابت ہے کہ اس طریق عمل کی واقعی ضرورت ہے اور اسکے سوائے کام نہیں چل سکتا۔

کوئی ملک اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اُس میں آمد و رفت نہ ہو اور داد و ستد کا سلسلہ جاری نہ رہے۔ استیثار کا طریقہ تو دنیا کی بعض قوموں میں ایک خاص حد تک جاری رہتا ہے لیکن ایثار کے نہ ہونے سے انکی ترقی رُکی رہتی ہے اور روز بروز اس میں ضعف آتا جاتا ہے۔

کونسی قومیں اور کونسے ملک تنزل پاتے اور اپنے عروج سے گر جاتے ہیں وہ جو استیثار میں تو کوئی کمی نہیں کرتے لیکن ایثار میں کمزور پڑتے جاتے ہیں۔

جس ملک اور جس قوم میں سب کے سب لینے اور مانگنے والے ہی ہوں اور دینے والے فیصدی پانچ بھی نہ ہوں وہ ملک اور وہ قوم کیونکر فارغ البال ہو سکتی ہے جب سب لوگ یہی چاہیں اور یہی درخواست کریں کہ انہیں اور لوگ دیں ہی دیں تو اس صورت میں خود اُن سے کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

اگر ہم مُردہ اور متنزل اقوام کی تاریخیں پڑھینگے تو ہمیں یہ بات ماننی پڑیگی کہ جب اُن میں ایثاری جذبات کا مواد باقی نہ رہا اور نری خود غرضی باقی رہ گئی تو انکی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ اگرچہ بعض مورخوں نے ان اسباب کے بیان

استیثار و ایثار

یہ مقام مسرت ہے کہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب جنکی خدمات حال ہیں پنجاب پراونشل سروس سے ریاست بہاولپور میں منتقل ہوئی ہیں اور جو ریاست کی کونسل میں صیغہ مال کے ممبر مقرر ہوئے ہیں۔ باوجود اپنے اہم فرائض منصبی کی مصروفیت کے علمی مشاغل کیلئے وقت نکالتے رہتے ہیں۔ ہم ممنون ہیں کہ اپنے نئے عہدہ کے کاروبار میں بھی اُنہوں نے مخزن پر وہی پہلے سی نظرِ عنایت رکھی۔ ذیل کا مضمون انکے اکثر مضامین کی طرح غور و فکر سے لکھا ہوا ہے اور ملک و قوم کی توجہ کے لائق ہے:۔

دُنیا کی منڈی میں داد وستد کا طریقہ شروع ہی سے چلا آتا ہے۔ کوئی لیتا ہے اور کوئی دیتا ہے۔ کوئی دینے والا ہے اور کوئی لینے والا۔ اگر کوئی کسی دوسرے کی کوئی ضرورت رفع کرتا ہے تو اس کی بھی کوئی دوسرا شخص بھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی ضرورت رفع کرتا ہے۔

اگر یہ دونوں طریقے دُنیا کی منڈی میں مرعی نہ ہوں تو یہ سلسلہ جو اسوقت چل رہا ہے ایک ہی دن میں بند ہو سکتا ہے اور اس منڈی کی ساری رونق دم بھر میں نیست و نابود ہو جائے۔ چاہے کوئی امیر ہو اور چاہے غریب دونوں کساد بازاری کی زد سے بچ نہیں سکتے۔ اسی طرح استیثار اور ایثار کی کیفیت ہے۔

استیثار کیا ہے؟

یہ چاہنا اور اسکے لئے میں رہنا کہ کوئی دوسری ہستی کوئی دوسرا شخص کسی دوسرے کے کام آئے اور اس کی زندگی کی آسائش کے واسطے اُس سے کوئی

یورپ میں سفر کرتے ہوئے رومن حروف کے عام رواج کی بدولت ریل میں بیٹھے ہوئے
معلوم ہو سکتا تھا کہ کونسا سٹیشن آیا ہے۔ لیکن جب میں وطن میں واپس آیا تو حروف مختلفہ
کے رواج نے مجھے کئی دفعہ مشکل میں ڈالا۔ پنجاب میں جب سے گورمکھی کے متعلق
جوش سکھ صاحبان نے دکھلایا ہے۔ ایک یہ اصلاح ہوئی ہے کہ ریل کے سٹیشنوں کی
لالٹینوں پر بجائے انگریزی یا فارسی حروف میں نام لکھنے کے یوں لکھا گیا ہے۔ کہ
ایک پہلو فارسی حروف ہیں۔ ایک دوسرا انگریزی ہیں۔ ایک دوسرا گورمکھی ہیں۔ اس کا
نتیجہ یہ کہ جب کبھی میری گاڑی گورمکھی حروف والی لالٹین کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔
کئی دفعہ رات کو مجھے بغیر دریافت کئے معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم کہاں ہیں اور اس طرح
دیس میں پردیسی بننا پڑا۔

یورپ میں اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور انگلستان میں یقیناً اور کئی اور ملک
میں بھی رومن حروف سے کام چل جاتا ہے اور زبان نہ جاننے والا بھی بعض بول
چال کی کتابوں اور فرہنگوں کی مدد سے سفر میں اپنا کام چلا لیتا ہے۔ جرمنی میں
ایسے حروف مروج تھے جو رومن حروف سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ذرا اُن سے پیچیدہ
ہیں۔ اب وہاں بھی رومن حروف میں کتابیں چھپنی شروع ہو گئی ہیں اور عجب
نہیں کہ ایک زمانہ ایسا آجائے کہ اہل جرمنی بھی رومن حروف عام طور پر اختیار کریں۔
وہاں تو ممالک غیر جن میں باہم رقابتیں اور جھگڑے ہیں۔ تجارت کی ترقی اور رقابت
کے فوائد کو دیکھ کر ہمواری اور یکرنگی کی طرف مائل ہوں اور یہاں یکرنگی کے منافع عیاں
ہونے کے باوجود دورنگی اور سہ رنگی کو ترجیح دیجئے۔ ہم اپنے ملک کے فہمیدہ اصحاب
سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس بحث پر منصفانہ غور کر کے، ایمانداری سے وہ رائے
قائم کریں جس میں اُن کے نزدیک ملک کی ترقی و بہبودی متصور ہو۔

ایڈیٹر

رکھنے کی بدولت ہندوستانی ہوگیا ہے۔ اور یہاں کی سب زبانوں میں فارسی کے اتنے الفاظ شامل ہوگئے ہیں کہ اُن کے اظہار کے لئے یہ خط خصوصیت سے موزوں ہے۔

۳۔ فارسی خط کے سکھانے کے ذرائع دیہات وغیرہ میں بھی اب تک میسر ہیں اور بغیر صرفِ کثیر کے حاصل ہیں۔ رومن خط کے پھیلانے کے لئے صرفِ کثیر درکار ہوگا۔

۴۔ ہندوستان جب تجارت اور کاروبار میں ترقی شروع کرے گا اور اس میں یہ سکت پیدا ہوگی کہ اپنی صنعت کے نمونے دُنیا کی منڈیوں میں پہنچائے تو اوّل اوّل اس قابل نہ ہوگا کہ یورپ کی منڈیوں میں یورپ کے مصنوعات سے مقابلہ کرے بلکہ قدرتی طور پر قریب قریب کے میدان اس کے لئے زیادہ مفید ہونگے۔ اور ایران اور سواحلِ عرب و روم سے اسکی تجارت بڑھیگی اور اسوقت فارسی حروف اس کے لئے بیحد کارآمد ہونگے۔ فارسی حروف جاننے سے ہندوستان نہ صرف ممالکِ ایشیا مثل وسط ایشیا۔ افغانستان۔ ایران۔ رُوم۔ شام اور عرب سے ایک مستقل تعلق کی بُنیاد رکھیگا۔ بلکہ اگر اس میں ہمت ہوگی تو تمام شمالی افریقہ اور یورپین ٹرکی تک اس کی تجارت اپنے پاؤں پھیلا سکے گی۔ اور ہندیوں کو بمقابلہ دیگر اقوام کے ان ممالک سے کاروبار کرنے میں آسانی ہوگی۔

دیکھیے دانایانِ فرنگ نے کس خوبی سے رسمِ خط کے اہم مسئلہ کو حل کیا ہے۔ کہ نہ صرف ایک مُلک میں ایک رسمِ خط مروج ہے۔ بلکہ کئی ملکوں میں ایک ہی خط کا رواج ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ چاہتے ہیں کہ ایک ملک میں ایک کی جگہ دس خط رائج ہوں۔ تاکہ مُلک کے رہنے والے پڑھے ہوئے ہونے کے باوجود ان پڑھ رہیں اور باہر سے آنے والے کثرتِ خطوط سے پریشان ہوکر کسی ایک کے سیکھنے کا بھی قصد نہ کریں۔ مجھ

چاہئے۔ ہندوستان انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہے۔ انگریزی زبان یہاں کے دفاتر
اور مدارس میں رواج پاگئی ہے اور پائی جاتی ہے۔ اور وہ رومن حروف میں لکھی جاتی ہے۔
پس رومن حروف کا اختیار کرنا حاکم و محکوم کے باہمی تعلقات میں صفائی کا باعث
ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ ایک تعلق یورپ اور امریکہ کے تمام اُن ممالک سے پیدا کریگا۔
جن میں رومن حروف کا رواج ہے۔ یعنی یورپ میں نہ صرف انگلستان بلکہ فرانس
اور اٹلی وغیرہ ممالک سے ایک سلسلہ کاروبار قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہاں
کا ایک پڑھا لکھا آدمی جو رومن حروف پہچانتا ہوگا۔ اُن ممالک میں سفر کرتے وقت
بہت سی سہولت دیکھیگا اور وہاں سے اگر کوئی کاروباری خط یہاں کے تاجر کے
پاس آوے تو وہ محض حرف شناسی کی بدولت بغیر دوسری زبانیں جاننے کے بھی
کچھ نہ کچھ اس کا پتہ لگا سکیگا۔ یہ سب درست ہے اور اسی اعتبار سے اس مضمون میں
یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اگر ہندوستان والے اپنے ایشیائی رسم خط پر متفق نہ ہوئے
تو رومن خط کا اختیار کرنا بالآخر اُن کے لئے ایک سخت غلطی ثابت ہوگا۔ لیکن اول تو
کیوں ضروری ہے۔ کہ فارسی رسم خط کے اختیار کرنے کی کوشش کیجائے۔
اس کی وجوہات مختصر طور پر یہ ہیں:۔

۱۔ یہ خط جس رفتار سے ترقی کرسکتا ہے۔ رومن خط ملک میں اس رفتار سے
نہ پھیل سکیگا اور اگر پھیلا بھی تو بہت زیادہ عرصہ اس کے پھیلنے کے لئے درکار ہوگا
اور اس وجہ سے ملک کی اغراض تعلیمی میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکیگی۔

۲۔ رومن خط بوجہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا
کرنے سے قاصر ہے۔ یا اگر ادا کرتا ہے تو اُن میں شبہ و التباس پیدا ہونے
کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہندی زبانوں کے لئے موزوں نہیں۔ برعکس اس کے
فارسی خط اول ایشیائی الاصل ہے۔ دو تین صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش

ناگری رسم خط یا رومن رسم خط مبترا ہے۔ مگر اسکی سہولتیں نظر انصاف میں اسکی دقتوں
سے زیادہ ہیں اور اس لئے ذاتی صفات میں یہ بعض خطوں سے بہتر ہے۔ یا کم از کم
کسی سے کمتر نہیں۔ باہمی خانہ جنگی کا خطرہ اسکے اختیار کرنے میں اس لئے کم ہے۔
کہ اول تو اس کے اختیار کرنے میں کسی نئی چیز کو جو پہلے بہت کمزوری اور بے اثری
کی حالت میں ہو۔ دفعتہً بلند مرتبہ پر پہنچا دینا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک مقبول چیز کو مقبول تر کرنا
ہوگا۔ جس پر کسی کو جائز اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس رسم خط کا ایک عام اثر اطراف
ملک میں موجود ہے۔ صرف اسے وسیع کر دینا ہے۔ برعکس اس کے اگر بنگال کا رسم خط
مہاراشٹر میں یا مہاراشٹر کا رسم خط بنگال میں یا مدراس کے حروف شمالی ہندوستان
میں رواج دینا چاہیں تو اُن کے مقبول ہونے کا ہرگز اتنا امکان نہیں جتنا فارسی
حروف کا ہے۔ کیونکہ بنگال اور مہاراشٹر کے حروف کو جو اصل میں سنسکرت حروف
کی شاخیں ہیں۔ ایک دوسرے پر ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہوگا۔ اور ناپسند کیا جائیگا۔
سنسکرت تحریر سے نکلے ہوئے حروف میں صرف ناگری حروف ہیں جو کسی حد تک
ہندوستان میں فارسی حروف کے مقابلہ میں میدان میں آسکتے ہیں۔ لیکن اگر موجودہ
رواج کی عمومیت پر فیصلہ ہو تو پھر انہیں بھی زیادہ موقع کامیابی کا نہیں۔ اور اس کے
سوا اُن میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو دُنیا کے دُوسرے حصوں سے
بالکل منقطع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ فارسی اور رومن حروف نہ صرف ایک دو بلکہ بہت
سے ممالک سے ہندوستان کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اسی لئے تجارت کو وسعت دینے
اور بیرونی دُنیا سے ربط پیدا کرنے کے لئے فارسی اور رومن حروف تمام دوسرے
مروجہ خطوں سے یقیناً بہتر ہیں۔

ابھی یہ بتانا باقی ہے کہ فارسی اور رومن حروف میں ہندوستان کے لئے
فارسی حروف کو ترجیح کیوں ہے۔ بظاہر تو اس زمانہ میں رومن حروف کو ترجیح ہونی

معروف ہیں۔ اور اگر کسی سبب سے اہل ہندان حروف کو رواج دینے پر متفق نہ ہو سکیں تو میرے خیال میں رسم خط کے اتحاد کی ضرورت اس درجہ ہے کہ میں زور سے ہندوؤں مسلمانوں سکھوں پارسیوں غرض سب باشندگان ہند کو یہ مشورہ دونگا کہ وہ رومن حروف جن میں انگریزی زبان لکھی جاتی ہے اختیار کر لیں۔ اس موقع پر یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی جماعت مذہبی یا قومی ضرورتوں کے خیال سے عام ملکی رسم خط کے علاوہ کوئی اپنا رسم خط قائم رکھنا چاہے۔ یا ایسے بطور ایک خط ثانی کے رواج دے تو یہ اس کی خوشی پر موقوف ہے۔ اس میں اغراض ملکی کا کچھ نقصان نہیں۔ اور کسی معقول پسند شخص کو اس سے تعرض نہیں ہونا چاہیے۔

اب میں مندرجہ بالا رائے کی وجوہات لکھتا ہوں۔ جو چار معیار اوپر قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں ہر ایک میں فارسی رسم الخط پورا اترتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں یہ کم و بیش موجود نہ ہو۔ بخلاف دوسرے حروف کے جو اپنے اپنے علاقوں میں محدود ہیں۔ ذاتی صفات کے لحاظ سے فارسی رسم خط کی بابت اس موقع پر زیادہ لکھنا بے ضرورت ہے۔ یوں تو ہر رسم خط اپنی خوبیاں اور اپنے نقص لئے ہوئے ہے اور ہر ایک کے طرفدار اس کی خوبیوں میں مبالغہ اور اس کے نقائص میں کمی کر کے دکھلاتے ہیں۔ مگر انہی اوراق میں ایک نہایت مفصل و مدلل مضمون فارسی رسم خط کی ذاتی خوبیوں کے متعلق سال گذشتہ میں چھپ چکا ہے۔ اس کے دلائل کا اعادہ کرنے کی حاجت نہیں۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے ثابت کیا تھا کہ علاوہ مختصر نویسی کی خوبی کے جو فارسی خط میں بدرجہ اعلیٰ موجود ہے۔ اس کی طرز تحریر انسان کے ہاتھ اور دست و بازو کے پٹھوں کی ساخت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اور یہ طرز تحریر بمقابلہ اس طرز تحریر کے جو مغربی دنیا میں مروج ہے۔ زیادہ قدرتی طریقہ لکھنے کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نقائص اس رسم خط میں ہیں جن سے

کوئی غیر معمولی ترجیح دینے سے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ سب جھگڑے ایک طرح علمی جھگڑے ہیں۔ جن کا ایک صوبہ کی حدود سے باہر در اصل کچھ اثر نہیں۔ فرض کیجیے۔ لڑنے جھگڑنے کے بعد ایک صوبہ میں کوئی فریق کامیاب ہو کر کسی خاص قسم کے حروف کو رواج دلا بھی دے تو اس سے سارے مسئلہ کی مجموعی صورت اور مشکل اور پیچیدہ ہو جائیگی اور اس کا حل ہونا بدستور دشوار رہیگا۔ اصل طریق اس مسئلہ کے حل کرنیکا یہ ہے کہ تعصبات اور فریق بندی کے خیالات کو الگ کر کے رسم الخط پر ٹھنڈے دل سے بحث کیجائے اور پھر جس میں ملک کے سب سے زیادہ نفع اور پائدار نفع نظر آئے۔ اسے پسند کیا جائے۔

ہمارے خیال میں چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کی خوبیوں کے پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں۔

۱۔ کونسا خط ایسا ہے جو مختلف حصص ملک میں زیادہ مروج ہے اور جس کے سامنے دوسرے خطوں کا جو خاص حصوں یا خاص قوموں تک محدود ہیں۔ دعویٰ برابری بیکار ہوگا۔

۲۔ کونسا خط ایسا ہے جو اپنی ذاتی صفات کے لحاظ سے قابل پذیرائی ہے

۳۔ کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہو۔

۴۔ کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

میں طرفداری سے نہیں کہتا۔ بلکہ برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ اپنے ابنائے وطن کی بہی خواہی کی نیت سے ظاہر کرتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی فارسی حروف جن میں اردو زبان آج کل عموماً لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے لئے بہترین

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ خطوں میں سے کسی ایک رسم خط کو انتخاب کرتے وقت ہم اپنے ذاتی میلان یا مذہبی یا قومی جوش کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ رکھ کر فقط اس امر پر غور کریں کہ ملک کی عام اغراض کے لئے کونسے رسم خط کا اختیار کرنا بہتر ہوگا اور یہ اندازہ کرنے کے واسطے اپنی نظر صرف ضروریات حال پر ہی نہ ڈالیں۔ بلکہ زمانہ مستقبل کو بھی ملحوظ رکھیں۔

ہمارے ہاں بارہا یہ بحث چلی ہے کہ رسم الخط کونسا اختیار کیا جائے۔ مگر کبھی اصولی طور پر نہیں۔ اوّل تو بہت شاذ یہ سوچا گیا ہے کہ سارے ملک میں ایک رسم الخط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کون سے خط کو دیجائے۔ دوم عموماً مختلف صوبجات میں یہ بحث صوبوں کی حدود تک محدود رہی ہے۔ اور اس کو یہ خصوصیت حاصل رہی ہے۔ کہ ایک جماعت یا فریق نے محض اپنی فوری ضرورتوں یا مذہبی اور قومی خیالات کو مدنظر رکھکر یہ زور دیا ہے کہ وہ حروف جو اُن کے ہاں مستعمل ہیں۔ سرکاری طور پر مروج ہو جائیں۔ تاکہ اس جماعت کو قدرے سہولت ہو اور دوسری جماعتوں یا فریقوں نے اس تحریک کی پرجوش مخالفت کی ہے۔ اس بحث مباحثہ اور جد وجہد کے بعد کہیں یہ تحریک غالب آئی ہے کہیں مخالفت۔ کہیں دونوں برابر رہی ہیں۔ صوبجات متحدہ میں اُردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی تکرار تھی۔ اور آخر سرکار سے اسکا فیصلہ یہ ہوا۔ کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پائیں۔ اگرچہ رواج عام نے اب تک اس حکم کے سر پر قبول کا تاج نہیں رکھا۔ مگر یہ حکم اس تکرار کی یادگار باقی ہے۔ پنجاب میں اُردو پنجابی کا جھگڑا اصل میں اُردو حروف اور گورمکھی حروف کا جھگڑا ہے۔ مگر ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آخرکار یہ مسئلہ کیا صورت اختیار کریگا۔ تا حال اسی قدر ہوا ہے۔ کہ گورنمنٹ نے گورمکھی حروف کو

ایک بڑا علم کا حکم رکھتا ہے۔ کوئی دن ایسا بھی آنے والا ہے۔ جب ہر حصۂ ملک میں باہمی ارتباط۔ میل جول اور یگانگت زیادہ ہوا ور کاروبار اور تجارت کے رشتے مضبوط اور تعلقات وسیع ہوں۔ تو یہ بھی لازمی ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک زبان مروج ہو اور اس کیلئے ایک رسم خط ہو۔ بلکہ جہاں تک تجارتی دُنیا کا تعلق ہے۔ رسم خط کا ایک ہونا ہی بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اور زبان میں کچھ اختلافات بھی ہوں تو بھی رسم الخط کے اتحاد سے بہت کچھ کام چل سکتا ہے۔ پس ہر فہمیدہ باشندۂ ہندوستان کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اس دن کے لئے تیار ہو۔ جب رسم خط کی یگانگت زبان کے اتحاد کا باعث ہوگی۔ زبان کا اتحاد خیالات اور جذبات میں ہمرنگی پیدا کرے گا اور ہمخیالی تفرقات مذہبی وقومی و... کا خاتمہ کردیگی۔ بلکہ اس منتہائے خیال تک پہنچنے کے ذرائع تلاش کرے۔ ان ذریعوں میں سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ ہر شخص یہ طے کرے۔ کہ کونسا خط بہ حیثیت عام ملکی رسم الخط کے مہیا کرنا چاہیئے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے دو باتیں ذہن نشین کرلینی ضروری ہیں ایک تو یہ کہ مختلف حروف مروجہ میں قدرتی طور پر جنگ لازمی ہے۔ اور بالآخر قانون قدرت کے منشا کے مطابق جدوجہد کے بعد وہ خط باقی رہ جائے گا جس میں قبولِ عام کا مادہ زیادہ ہو۔ جس کی سہولتیں بہ حیثیت مجموعی اوروں سے بڑھ کر ہوں اور جس میں قوتِ زیست اور قوتِ نمو بدرجۂ اعلیٰ موجود ہوں۔ جب انجام یہ ہوتا ہے تو دانشمندی اس میں ہے کہ ہم خود اس وقت کے آنے سے پہلے ایک خط کے باقی رہنے اور ترقی کرنے اور دوسروں کے رفتہ رفتہ مٹتے جانے کے لئے آمادہ ہوجائیں اور جو قوتیں خطوں اور حرفوں کی اس باہمی جنگ و جدال میں بیکار صرف ہونگی۔ انہیں کسی عمدہ مصرف میں لگائیں

مخزن

حروف کی بحث

کسی نے کہا ہے کہ ہندوستان مشکل مسئلوں کا ملک ہے۔ گو ہر ملک اپنی اپنی مشکلات رکھتا ہے۔ مگر حقیقت میں ہندوستان کی قسمت اس بارے میں دنیا سے نرالی ہے۔ جتنی پیچیدگیاں یہاں کے معاملات میں لاینحل سوالوں سے پیدا ہوتی رہتی ہیں شاید ہی کہیں ہوتی ہونگی۔ زمانہ حال میں جو مشکل سے مشکل سوال ہند میں پیش ہوتے ہیں۔ ان میں یہ مسئلہ کہ ہندوستان عام طور پر کون سے حروف کو تحریر کے لئے کام میں لائے۔ وقعت میں کسی مسئلہ سے کم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا مسئلہ اگر دنیا کے کسی اَور حصہ میں در پیش ہوتا۔ اور وہاں کے حالات وہی ہوتے جو اس ملک کے ہیں تو وہاں بھی اس کا حل کرنا آسان نہ ہوتا۔ لیکن جو دشواری اس کے حل ہونے میں یہاں واقع ہوئی ہے۔ اور جس طرح یہاں اس نے مختلف اقوام کے صاحبان تدبیر و رائے کو حیران کیا ہے۔ یہ بھی کسی اَور جگہ غالباً پیدا نہ ہوتی۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں رسم الخط کی بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ اور ہر حصۂ ملک کو وہ رسم الخط جس کے وہاں کے لوگ عادی ہیں۔ عزیز ہے۔ لیکن کوئی غور کرنے والا انسان اس میں بھی شک نہیں لا سکتا کہ اگر اس بڑے ملک میں جو